

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

نومبر 2018

# خواتین کا مجلہ



Kiran's Shuaa & Khawateen Digest Fans  
PakiBooks.Site

آلف  
عمیرہ احمد  
سلسلے وار کامل



بہنئی سنٹی،  
کرن کرن روشنی،  
ہمارے نام،

12 مسیر

13 ادارہ

242 نادر خاتون



فیہ احمد  
غیر احمد

الف،  
حالم،



سمیر احمد  
نعیم فخر

ام الیقین،  
رزقِ زوال،

18 انشاجی



آوا مید بائیں،  
عادتہ توں،  
میر دلیر میرے ساتھ،  
افین نعیم

240

امت الصبور

میری ڈائری سے،



26

شاہین رشید

بائیں الغم تنویر سے،



جینے کا ہنسا،  
رشتے کی دھلک،  
بشریہ  
آسیر عید



20

شاہین رشید

شنیل اسکندر،





## نظمیں غزلیں

- غزل  
غزل  
غزل  
نظم
- 234 جاذب قریشی  
235 سید عارف  
234 زیر قیصل عباسی  
235 جواد مقصود

## رنگارنگ پہول

- رنگارنگ سلسلہ
- 236 شگفتہ جاہ

## میری بیاض سے

- آپ کی بیاض سے
- 239 خالدہ جیلانی

## پکوان

- موسم کے پکوان
- 255 خالدہ جیلانی
- آپ کا باورچی خانہ
- 254 سلمیٰ ناز

## بیوٹی بکس

- 258 بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبر



نومبر 2018

جلد 46 نمبر 7

قیمت 70 روپے

## نفسیات

- نفسیاتی لادرواحی تجزیں
- 256 حدسان



خواتین! ڈائجسٹ کا نومبر کا شمار میے ماضی میں۔ شائیں اور مہیں مٹی کا احساس دلاتی ہیں لیکن اس شہرے میں  
نومبر میں موسم تبدیل ہونے لگتا ہے۔ شائیں اور مہیں مٹی کی بارش دلا رہی ہے۔  
میں جسے عروس البلاد کہتے ہیں، گرمی کی شدت میں جون کی بارش دلا رہی ہے۔  
بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب سارے موسم اپنا احساس دلاتے تھے۔ دم جم برستی بارش کی بوندیں  
روں کو شاداب کرتی تھیں۔ موسم سرما کی طویل بریلی برائیں اور چاروں اور خاموشی سوچ کے دوا کرتے تھے  
سوز و گداز کی کیفیت طاری کرتیں۔ خزاں میں ٹوٹے بھرتے۔ زردیے اور نڈ منڈ شائیں مہیں  
اداسی بکھر دیتیں اور ہسٹ کی دستک پر چاروں اور ہریالی اور پھولوں کے رنگوں میں قدرت کی  
جلوہ گرمی ایک سرخوشی کی کیفیت طاری کر دیتی۔ سارے موسم کہیں کھڑے ہیں۔ بے ہنگم ٹریک  
اب تو لگتا ہے جسے زمینیں کر دھ لیتا بھول گئی ہیں۔ سارے موسم کہیں کھڑے ہیں۔ بے ہنگم ٹریک  
کا شور، آلودگی، گنجان آبادیوں کی گھن، صنعتی زندگی، دھواں دھواں فضا، موسموں کا مارا مارا  
چرلے گئی ہیں۔ اب نہ بارشیں ہیں نہ سرد موسم کی بریلی راتیں۔ ہایکے بھی سارے رنگ مہیا گئے ہیں۔  
انسان نے کار فطرت میں مداخلت کی تو فطرت نے بھی اپنے حق کو مستور کر لیا۔ فطرت کے اصول ان  
ہیں اور قانون فطرت میں مداخلت کی سزا بھی ہو گئی ہے۔  
بول تو صنعتی زندگی نے پوری دنیا میں ماحول کو تبدیل کیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کوئی پلاننگ نہ  
ہونے کے سبب اس کے اثرات زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ خصوصاً کراچی میں بے پناہ بڑھتی آبادی  
دخوتوں کی کٹائی۔ اور شجر کاری نہ ہونے کے سبب کئی سالوں سے بارش نہیں ہوئی ہے۔  
پچھلے دہائی میں میٹرک لگائی جو درخت لگائے انہوں نے اس شہر کو مزید بخرافہ ویران کر دیا۔  
نا تحقیق صرف کم قیمت کو ملنے نظر آتے ہوئے کو نو کار پس کے درخت لگائے گئے جس کی وجہ سے صرف  
سالوں کی بہاریں ہیں اضافہ ہوا بلکہ ان درختوں نے زمین کی ساری نمی بھی چوس لی۔  
اس کا صرف ایک ہی مل ہے کہ ہمارے قریب، مٹی محلوں میں جہاں یہ درخت ہوں، انہیں اکھاڑ  
پھینک دیتے۔ اگر استطاعت اور سہولت ہو تو ایک درخت اپنے گھر کے قریب ضرور لگائیں۔ یہ کاروبار  
ہے اداس میں ہماری آئندہ نسلوں کی بقا بھی پر مشید ہے۔

### اس شمارے میں،

- ۱۔ الف۔ میر احمد ناول،
- ۲۔ ام الیقین۔ میراجید کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ۳۔ رزق ممال۔ نغمہ باز کا مکمل ناول،
- ۴۔ انشیں نعیم اور عائشہ تنویر کے ناول،
- ۵۔ بشری احمد، آسیہ مجید، فرحین فیاض اور عزیزین دل کے افسانے،
- ۶۔ مشہور صحافی عمار مسعود اور منیلا مسعود کا بندھن، ، یاقین انتم تنویر،
- ۷۔ کرن کلن روشن۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہماری باتیں،
- ۸۔ ہمارے نام، لیبائی از دواچی الجین اور دیگر مستقل سلسلے شائع ہیں۔



قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں جنت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

## کین کین روشنی

ادارہ

نذر (ماننے) کے مسائل

اللہ کی اطاعت

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف سے لوٹنے کے بعد (مقام) حرا نہ میں تھے تو کہا۔

”یا رسول اللہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے جاہلیت میں ایک دن مسجد حرام میں احکام کرنے کی نذر کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”جاہلیت کا ایک دن کا احکام کر۔“

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم میں سے ایک لونڈی ان کو عنایت کی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب قیدیوں کو آزاد کر دیا تو

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی آوازیں سنیں، وہ کہہ رہے تھے۔

”ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد کر دیا۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

تو لوگوں نے کہا کہ۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیدیوں کو آزاد کر دیا ہے۔“

تو سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اپنے بیٹے سے) کہا۔ ”اے عبد اللہ! اس لونڈی کے پاس جا اور اس کو بھی چھوڑ دے۔“

(مسلم)

نذر، پورا کرنے کا حکم

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسئلہ پوچھا۔



ہے اور مسکینوں کو فائدہ ہوتا ہے۔)

### نذر اور تقدیر

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”نذر کسی ایسی چیز کو آدمی سے نزدیک نہیں کرتی جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں نہیں لکھی، لیکن نذر تقدیر کے موافق ہوتی ہے۔ نذر کی وجہ سے بخیل کے پاس سے وہ مال نکلتا ہے جس کو وہ نکالنا نہیں چاہتا۔“

### جو نذر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہو

راوی نے کہا کہ ”انصار کی ایک عورت قید ہو گئی اور اعضاء بھی قید ہو گئی پھر وہ عورت قید میں تھی اور کافر اپنے گھروں کے سامنے اپنے جانوروں کو آرام دے رہے تھے۔ وہ ایک رات قید سے بھاگ نکلی اور اونٹوں کے پاس آئی۔ جس اونٹ کے پاس جانی وہ آواز کرتا، وہ اس کو چھوڑ دیتی یہاں تک کہ اس مصلو کے پاس آئی تو اس نے آواز نہیں کی اور وہ بڑی غریب اونٹنی تھی۔ عورت اس کی پیچھے پریشانی پھر اس کو ڈانٹا تو وہ چلی، کافروں کو خبر ہو گئی، وہ اعضاء کے پیچھے چلے (اپنی اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر) لیکن اعضاء نے ان کو تھکا دیا (یعنی کوئی پکڑ نہ سکا کہ اعضاء اتنی تیز رو گئی) اس عورت نے نذر کی۔

”کہ اے اللہ اگر اعضاء مجھے بچالے جائے تو میں اس کی قربانی کروں گی۔“

جب وہ عورت مدینہ میں آئی تو لوگوں نے دیکھا اور انہوں نے کہا۔

”یہ تو اعضاء ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی۔“

وہ عورت بولی کہ ”میں نے نذر کی ہے کہ اگر اعضاء پر اللہ تعالیٰ مجھے نجات دے تو اس کو نذر کروں گی۔“

یہ سن کر صحابہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

”میری ماں پر نذر تھی اور وہ اس کے ادا کرنے سے پہلے ہی مر گئی۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس کی طرف سے تو ادا کر دے۔“

### خود کو مشکل میں ڈالنا

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ ”میری ماں نے نذر مانی کہ بیت اللہ تک نکلے پاؤں پیدل جائے گی۔“ تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھنے کا کہا۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”پیدل بھی چلے اور سوار بھی ہو۔“

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو اپنے دونوں بیٹوں کے درمیان تکیہ لگائے جا رہا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔ ”اس کا کیا حال ہے؟“

لوگوں نے کہا۔ ”اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ اس عذاب کے دینے سے بے پروا ہے۔“

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو سوار ہو جانے کا حکم کیا۔

(مسلم)

### نذر کسی چیز کو واپس نہیں کر سکتی

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نذر سے منع فرمایا اور فرمایا۔

”اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ (یعنی کوئی آنے والی بلا نہیں رکھتی اور تقدیر نہیں پھرتی) بلکہ بخیل کے دل سے مال، نذر کے سبب سے نکالا جاتا ہے۔“

(یعنی بخیل ہوں تو خیرات نہیں کرتا اور جب آفت آتی ہے تو نذر ہی کے بہانے پیسہ دیتا



کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے  
جان کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (تجب سے)  
فرمایا۔ ”سبحان اللہ اس عورت نے عشاء کو کیا برا  
بدلہ دیا (یعنی عشاء نے تو اس کی جان بچائی اور وہ  
عشاء کی جان لیتا چاہتی ہے۔) جو نذر گناہ کے لیے  
کی جائے وہ پوری نہ کی جائے اور نہ وہ نذر پوری کی  
جائے جس کا انسان مالک نہیں۔“

### نذر کا کفارہ

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی  
اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”کہ نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ  
ہے۔“ (یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں  
کو لباس پہنانا یا غلام آزاد کرنا۔ اگر ان کاموں کی  
طاقت نہ ہو تو پھر تین دن کے روزے رکھنا)

### قسم کے مسائل

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے  
ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”اللہ تعالیٰ تم کو باپ دادا کی قسم کھانے سے منع  
کرتا ہے۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ”اللہ کی  
قسم میں نے باپ دادا کی قسم اس وقت سے نہیں کھائی  
جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
سے پہنا ہے، نہ اپنی طرف سے نہ دوسرے کی طرف  
سے۔“

### اللہ کے سوا قسم

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص قسم کھاتا چاہے وہ کوئی قسم نہ کھائے  
سوائے اللہ کی قسم کے۔“

اور قریش اپنے باپ دادا کی قسم کھایا کرتے

تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ  
”اپنے باپ داداؤں کی قسم مت کھاؤ۔“

طاغوت (بت وغیرہ اور جھوٹے معبودوں  
کی قسم کی ممانعت)

سیدنا عبدالرحمن بن سرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے  
فرمایا۔

”مت قسم کھاؤ بتوں کی اور نہ اپنے باپ  
داداؤں کی۔“

### بتوں کی قسم

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص تم میں سے لات اور عزی (نامی  
بتوں) کی قسم کھائے تو وہ کہے کہ لا الہ الا اللہ اور جو  
کوئی کسی دوسرے سے کہے۔ آؤ جو اٹھیں تو وہ  
صدقہ دے۔“

### قسم میں ان شاء اللہ کہنا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ  
علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ  
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کے نبی سلیمان بن داؤد علیہ السلام نے  
کہا کہ میں اس رات کو ستر عورتوں کے پاس ہواؤں  
گا (ایک روایت میں نوے ہیں، ایک میں ستانوے  
اور ایک میں سو) ہر ایک ان میں سے ایک لڑکا بنے  
گی جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا۔“

ان کے ساتھی یا فرشتے نے کہا۔ ”کہو ان شاء  
اللہ تعالیٰ۔“

لیکن انہوں نے نہیں کہا، وہ بھول گئے۔ پھر

کسی عورت نے بچہ نہ جنا سوائے ایک کے، (تو وہ  
بھی آدھا بچہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔



”اگر وہ ان شاء اللہ کہتے تو ان کی بات نہ جاتی اور ان کا مطلب پورا ہو جاتا۔“

### قسم کا مطلب

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”قسم کا مطلب قسم کھانے والے کی نیت کے موافق ہو۔“

### غلط قسم کھانا

سیدنا ابوامامہ (یعنی حارثی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”جو شخص مسلمان کا حق (مال ہو یا غیر مال جیسے مردے کی کھال، گوبر وغیرہ اور قسم کے حقوق جیسے حق شفعہ حق شرپ، حد قذف، بیوی کے پاس رہنے کی باری) مار لے قسم کھا کر تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا۔“

ایک شخص بولا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر وہ ذرا سی چیز ہو؟“  
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اگر چہ بیلو کی ایک ٹہنی ہو۔“

### جھوٹی قسم کھانا

”سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضر موت سے ایک شخص اور کندہ کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ حضر موت والے نے کہا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس شخص نے میری زمین دہالی ہے جو میرے باپ کی تھی۔“  
کندہ والے نے کہا۔ ”وہ میری زمین ہے، مجھ سے قبل میں ہے۔ میں اس میں کھیتی کرتا ہوں اس کا پتہ حق نہیں ہے۔“

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضر

موت والے سے فرمایا۔ ”تیرے پاس گواہ ہیں؟“ وہ بولا کہ ”نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”تو پھر اس سے قسم لے۔“

وہ بولا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو قاجر ہے۔ قسم کھانے میں اس کو ڈر نہیں اور وہ کی بات کی پروا نہیں کرتا، وہ قسم کھا سکتا ہے۔“

پھر وہ قسم کھانے چلا۔ جب اس نے پیچھے موڑی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”دیکھو اگر اس نے دوسرے کا مال ناحق اٹھا لینے کو قسم کھائی تو وہ اللہ سے ملے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے منہ پھیر لے گا۔“

### قسم کا کفارہ

”سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس چند اشعریوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سواری مانگنے کے لیے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کی قسم! میں تم کو سواری نہیں دوں گا اور میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے جو تمہیں دوں۔“  
پھر ہم ٹھہرے رہے جتنی دیر کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اونٹ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سفید کوہان کے تین اونٹ دینے کا حکم کیا۔ جب ہم چلے تو ہم نے یا بعضوں نے کہا۔

”اللہ تعالیٰ ہمیں برکت نہ دے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور سواری مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم کھائی کہ ہمیں سواری نہ ملے گی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سواری دی۔“

لوگوں نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔



خرچ کر کو) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ لکن تالوا لبر  
حتی تملقو مما تحبون۔  
غور سے سنو! یہ اونٹ مجھے اپنے مال میں سے  
بہت اچھا لگتا ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ میں  
اسے اپنے (کام آنے کے لیے) آگے (آخرت  
میں) بھیج دوں۔

(اخرجہ ابو نعیم فی الحلیۃ ۱/۱۶۳)

### ہبہ واپس لینے کی کراہیت

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

روایت ہے، بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:  
”جو شخص اپنے بے کو واپس لیتا ہے وہ اس کتے  
کی طرح ہے جو تے کر کے اپنی تے کو چاٹتا ہے۔“  
(بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے: ”اس شخص کی مثال  
جو اپنا صدقہ واپس لیتا ہے، اس کتے کی طرح جو تے  
کرتا ہے، پھر اپنی تے میں لوٹتا اور اسے چاٹتا ہے۔“  
ایک اور روایت میں ہے: ”اپنے بے کو واپس  
لینے والا اپنی تے میں لوٹنے والے کی طرح ہے۔“

اس کی شناعیت و قباحیت اس سے واضح ہے کہ  
ایک تو ایسے شخص کو جو ہبہ واپس لیتا ہے، کتے کے  
ساتھ تشبیہ دی ہے اور دوسرے، موبہوب چیز کو تے  
سے تعبیر کیا جس سے انسان سخت کراہیت محسوس کرتا  
ہے۔ تاہم علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم انجی آدمی کے  
لیے ہے۔ اگر انسان اپنی اولاد یا پوتوں پر پوتوں کو  
کوئی چیز ہبہ کرے تو اسے واپس لینے کا یہ حکم نہیں  
ہے، اس کا واپس لینا اس کے لیے جائز ہے۔



”میں نے جنہیں سوار نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ  
نے سوار کیا اور میں تو اگر اللہ چاہے تو کسی بات کی قسم  
نہ کھاؤں گا مگر پھر اس سے بہتر دوسرا کام دیکھوں گا تو  
اپنی قسم کا کفارہ دوں گا اور وہ کام کروں گا جو بہتر  
ہے۔“

### غلط قسم کھانا

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ  
ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس  
دیر ہو گئی پھر وہ اپنے گھر گیا تو بچوں کو دیکھا کہ وہ سو  
گئے ہیں اس کی عورت کھانا لائی تو اس نے قسم کھائی۔  
”میں اپنے بچوں کی وجہ سے نہ کھاؤں گا۔“  
پھر اس کو کھانا مناسب معلوم ہوا اور اس نے کھالیا۔  
بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا  
اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا تو۔  
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”جو شخص کسی بات کی قسم کھائے لیکن پھر  
دوسری بات اس سے بہتر سمجھے تو وہ کرے اور قسم کا  
کفارہ دے۔“

### مال کے شریک

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔  
”ہر مال میں تین شریک ہوتے ہیں۔ ایک تو  
تقدیر ہے جو مال کے ضائع ہونے اور چالوڑوں کے  
مر جانے کی صورت میں تیرا مال لے جاتی ہے اور تجھ  
سے پوچھتی بھی نہیں ہے کہ وہ تیرا عمدہ مال لے  
جائے یا کھلیا۔“

دوسرا شریک وارث ہے جو اس کا انتظار کر رہا  
ہے کہ تو (قبر میں) سر رکھے۔ یعنی تو مر جائے اور وہ تیرا  
مال لے جائے۔ وہ تیرا مال بھی لے جائے گا اور تو اس  
کی ننگہ میں برا بھی ہوگا اور تیرا شریک تو خود ہے۔

لہذا تم اس بات کی پوری کوشش کرو کہ تم ان  
تینوں شریکوں میں سے سب سے کمزور شریک نہ بنو۔  
(یعنی تم ان دونوں سے زیادہ مال اللہ کے راستہ میں



# قصہ آجروان کا

الشاج

کنوارے کا "میں دل خوش خان کا احوال۔

☆☆☆

لاہور سے اس قسم کی خبریں بھی آئی ہیں کہ اگرچہ چوک پر ٹریفک کی چھتری کے نیچے کوئی ایسی سڑک گھڑی گریڈی گئی کہ تک سب سے درست کچھ ٹریفک داری بھی رکھتی ہو تو بعض موٹروں والے اس چھتری کا طواف شروع کر دیتے ہیں۔ برآمدہ ہیں گھوم رہے ہیں، سنا ہے ان کو نظر بد سے بچانے کے لیے یہ بھی کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی مرد کا ٹشیل بھی رہے جو لوگوں کو بٹو بچو کرتا رہے، چونکہ بعض مرد کا ٹشیل بھی طرح دار ہوتے ہیں، اس لیے اس جوڑے پر اور سختی کو متعین کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ یوں ٹریفک کا مسئلہ حل ہونہ ہو، لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ، بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

ان ہی دنوں خبر آئی کہ برڈی باردوت نے بچہ پکڑا، برڈی باردوت کو سب ہی جانتے ہیں، قتال ہے، یہ خبر فرانس کی ہے اور راوی یوں بیان کرتا ہے مس باردوت نے ایک شخص کو جھٹ رفرار ہوتے کر سختی سے ڈانٹا، اس شخص نے علم کی کھیل کی اور اس خواب گاہ سے چرائی ہوئی رقم اور زیور اس کے حوالہ کر دیے، مس باردوت کو چاہیے تھا کہ چور کی اس خود قربان ہو جاتیں یعنی اپنے گھر سے خود ہی جاتیں لیکن انہوں نے پولیس کو نوں کر دیا اور انہوں اس نامعلوم شخص کو آکر گرفتار کر لیا۔ مس باردوت تعلق فلموں سے ہے۔ ان کو چور بھی ملے گا، یوں ملے گا کہ بے چارے پہلے ہی موصوف کی زلف مرہ میر کا ہے ہو چکا تھا۔ پولیس کی گرفتاری کو قدر سمجھتا ہے عام زندگی میں لوگ ایسے سیدھے نہیں ہوتے، روکے یا لکارے تو چاقو یا پستول سے جواب دیتے

لاہور میں زمانہ پولیس کے ٹریفک سنبھالنے کی خبریں کراچی پہنچی ہیں اور منو بھائی کے کالم کے باوجود بہت سے لوگ لاہور جانے اور اپنا چالان کرانے کے لیے برتول رہے ہیں، بلکہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ کراچی میں بھی ایسا ہی کیا جائے تاکہ لوگوں کو چالان کرانے اور مار کھانے کے لیے دور کا سفر نہ اختیار کرنا پڑے، لاہور کے اخباروں میں یہ آیا ہے کہ جہاں زمانہ پولیس کو ٹریفک کنٹرول کے لیے متعین کیا گیا، وہیں ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ تماشائی جوم کر آئے، ٹھٹھک گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ جہاں اس ٹریفک کنٹرول کرنا جانتی ہوں کی اور کرتیں گی لیکن ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے۔

آپ رواں کے اندر چھلی بنائی تو نے  
چھلی کے تیرنے کو آپ رواں بنایا  
ٹریفک کنٹرول کرنا بلکہ کسی طرح کا بھی کنٹرول عورتوں کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ یہ تو سڑک کی آمدورفت ہے، اس دنیاے رنگ و بو میں، کوئی ان کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا، اسی لیے جب نیستی سے ہستی کے راستے پر کنٹرول کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے لیے منصوبہ بندی کے جھگے بنتے ہیں تو عورتوں ہی سے پہل کی جاتی ہے کہ کسی کو آنے نہ دیں، بہت رعایت کی تو ایک یادو کا کوٹ مقرر کر دیا۔ یہ بھی قطرہ قطرہ بہت ہو جاتے ہیں، رات کو دیر سے گھر آنے والے بہت سے صاحبان بھی خواتین کی ٹریفک کنٹرول کرنے کی صلاحیتوں کا تجربہ رکھتے ہوں گے۔ بھٹے تو دروازے پر لالہ بتی دیکھ کر دیوار پھاندا مستحسن سمجھتے ہیں یا اپنے ساتھ کسی نوچ کر کور کھتے ہیں تاکہ بلیں یا مہاز کا پہلا دار اسی پر ہو، تفصیل کے لیے دیکھیے۔ ہماری کتاب "قصہ ایک





ہیں۔ پولیس کو ٹیلی فون کرنے کی اجازت تو جہاں تک ہمارا خیال ہے کوئی بھی نہیں دیتا۔ ہمیں تو یہ سارا افسانہ لگتا ہے، اک ذرا پلاٹ اس میں کمزور ہے۔

چوری کے ساتھ کوئی اور قافیہ باندھتے منو بھائی سے ڈر لگتا ہے لیکن بندہ بشر ہے۔ فوجی وردی ہی میں کیوں نہ ہو، ہمیں ڈر ہے، یہ یہیمیاں کہیں سلج ہی کو لال جتی نہ دکھانا شروع کر دیں اور یہ منظر نہ ہو کہ سلج تو آ کر لال جتی پر ٹھک گیا اور انہوں نے ہری جتی کے رخ سڑک پار بھی کر لی اور کسی راہ گیر کا ہاتھ پکڑے پکڑے قاصی کے ہاں راضی ہونے پہنچ گئیں، جن لوگوں نے لاہور میں زمانہ پولیس کا ڈول ڈالا ہے۔ انہوں نے شاید گس کے باغ میں جانے اور پروانے کا خون ناحق ہونے کا قصہ نہیں سنا، بس اتنا دیکھا کہ جہاں کسی لیڈی کا ٹیبل نے ایک آدی کو حکم دیا کہ ٹھہرو، وہاں دس آدی ٹھہر گئے بلکہ پوچھنے لگے کہ محترمہ! آگے کیا حکم ہے۔ کھڑے رہیں یا چلے جائیں، اس کا باعث قانون کے احترام کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

”بقراطی گولیاں استعمال کیں؟“  
”پانچ مہینے متواتر، ان کے علاوہ لیوب کبیر معجون فلاسفہ اور اطریہ لعل جالیئوس بھی استعمال کر دیکھے، حتیٰ کہ لعوق خراسانی بھی کھاتا ہوں۔“  
اب چوراہا کا م تو بھول گیا، مشورے دینے لگا اور بولا۔  
”پھر تو ایک ہی دوا ہے، شراب کے دو گھونٹ جو کام کرتے ہیں، وہ ان تیلوں اور بخونوں کے بس کی بات نہیں۔ چلو ذرا کپڑے پہنو، باہر کوئی شراب خانہ کھلا ہو تو دو گھونٹ پی آئیں، تکلف مت کرو، پیسے میرے پاس ہیں۔“

☆ ☆ ☆  
گھر آئے چور کو پولیس کے حوالے کرنے کی بات ہمیں پسند نہیں آئی، ویسے جو چاہے برٹی بارود کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ اس چور سے ہمیں ادھنری کے ایک قصہ کا چور یاد آیا جو ایک شخص کے





## سنیلا سکندر ہذا عمار مسعود

شاہین شید

سنیلا سکندر کا ایک تعارف تو یہ ہے وہ کافی عرصہ میڈیا سے وابستہ رہ چکی ہیں۔ اب فری لانس صحافی ہیں۔ اخبارات میں کالم بھی لکھتی ہیں اور مختلف این جی اوز کے ساتھ میڈیا کنسلٹنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔

سنیلا کا دوسرا تعارف یہ ہے کہ وہ مشہور صحافی، کالم نگار، افسانہ نگار اور ٹی وی پروگرام رات گئے کے میزبان عمار مسعود کی شریک حیات اور مشہور و مقبول شاعر انور مسعود کی بہو ہیں۔

عمار مسعود کا شمار ان صحافیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ہمیشہ کسی فائدے یا لالچ کے بغیر اپنے ضمیر کی آواز پر لکھا اور بولے۔ وہ دلائل کے ساتھ موثر اور خوب صورت انداز میں اپنی بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ٹی وی پر ان کے تجزیے، ان کے متوازن اور سنجیدہ ہوئے ذہن کے عکاس ہیں۔ بلاشبہ انہیں الفاظ کے استعمال پر قدرت حاصل ہے۔ انتہائی غصہ اور اشتعال دلانے والی کیفیت میں بھی عمار مسعود غیر

مہذب الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ عمار مسعود کی شخصیت کا ایک پہلو ادب انہیں دراشت میں ملا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ”محبت کا نیلا رنگ“ شائع ہو چکا ہے۔ عمار مسعود کے افسانوں میں بھی وہی اثر آج سوز و گداز، سادگی و پرکاری اور محبت و غلو آتا ہے جو ان کی شخصیت اور مزاج کا حصہ ہے۔ انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز ڈگری لینے والی سنیلا سکندر نے اپنے کیریئر کا آغاز طلعت حسین ساتھ کیا۔ بہت سے چینلوں میں ان کے ساتھ کام کیا۔ مگر شادی کے بعد میڈیا کو خدا حافظ صحافت کی فیلڈ میں آ گئیں۔

سنیلا سکندر آج ہماری مہمان ہیں۔ ہم انہیں منوں ہیں کہ انہوں نے اپنی بے شمار معروضات سے ہمارے قارئین کے لیے وقت نکالا۔

”کیسے مزاج ہیں؟“



”الحمد للہ آپ بتائیں۔“

”جی اللہ کا شکر ہے..... مجھے خوشی ہے کہ میں آج

ایک معروف اور باصلاحیت فیملی کی ایک ذہین اور معروف شخصیت کا انٹرویو کر رہی ہوں۔ میں چاہوں گی کہ آپ اپنا فیملی بیک گراؤ بتائیں؟“

”جی..... بنیادی طور پر ہم ”پنجابی“ ہیں۔

والدین کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بھی لاہور میں ہی پیدا ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی لاہور سے ہی حاصل کی۔ میرے والد ”ایف فورس“ میں تھے۔ آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ جبکہ والدہ گھریلو خاتون ہیں۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ دو بہنیں اور دو بھائی۔

بڑے بھائی عدنان ہیں جنہوں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ماسٹرز کیا ہے اور آج کل ایک سرکاری

ادارے میں جاب کر رہے ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔

بہن مریم نے آرٹس میں ماسٹرز کیا ہے۔ شادی شدہ

ہے۔ ماشاء اللہ سے دو بچے ہیں۔ وہ اور اس کے

میاں پی ٹی وی سے وابستہ ہیں۔ اور ایک چھوٹا بھائی

عمران ہے جو کہ ٹیلی کام انجینئر ہے اور ”ہم نیوز“ کے

ساتھ وابستہ ہے۔ میں نے پشاور یونیورسٹی سے

انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا ہے۔“

”عمار صاحب کے بارے میں بھی کچھ

بتائیے۔“

”جی..... عمار صاحب کے پانچ بہن بھائی

ہیں۔ بڑے بھائی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ ان کی بیگم

امجد اسلام امجد کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی بڑی بہن

فاری کی پروفیسر ہیں۔ چھوٹی بہن بزنس دمن ہیں۔

چھوٹا بھائی سرکاری ادارے سے وابستہ ہے۔ ان کے

والد انور مسعود کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی

والدہ صدیقہ انور کالج میں اردو اور فارسی کی پروفیسر

رہی ہیں، ریٹائرمنٹ کے بعد اب گھر پر خواتین کو

قرآن ترنئے کے ساتھ پڑھا رہی ہیں اور اب تو میں

بھی ان سے پڑھتی اور سیکھتی ہوں۔ مطلب اصلاح

لیتی ہوں۔“

”شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا اور بچے؟“

”اس سال نومبر میں ہماری شادی کو چار سال

ہو جائیں گے۔ ہمارے ابھی تک بچے نہیں ہوئے۔

عمار کی پہلی بیوی سے بھی اولاد نہیں ہے۔“

”عمار صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں

اور کس حوالے سے ہوئی؟“

”پہلی ملاقات دنیا نیوز کی طرف سے دیے گئے

ایک انٹرویو میں ہوئی۔ عمار چونکہ میری بہن کو

جانتے تھے تو انہوں نے ہی تعارف کروایا۔ ہماری

ارنج میرج تھی۔ میرا عمار سے ایک دو ملاقاتوں کے

بعد کوئی رابطہ نہیں رہا اور دلچسپ بات تو یہ کہ وہ پہلی

ملاقات جو انٹرویو میں ہوئی تھی، وہ عمار کو یاد ہی نہیں

تھی۔

دراصل میری بہن کی عمار سے کافی پرانی جان

پہچان تھی۔ تو ایک تقریب میں عمار نے اپنی بہن مینا کو

میری بہن سے ملوایا۔ مینا کو مریم اچھی لگی۔ وہاں انہیں

میرے بارے میں پتا چلا تو ایک دن اپنی امی کے

ساتھ مینا ہمارے گھر آئیں کہ ہم ملنے آئے ہیں اور

واپس جانے کے ایک گھنٹہ بعد ہی میری امی کو فون

کر کے رشتے کی بات کی۔ بس یوں سمجھیں کہ چٹ

مگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔ ایک ماہ کے اندر

ہماری شادی ہو گئی۔“

”آپ عمار صاحب کی سکیڈڈ وائف بن کے

آئیں۔ تو دل میں کچھ خدشات تھے؟ اور سسرال

والوں کو کیسا پایا؟“

”آپ پہلی بیوی بن کے آئیں یا دوسری،

خدشات تو ہر شادی ہونے والی لڑکی کے دل میں

ہوتے ہی ہیں۔ عمار کی پہلی بیوی صائمہ بہت اچھی

خاتون تھیں۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ سب ان

سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک جذباتی وابستگی تھی۔

لیکن مجھے بھی سب نے پیار، عزت و احترام دیا۔ مجھے

کسی بھی لمحے کسی نے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں

ان کی جگہ آئی ہوں اور ان کی جگہ نہیں لے سکتی۔ ایسا



بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور میری ساس تو بہت جگہوں پر بر ملا کہتی ہیں کہ یہ میری ”چیتھی بہو“ ہے۔ میری ساس میری ہر کاوش کو سراہتی ہیں اور بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ عمار تو اکثر چڑ کر کہتے ہیں کہ آپ میری ماں ہیں یا شہیلا کی۔ تو وہ فوراً کہتی ہیں کہ ”شہیلا کی“۔

”عمار صاحب سے شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟“ اور زندگی کون سی اچھی ہے، شادی سے پہلے والی یا بعد کی؟“

”اگر میں اپنی شخصیت کی بات کروں تو شادی کے بعد کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میری کسی روٹین کو عمار نے ڈسٹرب نہیں کیا اور نہ ہی اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ ہاں ایک ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا ہے کہ گھر چلانا ہے اور سارے معاملات دیکھنے ہیں۔“

شادی سے پہلے گھر کے سارے معاملات امی ہینڈل کرتی تھیں۔ مگر اب یہ گھر میرا ہے اور مجھے ہی سنبھالنا ہے۔ سسرالی رشتے نبھانا۔ ان کی خوشی غمی میں شریک ہونا..... آپ کی طبیعت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ مہمان گھر آرہے ہیں تو منع نہیں کریتا۔ یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جو شادی کے بعد نبھانی پڑتی ہیں۔ لائف دونوں اچھی ہیں۔ شادی سے پہلے کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی اور شادی کے بعد کی لائف میں صبر اور تحمل کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھانا..... میں نے دونوں ادوار انجوائے کیے۔ شادی ایک جوا ہے جو ضرور کھلنا چاہیے۔“

”عورت گھر کو ہلاتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی ہے۔ آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟“

”گھر بنانے اور بگاڑنے میں دونوں فریقین شامل ہوتے ہیں لیکن عورت کو کپہر و مائز زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ گھر بنانا مشکل اور بگاڑنا بہت آسان ہے۔ کسی بھی چھوٹی بات کو ایسا بڑا کر لیا کیجے تو تو فتنی چیزیں نمودار ہو کر بنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر فیصلے جذبات سے نہیں عقل سے کیے جائیں تو گھر بجنے ہی ہیں، بگڑنے

کوئی معاملہ میرے ساتھ نہیں ہوا۔ عمار کے بھانجے بھانجیاں، صائمہ کے بہت قریب تھے۔ وہ ہماری شادی سے پہلے کہتے تھے کہ ماموں کی شادی ہو بھی گئی تو ہماری ممانی صرف صائمہ ہی رہیں گی۔ ہم کسی اور

کو قبول نہیں کریں گے۔ لیکن آج سب بچے مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میری بڑی نند کی بچیاں میری بہت اچھی فریڈ بن چکی ہیں۔“

”عمار صاحب کی پہلی بیگم ”بیسارت“ سے محروم تھیں اور عمار صاحب کے دل میں تھیں۔ آپ کو ان کے دل میں گھر کرنے میں کتنا عرصہ لگا؟“

”میں بالکل بھی اس ارادے یا سوچ کے ساتھ نہیں آئی تھی کہ مجھے ان کی یادوں کو کھرچ کر اپنی یادیں بھرنی ہیں۔ ہر انسان کا آپ کی زندگی میں ایک مقام ہوتا ہے۔ جو کسی کے آنے جانے سے کم نہیں ہوتا..... مجھے عمار کے دل میں جگہ بنانے میں وقت نہیں لگا۔ کیونکہ میں نے اپنی جگہ خود بنائی۔“

کسی کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے کبھی بھی کسی بھی لئے صائمہ سے جیسی محسوس نہیں ہوئی۔ مجھے کبھی بھی برا نہیں لگتا جب کوئی ان کا ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ سب نے مجھے میرا مقام دیا ہوا ہے۔ عمار نے کبھی میرا موازنہ صائمہ سے نہیں کیا۔ کبھی مجھے یہ نہیں کہا کہ اس میں یہ خوبی تھی اور تم میں یہ خامی ہے۔

مجھے عمار نے بہت عزت، بہت احترام اور بہت محبت دی ہے۔ صائمہ عمار کی زندگی کی ایک حقیقت تھیں جس کو نبھانا نہیں پاسکتا۔ مجھے اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے کوئی تک و دو نہیں کرنا پڑی.....“

”شادی سادگی سے ہوئی یا محرم و حرام سے؟“

”نہیں جی، شادی بالکل سادگی سے ہوئی تھی۔ مہندی، ابارت، ولیمہ سب فنکشنز ہوئے تھے۔ سب رسمیں ہوئی تھیں۔ کافی محرم و حرام سے سب فنکشنز ہوئے تھے۔ میرا سسرال ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ میرے ساس سسرالہ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ عمار کے بہن بھائی اور بھابھیاں سب اچھے



نہیں۔

”آپ دونوں جاب کرتے ہیں تو پھر گھر کون سنبھالے گا؟ کیا جوائنٹ فیکلٹی سسٹم ہے۔“

”نہیں، ہمارا جوائنٹ فیکلٹی سسٹم نہیں ہے۔ میں اور عمار علیحدہ رہتے ہیں۔ امی، ابو عمار کے چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتے ہیں۔ میری جاب کی نوعیت

ایسی نہیں کہ مجھے روزانہ گھر سے جانا پڑے جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں زیادہ تر ”فری لانس“ کام کرتی ہوں یا پھر عمار کے میڈیا پروجیکٹس میں ان کی مدد کر دیتی ہوں اور یہ ساری چیزیں گھر سے بھی منیج ہو جاتی ہیں۔ اس لیے گھر میں ہی سنبھالتی ہوں۔“

”اگر عمار صاحب آپ کی ساری سرگرمیاں ختم کر دیں اور کہیں کہ صرف گھریلو ذمہ داریاں نبھائیں تو کیا ایسا کرنا آپ کے لیے ممکن ہوگا؟“

”عمار کبھی مجھی ایسا حکم نہیں دیں گے۔ عمار شخصی

آزادی پر یقین رکھنے والے انسان ہیں۔ انہوں نے آج تک مجھے کسی بات، کسی کام سے نہیں روکا۔ شادی کے بعد میڈیا کی جاب میں نے اپنی مرضی سے چھوڑی۔ اور آج اگر میں دوبارہ میڈیا جوائن کر لوں تو عمار خوش ہوں گے۔ انہوں نے مجھ پر کبھی بھی کسی چیز کا پریشر نہیں ڈالا۔ اور اگر انہوں نے ایسا کوئی حکم دیا تو میں قبول کر لوں گی کیونکہ اس کی یقیناً کوئی بڑی وجہ ہوگی کہ عمار مجھے کسی کام سے روکیں۔ ورنہ عمار ان لوگوں میں سے نہیں جو بلا وجہ کی پابندیاں لگاتے رہیں۔“

”عمار صاحب مزاج کے لیے ہیں؟ اور آپ مزاج کی کیسی ہیں؟“

”عمار بہت ہنس مکھ ہیں یہ جو آپ ٹی وی پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ سیاسی تجزیے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عام زندگی میں اس سے مختلف ہنسنے ہنسانے والے انسان ہیں۔ عمار اپنے بھانجے بھانجیوں کے پسندیدہ ماموں اور چچوں کے پسندیدہ چاچو ہیں۔ نیچے ان کی کہنی بہت انجوائے کرتے ہیں۔ مگر سنجیدہ



مفکروں میں ان سے زیادہ سنجیدہ انسان بھی کوئی نہیں ہوتا۔ غصے کے تیز ہیں مگر کبھی کبھار ہی غصہ آتا ہے اور اترا بھی جلدی جاتا ہے جبکہ عمار کے مقابلے میں مجھے غصہ آتا بھی جلدی ہے اور میں غصے کی تیز بھی ہوں۔“

”آپ کی اپنی ایک پہچان ہے لیکن آپ عمار صاحب اور انور مسعود صاحب کی وجہ سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ کس پہچان پر زیادہ فخر ہوتا ہے یا اچھا لگتا ہے؟“

”ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اپنی ایک انفرادی پہچان ہو۔ مجھے اچھا لگتا ہے کہ جب لوگ میرے کالم پڑھ کر یا میرے کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے میری تعریف کرتے ہیں۔ لیکن مجھے عمار اور انور ابو کے حوالے سے پہچان بھی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس وقت بہت اچھا لگتا ہے جب لوگ رشک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کے لیے کتنے اعزاز کی بات ہے کہ آپ انور مسعود کی بہو ہیں۔ تو ابو کی طرف سے ملنے والی شہرت کو میں انجوائے کرتی



”گھر کا بھٹ کون مانتا ہے؟ عموماً بڑی اپنی کمائی  
گھر کے خرچ نہیں کرتی کہ یہ شوہر کی ذمہ داری ہے۔  
آپ کی طرف کیا صورت حال ہے؟“  
”گھر کا بھٹ مانتے کی کوشش تو بہت کرتے  
ہیں۔ مگر بھٹ بھی مانتا نہیں۔ خرچ کے معاملے میں ہم  
نے بھی ”حیری پیری“ نہیں کی۔ میں جو کمائی ہوں،  
وہ میرے اور عمار کے جوائنٹ اکاؤنٹ میں جاتا ہے

لیکن گھرانے کے پیسوں سے چلتا ہے اور مجھے جب  
بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے، میں ان سے مانگ  
لیتی ہوں۔“

”میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہے کہ مل میں لڑائی اور  
مل میں صلح۔ آپ دونوں کی لڑائی میں صلح کون کرتا ہے  
یعنی کون پہل کرتا ہے؟“

”ہماری لڑائی بڑی معمولی نوعیت کی ہوتی ہے کسی  
بڑے ایٹھو پر بھی لڑائی نہیں ہوتی۔ بس لڑائی عموماً اس  
بات پر ہوتی ہے کہ زیادہ سگریٹ نہ پیئیں۔ انہیں  
یورک ایسڈ کا ایٹھو ہے تو میں گوشت کم کھانے کا کہتی  
ہوں۔ عمار کو یہ مسئلہ رہتا ہے کہ تم بہت کم کھاتی ہو۔  
وقت پر نہیں کھاتیں۔ ناشتہ بہت لیٹ کرتی ہو بس  
چھوٹی موٹی لوک جموٹک چلتی رہتی ہے۔ اور منانے  
میں پہل عمار ہی کرتے ہیں۔ ویسے بھی زندگی کا مزہ تو  
نیما ہے کہ شوہر ہی منائے اور ناز اٹھائے۔“

”فارغ اوقات میں آپ دونوں کا موضوع گفتگو  
کیا ہوتا ہے؟“

”ویسے مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہم میاں بیوی  
کم اور سیاسی تجویز نگار زیادہ ہیں۔ ہم ملکی حالات اور  
ملک کی سیاست پر گفتگو کرتے ہیں۔ ہماری بحث  
بھی خانہ خانہ، اور خاندانی سیاست کے گرد نہیں  
گھومتی۔ کبھی جب فراغت زیادہ ہو تو پھر لیوچ کے  
بارے میں ضرور منصوبہ بندی کرتے ہیں کہ گھر کیسا  
ڈھانپا اور کہاں گھونٹے پھرنے ہمارے۔“

”دو دو دیکھنے کا شوق ہے یا مطالعہ کا شوق ہے

آپ دونوں کو؟“

”دونوں جنم کے ساتھ ساتھ چلی ہیں۔ شادی  
کو پہلے سے بغیر سوچیں سکتی اور عمار لازمی حالت کو اپنے  
مودی دیکھتے ہیں لیکن چونکہ دونوں کا مودنی نہیں  
الگ الگ ہے تو ایک دوسرے کے ساتھ چلے گئے  
دیکھتے۔ البتہ پاکستانی مودین ضرور دیکھنے میں لگتے  
ایک ساتھ جا کر، وہ بھی اپنے سینما کو پڑھتے کہنے  
کے لیے۔“

”کسی تقریب میں جانا ہو تو عمار غافل ہو کر  
ہونے کا کہتے ہیں یا کہتے ہیں کہ جیسے ملے میں ہوا  
میں چلی چلو؟“

”عمار کو میں بنی سنوری اچھی لگتی ہیں۔ جب کبھی  
کسی تقریب میں جانا ہو۔ عمار کی خواہش ہوتی ہے کہ  
میں خوب تیار ہو کر جاؤں، عمار کی خاطر میں ٹھیک  
شادیوں میں پارلرز سے تیار ہو کر جاتی ہوں۔ وہ  
عام طور پر میں بہت سادہ رہتی ہوں۔ مجھے زیادہ  
سنور نے کا شوق نہیں ہے۔ لیکن میاں کی خاطر  
پڑتا ہے سب کچھ۔“

”عمار صاحب میں ایسی کون سی عادت بہت  
ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو یہ ایک آئیڈیل شوہر ہوتا  
”عمار واقعی ایک آئیڈیل شوہر ہیں۔ میں شوہر  
سے ڈرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ پتا نہیں کیا جسم  
ملے گا۔ مجھ پر پابندیاں نہ لگ جائیں۔ فکری حریت  
ہو، بہت سے خدشات تھے لیکن عمار نے میرا  
سارے خدشات کو غلط ثابت کر دیا۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ عمار سے اچھے شوہر مجھے ملے  
تھے۔ عمار نے مجھے عزت، احترام، مان اور محبت  
ہے۔ میں اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہوں۔ میں جب  
بولڈ اور کل کر لکھتی ہوں تو مجھ پتا ہوتا ہے کہ اگر میں  
دنیا بھی میرے خلاف ہو جائے تو ایک شخص بھی مجھ  
میرے پیچھے کھڑا ہے مجھے حوصلہ دینے کے لیے۔  
ساتھ دینے کے لیے۔ باقی چھوٹی موٹی چیزیں  
ہوتی ہیں ہر انسان میں۔ ان کا سگریٹ دیا ہوتا ہے



مبرا پن بھی کبھی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔“  
 ”ہمارے معاشرے میں طلاقیں بہت ہونے لگی ہیں۔ اس میں قصور کس کا ہوتا ہے۔ لڑکی لڑکے کا یا ان کے گھر والوں کا؟“

”معاشرے میں طلاق کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ آج کل کے بچے بچوں کا بے مبرا پن اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا ایٹو بن جاتا ہے۔ جب ہماری شادی ہوئی۔ ہماری امی نے ایک ہی نصیحت کی تھی کہ اپنے گھر کے معاملات خود سنبھالنے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی

باتیں لے کر ہماری طرف نہ چلی آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی میرے اور عمار کے معاملات نہ میرے گھر والوں کو پتا ہوتے ہیں نہ عمار کے گھر والوں کو..... ہم اپنے سارے مسائل خود ہی حل کرتے ہیں۔

آج کل کی بچیاں صبح اٹھ کر سب سے پہلے اپنی ماؤں کو فون کر کے ایک ایک بات بتاتی ہیں جس کی وجہ سے بہت سارے مسائل جنم لیتے ہیں۔ دلوں میں رنجشیں بھی بڑھتی ہیں اور نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ میاں بیوی جب ایک دوسرے پر اعتماد کرنا شروع کر دیں گے تو طلاق کا ریشہ خود بخود دم ہو جائے گا۔“

”گھریلو معاملات میں کون زیادہ دلچسپی لیتا ہے کہ اس رشتے دار کے یہاں جانا ہے۔ اس کے یہاں نہیں، گفٹ دینا ہے یا کیش۔ کیسے تعلقات رکھنے ہیں۔“

”یہ سارے معاملات میں ہی ہینڈل کرتی ہوں۔ عمار صرف اپنے بہن بھائیوں کے گھروں میں ہونے والی تقریبات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ باقی ان کے انضیال و دھیال میں ہونے والی تقریبات میں، میں اپنی ساس کے ساتھ ہی شرکت کرتی ہوں..... عمار ان تقریبات سے دور بھاگتے ہیں چونکہ میں نے اپنی امی کو یہ سارے رشتے بھاتے دیکھا تھا اس لیے عمار کی عدم دلچسپی کے باوجود جہاں میری ساس بھی

چلنے کے لیے کہتی ہیں، میں ضرور ان کے ساتھ جاتی ہوں۔ اسی طرح میری فیملی میں ہونے والی شادی کی تقریبات میں کسی ایک میں عمار شریک بھی ہوتے ہیں۔ باقی فرائض میں ہی نبھاتی ہوں۔ رشتہ داروں سے ملنا ملانا، دنیا دلانا یہ سب میرے ہی کام ہیں..... عمار ان سب چیزوں سے دور بھاگتے ہیں..... لیکن عمار میزبان بہت اچھے ہیں۔ کسی کے گھر نہ جانا پڑے لیکن ہمارے گھر سب آئیں اور کھانا کھائیں اور خوش گپیاں کریں۔“

”جن لڑکے لڑکیوں کی شادی نہیں ہوئی، ان سے کچھ کہنا چاہیں گی؟“

”میں یہی کہوں گی کہ شادی ضرور کریں۔ یہ ایک خوبصورت بندھن ہے۔ لیکن اس کو نبھانے کی نیت سے کریں۔ بہن بھائی جو سالوں آپ کے ساتھ ہیں، ان سے بھی اختلافات ہو جاتے ہیں۔ یہ تو پھر آپ کی نئی رشتے داریاں بن رہی ہوتی ہیں۔ سو ایک دوسرے کو وقت دیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اگنور کریں تو زندگی بہت سہل ہو جاتی ہے۔ رشتے بنانے مشکل ہوتے ہیں مگر بگڑتے بہت آسانی سے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کی شخصی آزادی کو تسلیم کر لیں تو مجھے نہیں لگتا کہ اس بندھن کو نبھانے میں کوئی رکاوٹ ہوگی۔“

”اور آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی۔“

”جی..... بالکل..... آخر میں خواتین اور شعاع کا بہت شکریہ۔ میں 1995 سے ان ڈائجسٹوں کی قاری ہوں۔ اس وقت سے آج تک کے تمام شمارے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ لڑکیوں کی کردار سازی میں اس ادارے اور ان میں کام کرنے والے لوگوں اور رائٹرز کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اللہ مزید کامیابیوں سے نوازے (آمین)۔ ڈرامہ انڈسٹری کو بہت سے رائٹرز بھی اسی ادارے کے توسط سے ملے..... ورنہ ڈرامہ انڈسٹری تو ایک جوہر کا شکار تھی۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شہلا سکندر سے اجازت چاہی۔



## ایسٹن انعم تنویر سے

شایین رشید

1۔ "اس کی ٹیڈی بلی؟"

8۔ "کھانسی کا پھبت؟"

"ایم بی اے مارکیٹنگ ڈسٹری بیوٹرز؟"

9۔ "شوہر میں آمد؟"

"حادثاتی طور پر آئی ہوں۔ میں ایک ایئر وائزنگ ایجنسی میں انٹرن شپ کر رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ کیمرے کے پیچھے کام کرنے سے بچ رہے کہ میں کیمرے کے سامنے اپنی صلاحیتیں دکھاؤں، بس یہی سوچ کر اداکاری کی لیلہ میں آ گئی۔"

10۔ "گھر والوں کا رد عمل؟"

"نہیں جی انکھروالوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ کام کروں۔"

1۔ "اصلی نام؟"

"انعم عمر۔"

2۔ "پیار کا نام؟"

"وہی۔"

3۔ "تاریخ پیدائش؟"

"8 فروری۔"

4۔ "قد/ستارہ؟"

"5 فٹ 7 انچ/ Aquarius (دلو)۔"

5۔ "مادری زبان؟"

"اردو۔"

6۔ "بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟"

"ہم تین بہنیں ہیں میرا بھرا بھرا ہے۔"

7۔ "شادی؟"





# الکلی

میں جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار خط لکھ کر اپنی غلطی کی بات کہتی ہے۔  
ایک پرتو از سے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ حجاب کا خطرہ  
ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آ گیا ہے۔  
ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ نیک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے  
روحانیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔

قلب مومن اندھری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر، اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔  
مومن سلطان ایک باصلاحیت فنکار ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کلمہ نہیں  
ہے۔ اندھری میں بیرونی اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔

مومن کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہن  
ہاں ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے اندھری سے آؤٹ ہے۔ مومن کی ماں شریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے  
اندھری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومن کے اکلوتے بھائی جہانگیر کے گردے جواب دے چکے ہیں، وہ ڈائلاکس ہے۔

Pakibooks Site





مردے کے فراسپلائٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومنہ لیلوں میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ اسے لطم اندازی پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑا ہے۔  
 قلب مومنہ نئی فلم بنانے کا اعلان کرتا ہے تو داؤد مومنہ کی سٹارٹ کرتا ہے۔ وہ آٹیشن کے لیے قلب مومنہ کے پاس جاتی ہے تو قلب مومنہ اس کو دوپٹا اتارنے کے لیے کہتا ہے۔ مومنہ انکار کر دیتی ہے تو وہ اسے اسٹوڈیو سے نکل جانے کے لیے کہتا ہے۔  
 مومنہ ہاؤسنگ جاتی ہے تو اس کو یاد آتا ہے کہ وہ جہانگیر کی میڈیکل ٹیسٹوں کی فائل اسٹوڈیو میں بھول آئی ہے۔ وہ لوٹ کر جاتی ہے تو قلب مومنہ اس کے ساتھ بہت تنگ آ میزائڈ میں ٹوٹا جاتا ہے جو اب مومنہ بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی اور اسے کمری کمری سنا کر آئینہ دکھا دیتی ہے۔  
 وہ کہتی ہے کہ تمہارا کام پیپ اور تم اس سے زیادہ پیپ ہو، عورت کا جسم دکھا کر جو تم آرٹ کی خدمت کر رہے ہو، میں اس کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔

طہ عبدالعلی اپنے باپ کو خدا لکھتا ہے اور اس میں معذرت کے ساتھ اپنی تکلیف بھی بیان کرتا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ وہ طہ کو معاف کریں گے تو علی اللہ اسے معاف کرے گا۔  
 قلب مومنہ کو اس کی ماں ایک خطا دیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ خطا پڑھنے پر اسے علم ہوتا ہے کہ یہ خطا اللہ نے نہیں اس کے دادا عبدالعلی نے لکھا ہے وہ اس سے ملنے آ رہے ہیں۔  
 حسن جہاں کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر بھی واپس آ رہا ہے تو وہ خوب سختی سنورتی ہے اور بے تحاشا خوش ہوتی ہے۔ قلب مومنہ اپنی ماں کو اس طرح دیکھ کر بہت رونا جاتا ہے۔ اور ماں سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے۔  
 مومنہ کو اس کی ماں سمجھاتی ہے کہ اسے مثل کرنی چاہیے مٹی اور یوں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جہانگیر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور سچا سنا رہے گی۔ جبکہ مومنہ اداکارہ نہیں بننا چاہتی۔ اسے خطا ملی سے دلچسپی ہے۔  
 مومنہ اپنی انا کو مار کر اپنی دوست سے کہتی ہے کہ وہ ایک بار پھر داؤد سے بات کر لے۔ شاید قلب مومنہ اسے موقع دے دے، جہانگیر کی دن بدن بگڑتی حالت اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ قلب مومنہ سے کام مانگے۔  
 جبکہ دوسری جانب مومنہ نیا کو پوچھ کر کہتا ہے اور ایک بے حد تیزی انگوٹھی اسے پہناتا ہے۔ قلب مومنہ کے گھر ہونے والی ایک اور پارٹی میں پوری اندھ سڑی مدعو ہوتی ہے۔ لیکن اچانک ملازم کسی نئے مہمان کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جسے دیکھ کر قلب مومنہ ساکت رہ جاتا ہے۔  
 قلب مومنہ اللہ کو خط لکھتا ہے۔

کچھ دن بعد اس سے اس کے دادا ملنے آتے ہیں لیکن باپ نہیں آتا۔ عبدالعلی سے حسن جہاں کو علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر عبدالعلی کے پاس بھی نہیں گیا۔ عبدالعلی قلب مومنہ کے لیے ایک پیٹنگ لے کر آتے ہیں جو ان کے ہاتھ کی نئی ہوتی ہے۔ کچھ دن بعد مومنہ ان سے نیہا کی ملاقات کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس کی قریبی دوست ہے۔  
 مومنہ حالات سے مجبور قلب مومنہ کے پاس جاتی ہے لیکن وہ اسے بے عزت کر کے آفس سے نکال دیتا ہے۔ وہ انتہائی دکھی اور نفرتی حالت میں ماسٹرا براہیم کے پاس جاتی ہے جہاں وہ شہید قرآن پاک کی مرمت کا کام کرتے ہیں۔ وہ اسے تسلی دیتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوتی ہے۔  
 مومنہ کو اس کی دوست کا فون آتا ہے وہ اسے آڈیشن کے لیے لاہور بھیجتی ہے جہاں اس کا آڈیشن کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے ہالی وڈ کی فلم کے لیے سائن کر لیا جاتا ہے۔  
 قلب مومنہ اور نیہا کا جھگڑا ہو جاتا ہے جس کی وجہ ضوٹی ہے۔ مومنہ کراچی واپس آتی ہے تو اسے داؤد کا رویہ عجیب لگتا ہے وہ گھر کے بجائے اسے مردہ خانہ لے آتا ہے۔

(اب آگے پڑھیں)



میری باری بیٹی حسن جہاں!  
السلام علیکم

تمہارا حال پوچھنا چاہتا ہوں..... پوچھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا۔ تمہارا حال تو جانتا ہوں میں..... اور میں ہی تو جانتا ہوں تمہیں اس حال میں لانے کی..... تمہیں کیا لگے۔ میری بیٹی کیا لگے؟

بہت ساری باتیں ہیں جو تم سے کہنا چاہتا ہوں لیکن لفظ..... لفظ اس کاغذ پر وہ لکھنے سے قاصر ہیں جو میرے دل میں ہے۔ لیکن تمہارا دوبارہ سامنا کرنے سے تمہارے نام یہ خط لکھنا آسان ہے میرے لیے۔

تم سے کیا کہوں.....؟ کہ میں شرمندہ ہوں یا یہ اعتراف کروں تم سے کہ میں گناہ گار ہوں کہ حسن جہاں تمہارا وہ گھاؤ بھر جائے جو میرے ہاتھوں لگا اور تم مجھے معاف کر سکو۔

میں نے اپنی ساری زندگی کیونٹس اور کاغذ پر صرف اللہ کی بڑائی اور صفائی بیان کرتے گزاری ہے۔ روشنائی اور رنگوں سے خطاطی کرتے عمر بسر کی ہے، مگر یہ سمجھ نہیں پایا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرتے کرتے غرور کا وہ کون سا لمحہ تھا جس میں میں خود کو بھی ”بڑا“ مان بیٹھا تھا..... نیک، مٹی، پرہیز گار۔ گناہ نہ کر سکنے والا..... یا نہیں حسن جہاں! میں مومن سے کافر کس وقت ہوا تھا..... لیکن کبھی نہ کبھی کچھ تو ایسا کر بیٹھا تھا میں کہ ٹھوکر کھائی تو اللہ نے سنبھالا نہیں، کرنے دیا..... اور میں گرتا ہی چلا گیا۔

اور اب جب یہ خط لکھنے بیٹھا ہوں تو یہ کاغذ آئینہ بن کر مجھے میرا وہ عکس دکھا رہے ہیں جن سے میں نظریں نہیں ملا سکتا۔

اس عمر میں اکلوتی جوان اولاد کو کھودینے کے بعد میری زندگی کا وہ مخور گم ہو گیا ہے جس کے گرد میری زندگی گھومتی تھی۔ اب کچھ بھی یاد نہیں رہتا مجھے۔ نہ کھانا نہ پینا..... نہ سونا جا گنا..... نہ ہی دنیا کی کوئی اور چیز..... سب کچھ لے گیا ہے میرا..... بس میرا وجود چھوڑ گیا ہے اپنے اس پچھتاوے کے ساتھ جو ہر وقت میرا گلا گھونٹتا رہتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اب اس پچھتاوے کا کروں کیا اور اس وجود کا مصروف کیا رہ گیا ہے۔

وہ خطاطی جو کئی نسلوں سے خون کی طرح ہماری رگوں میں بہتی آئی تھی لٹے کے جانے کے بعد سو کھٹے گئی ہے۔ اب میری اگلی نسلوں میں کوئی اللہ کی کبریائی اور بڑائی بیان کرنے والا نہیں آئے گا۔ یہ میری سزا ہے۔ میرے غرور کی..... میں اس کی شکایت کسی سے نہیں کر سکتا۔

لٹ مٹی ہو گیا..... میں مٹی بھی نہیں ہو سکتا..... اس دنیا سے جانے کی باری میری تھی۔ مہلت اس کو نہیں ملی۔ اس عمر میں جو تم میرے حصے میں آیا ہے، وہ جمیلا نہیں جا رہا۔ یہ جو گھر ہے جس میں میں رہتا ہوں یہاں کی ہر شے، ہر دیوار کے ساتھ اس کی یادیں لپٹی ہیں۔ میں ہر روز صبح اس کی یادوں کو درختوں کی بڑھی ہوئی شاخوں کی طرح کاٹ کر باہر پھینک آتا ہوں۔ وہ رات تک پھر سے اُگ آتی ہیں، پرانی یادوں کی رو جانے والی جڑوں میں سے..... میں یہ فصل کاٹنے کا نئے کھنٹے لگا ہوں۔ گھر سے خالی ہو گیا اُس کی یادوں سے خالی ہونے کو تیار نہیں۔

وہ تمہارے ساتھ چلا گیا تھا تو اس گھر میں اس کی یادیں اس طرح نہیں اُگتی تھیں۔ میری نفرت اور غصہ ہر اُگنے والی یاد کو کھا جاتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب میرے اندر کچھ بھی نہیں رہا۔ غر، غرور، آن، غصہ سب ختم ہو گیا..... اگر کچھ بچا ہے تو روشنی کی وہ کرن جو قلب مومن کے نام سے تمہارے گھر کو روشن کیے ہوئے ہے۔ میں ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا ہوں جب اپنے اندر باہر ہر طرف اندھیرا ہو جاتا ہے تو اُس کے چہرے کی روشنی مجھے راستہ دکھانے لگتی ہے۔ کیا اسے اپنا یہ بوڑھا دادا یاد آتا ہے.....؟ مگر میں اُسے کیوں یاد آؤں گا؟ میں نے اُس کو دیا ہی کیا ہے؟ اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے لگا کہ کانچین لوٹ آیا وہ بچپن میں قلب مومن جیسا ہی تھا۔ ویسا ہی معصوم چہرہ ویسی ہی میٹھی آواز، ویسے ہی سوال اور شرارتیں..... پر قلب مومن تو شرارتیں نہیں کرتا۔ وہ تو



بس ملے کیا کرتا تھا، قلب مومن تو بس سوال کرتا ہے اور ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں..... اس کا مجرم ہوں میں..... میں نے اُس سے شرارتیں چھین کر یہ سوال تھما دیے۔ میں نے بڑا ظلم کیا۔ میری بیٹی حسن جہاں..... تم مجھے معاف کر دو۔ دل سے معاف کر دو۔ قلب مومن کو میرا بہت پیار دینا۔ اُس سے کہنا وہ اللہ کو ایک خط اپنے دادا کے لیے بھی لکھے۔ اللہ سے کہے..... اُس کے دادا کا ہنر اُسے واپس کر دے۔ قلب مومن کا ہر خط اللہ کو پہنچ جاتا ہے وہ تمہارا بیٹا ہے نا اس لیے۔

والسلام  
قلب مومن کا دادا

☆☆☆

قلب مومن نے اسٹریچر پر لیٹی حسن جہاں کو دیکھا جسے پیرامیڈ کس گھر سے باہر کھڑی ایسبولنس کی طرف لے جا رہے تھے اور پھر اُس نے اپنے دادا کو دیکھا جو بتے آنسوؤں کے ساتھ اُس اسٹریچر کے پیچھے آ رہا تھا۔ قلب مومن اور اُن کی نظریں ملی تھیں اور قلب مومن کے چہرے کا خوف جیسے عبدالعلی کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔ مومن سائیکل سے گرنے کے بعد اپنی چوٹوں کو بھول گیا تھا اور اپنی اُس سائیکل کو بھی جو رستے میں گری پڑی تھی۔ وہ بس ایسبولنس کی طرف بھاگا تھا اور دادا نے اُسے روک لیا تھا۔

”مئی کو کیا ہوا؟ میری مئی کو کیا ہوا؟“ عجیب خوف کے عالم میں اُس نے عبدالعلی سے پوچھا تھا۔  
”دعا کرو کچھ نہ ہو۔“ عبدالعلی نے اُسے ساتھ لیٹاتے ہوئے کہا تھا۔

ایسبولنس اب دور جا رہی تھی اور قلب مومن کو عبدالعلی کی ٹانگوں سے لپٹ کر جیسے عجیب سکون کا احساس ہوا تھا وہ کسی چڑیا کے بچے کی طرح کانپ رہا تھا۔ عبدالعلی نے اُسے گود میں اٹھالیا۔ وہاں کھڑے اُس پاس کے گھروں میں رہنے والے لوگ اب وہاں سے آہستہ آہستہ جانے لگے تھے۔ دادا کی گود میں چڑھے قلب مومن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں اس کے لیے ترس کیوں تھا..... وہ اس عمر میں بھی اُس احساس کو پہچان سکتا تھا۔  
”مئی کے پاس جانا ہے۔“ اُسے ایک دم ماں کی یاد دوبارہ آئی تھی اور تب ہی اس نے عبدالعلی کی آنکھوں سے مسلسل بہتے ہوئے آنسو بھی دیکھے تھے۔ وہ شاید اُس کی مئی کے لیے رو رہے تھے۔ قلب مومن نے خود ہی سوچ لیا تھا، اُن آنسوؤں نے قلب مومن کے دل کو جیسے کچھ اور نرم کیا تھا عبدالعلی کے لیے۔  
آئی سی یو میں حسن جہاں بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور عبدالعلی کے ساتھ قلب مومن بھی اُسے شیشے سے دیکھ کر مری طرح بے چین ہوا تھا۔

”مئی کو کیا ہوا ہے دادا؟“ اس نے عبدالعلی کے ہاتھ کو بے تابلی سے ہلایا تھا۔ اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے عبدالعلی نے اُس سے کہا۔

”وہ بیمار ہو گئی ہیں۔“ اُسے بتاتے ہوئے ان کی آواز بھر آئی۔  
قلب مومن نے اس بار ان آنسوؤں پر غور کیا۔ ”آپ کیوں رو رہے ہیں؟“ اس بار وہ جیسے پوچھتے بغیر نہیں رہ سکا۔

”مجھ سے ایک گناہ ہو گیا ہے مومن۔“ عبدالعلی کا جیسے حوصلہ جواب دے گیا۔  
مومن کو یک دم یاد آیا، اُس کی ماں نے بھی تو کسی گناہ کی بات کی تھی جس کو اُس کے باپ نے معاف نہیں کیا تھا اور اب دادا بھی کسی گناہ کی بات کر رہے تھے۔  
”مئی نے کہا تھا، اُن سے بھی کوئی گناہ ہوا تھا۔“ اس نے بے اختیار عبدالعلی سے کہا۔  
”نہیں تمہاری مئی نے کوئی گناہ نہیں کیا مومن..... یہ میرے گناہ کی سزا ہے۔“ وہ ہلکے ہلکے گونے لگے تھے۔



قلب مومن کو اس لئے عبد اعلیٰ بہت زیادہ ترس آیا۔ اس کا دل چاہا، وہ انہیں اپنے ساتھ لگا کر چلے جیسے وہ اسے تھپکتے تھے۔

”اللہ تعالیٰ کیا ہم سب کو سزا دیتے ہیں؟ مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا ہے دادا۔“ عبد اعلیٰ کا ہاتھ دوبارہ تھامتے ہوئے قلب مومن نے جیسے اپنا خوف اُن کی جھولی میں ڈالا۔

”اللہ سزا نہیں دیتا..... ہم سب دیتے ہیں۔“ انہوں نے جیسے اس ننھے بچے کے دل سے اُس خوف کو مٹانے کی کوشش کی۔

”کیا اللہ تعالیٰ ہم سے سزا دینے کو کہتے ہیں؟“

”مومن! مجھ سے وہ سوال مت پوچھو جس کا جواب میرے پاس نہیں۔“ اس نے عبد اعلیٰ کو ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔ آئی سی پو کے ششے سے اُس نے بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی حسن جہاں کو دیکھا۔ قلب مومن کو اُس وقت احساس ہوا اُسے صرف حسن جہاں کی ضرورت تھی بابا کی نہیں وہ اُن کے بغیر رہتا سیکھ چکا تھا..... وہ حسن جہاں کے بغیر رہنا سیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلے دو دن وہ دادا کے ساتھ ہسپتال جاتا رہا اور پھر اُس نے بالآخر حسن جہاں کو آنکھیں کھولتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جنہیں وہ ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا۔ یہ آنکھیں خالی تھیں، اُن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس آٹھ سال کے بچے نے وہ تبدیلی محسوس کی تھی اور بڑی شدت سے کی تھی۔ کچھ ہوا تھا اُس کی ماں کو مگر کیا ہوا تھا۔ یہ وہ جان نہیں بارہا تھا۔

”ننی! آپ ٹھیک ہو گئیں میں نے اتنی دعائیں کی تھیں۔“ اُس نے حسن جہاں سے لپٹ کر جیسے اُس میں وہی گرمی وہی تمازت ڈھونڈنے کی کوشش کی جو ہمیشہ سے وہ اُس کی آغوش میں محسوس کرتا تھا۔ حسن جہاں نے اُسے لپٹا لیا تھا۔ قلب مومن نے اُسے کہتے سنا۔

”میں نے بھی بڑی دعائیں کی تھیں۔ میری تو کوئی دعا قبول نہیں ہوئی.....“

قلب مومن نے حسن جہاں کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر عبد اعلیٰ کی آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اُس نے انہیں ہاتھ جوڑتے۔ حسن جہاں سے کہتے سنا۔

”مجھے معاف کر دو بیٹی، مجھے معاف کر دو۔“ حسن جہاں بڑبڑاتی تھی۔

”آپ کو معاف کر دوں گی..... اپنے آپ کو کیسے کروں گی۔“ وہ کیا پہیلی تھی جو عبد اعلیٰ اور حسن جہاں کی گفتگو میں پنہاں تھی۔ وہ کیا گناہ تھا جو انہیں سزا دے کر گیا تھا اور وہ کیا شے تھی جس سے وہ محروم ہوئے تھے۔ قلب مومن سمجھ نہیں پایا..... سمجھ میں آئی تھی تو صرف ایک بات..... وہ دونوں اب اُس کے باپ کی بات نہیں کرتے تھے اور اُس کو پہلے کی طرح ڈھونڈ بھی نہیں رہے تھے..... مگر قلب مومن اب حسن جہاں سے کوئی ایسی بات نہیں پوچھنا چاہتا تھا جو اُس کی ماں کو رلاتی اور پتا نہیں کیوں اُسے لگتا تھا، وہ یہ سوال کرے گا تو اُس کی ماں روئے گی۔

اللہ کو ایک اور خط لکھنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ قلب مومن کو کوئی جواب اپنی دنیا اور اپنے رشتوں سے نہیں مل رہا تھا۔

”جب غلطیاں ہو جاتی ہیں تو کیا وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتیں اور جب گناہ ہو جائیں تو کیا ہمیشہ اُن کی سزا ملتی ہے..... کیا اللہ معاف نہیں کر سکتا؟“

قلب مومن کو اب اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کرنے تھے کیونکہ وہ اپنے گھر میں دو لوگوں کو تکلیف میں دیکھ رہا تھا اور وہ اُس تکلیف کی جڑ کو کھوجنا چاہتا تھا۔

جنگل میں تنے پر دھرا اس کا لیٹر ہا کس غائب تھا۔ قلب مومن کو چند لمبے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔



خواتین ڈائجسٹ 34 نومبر 2018



رکھتے ہوئے اس کے دادا نے انہیں رخصت کیا تھا۔ قلب مومن نے ان دونوں کے درمیان کسی اور جملے کا چننا نہیں سنا تھا۔ ماں کی انگلی پکڑے ٹرین کے دروازے تک پہنچتے قلب مومن نے پلٹ کر دیکھا۔ اُس کے دادا وہیں کھڑے رو رہے تھے جہاں وہ اُن سے الگ ہوئے تھے۔ اُس نے گردن موڑ کر حسن جہاں کو دیکھا، وہ بھی بے آواز رو رہی تھی۔ قلب مومن کا دل دکھا۔ اُسے یقین تھا وہ دونوں بابا کے لیے رو رہے تھے اگر باہل جاتے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ مگر وہ انہیں ڈھونڈ نہیں سکے تھے۔ اُس نے مایوسی سے سوچا۔

”بابا مل جاتے تو کوئی بھی ایسے نہ روتا۔“ اُسے پاکستان میں ایک بار پھر سے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنا تھی جہاں وہ لیٹر باکس رکھتا اور پھر اُس میں وہ خط ڈالتا جس میں اللہ سے کئے گئے سوال اور فرمائش ہوتیں۔

☆☆☆

”یہ ہمارا گھر ہے؟“

قلب مومن نے بے یقینی کے عالم میں اُس وسیع و عریض شان دار بنگلے کے دروازے کو دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا تھا جس کے باہر وہ ٹیکسی سے اتر کر کھڑے تھے اپنے سامان کے ساتھ۔ حسن جہاں نے اُسے دیکھے بغیر سر ہلایا تھا۔ وہ جیسے کسی سوچ میں گم تھی، کوئی اُدھیڑ بن کرتے ہوئے۔ قلب مومن اپنی خوشی پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ اتنا بڑا گھر..... وہ تو دلاتھا۔ ترکی سے پاکستان آ جانے کا اُنم یک دم غائب ہو گیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر گیٹ سے پرے نظر آنے والی اُس دو منزلہ شان دار عمارت کو دیکھتا رہا۔ جس کا گیٹ کسی مرد نے کھولا تھا۔

”کون؟“ وہ کوئی ملازم تھا مگر اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ حسن جہاں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس نے بے اختیار گیٹ کھول دیا تھا۔ حسن جہاں سامان چھوڑ کر قلب مومن کا ہاتھ پکڑے کھلے دروازے سے اندر آئی تھی۔

”مئی ہم رنج (امیر) ہو گئے ہیں؟“ قلب مومن نے بے پناہ خوشی کے عالم میں گھر کے اندر کھڑی گاڑیوں اور لان کو دیکھتے ہوئے ماں کے ساتھ چلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ وہ جواب دیے بغیر اُس کی انگلی پکڑے جب چاب چلتی رہی۔

”ہم گاڑی میں بیٹھا کریں گے اب؟“ قلب مومن کو پروا نہیں تھی کہ اُس کے پچھلے سوال کا جواب آیا تھا یا نہیں۔ وہ اُن چمکتی دھندلی گاڑیوں سے مرعوب ہو رہا تھا جن کو اُس نے ٹی وی پر یا ترکی کی سڑکوں پر دیکھا تھا۔

حسن جہاں اب اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے گھر کے اندر لے آئی تھی اور قلب مومن نے پہلی بار اُس گھر کی دیواروں پر جگہ جگہ حسن جہاں کی تصویریں لگی دیکھی تھیں۔ بے حد بھڑکیلے پکڑوں میں میک اپ سے تھڑے ہوئے چہرے کے ساتھ عجیب عجیب پوز اور پوچھ راز میں..... ایک لمحہ کے لیے اُسے لگا وہ اُس کی محی تھیں۔ اُس کی مٹی تو بھی بھی ایسے کپڑے نہیں پہنتی تھیں اور ڈانس تو بھی نہیں کر سکتیں اس طرح۔

”مئی! یہ آپ کی تصویریں ہیں؟“ وہ حسن جہاں سے جیسے تعریفی چاہتا تھا۔ حسن جہاں نے اُس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اُن بہت سارے لوگوں کی طرف متوجہ بھی جولاؤنچ میں بیٹھے تھے اور انہیں دیکھ کر جیسے وہ سب ہکا بکا ہو گئے تھے۔

”اماں..... میں آگئی۔“ قلب مومن نے حسن جہاں کو اُن پانچ چھ لوگوں میں شامل ایک عورت کو مخاطب کرتے دیکھا۔ مومن نے اُن بھی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ جیسے ماں کا وہاں موجود لوگوں سے رشتہ سمجھتا چاہتا تھا۔

ایک تخت لہلا کا کچھ پر گاؤں سے لپک لگائے وہ اوجیز عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی جسے حسن جہاں نے ماں کہہ کر پکارا تھا اور جس کے سامنے وہ اب قلب مومن کے ساتھ بحرمانہ انداز میں سر جھکائے کھڑی تھی۔

”آتا ہی تھا تو نے حسن جہاں..... آتا ہی تھا..... تو مجھے اعلان کر کے کیا بتا رہی ہے۔“ اُس عورت نے آلتی ہاتھ مارے بیٹھے بیٹھے اپنا کاؤ نکلیہ سیدھا کیا۔ اُس کی کاٹ دار نظریں قلب مومن پر ایک لمحہ کے لیے لگی تھیں پھر



دوبارہ حسن جہاں پر چلی گئی تھیں۔

”اب آگئی ہے تو بیٹھ جا..... پانی پاا اسے۔“ اسی عورت نے حسن جہاں سے کہتے کہتے کسی ماں کی بات کی تھی۔ حسن جہاں میکائیلی انداز میں ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔ قلب مومن کو اس نے اسی صوفہ پر ساتھ لگا لیا تھا۔ قلب مومن نے باری باری اُن سب لوگوں کو دیکھنا شروع کیا جو وہاں کھڑے تھے۔ اُن سب کی نگاہیں اُنکھوں میں اُس نے اپنی ماں کے لیے ایک نئی تاثیر دیکھا تھا۔ نفرت کا۔ قلب مومن کا دل ایک دم لمبا لگا تھا۔ شان دار گھر اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا نہ ہی وہاں موجود لوگ۔ اُن میں سے کسی کی تو وہ قلب مومن پر ہی تھی۔

”ممتاز نے حسن جہاں بنایا اور تو چلی گئی کہنے بنے۔“ قلب مومن نے اسی عورت کو تیز انداز میں جھجھکی بھئی کے ساتھ اپنی ماں سے کہتے سنا۔ اُس نے ماں کا چہرہ دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر پتھر بھی نہیں تھا۔

”خود غرضی دیکھیں اماں اس کی..... ہمارا نہیں سوچا اس نے۔“ اس بار قلب مومن نے ایک مرد کو بلند آواز میں کہتے سنا تھا۔

”ہم مرتے یا جیتے، اس نے پروا نہیں کی۔“ وہ وہاں کھڑی ایک اور لڑکی تھی جس کی شکل اس کی ماں سے ملتی تھی۔ قلب مومن نے اُس کی بات سنتے ہوئے غور کیا۔

”پروا کیوں کرتی یہ.....؟ یہ تو پیار کر رہی تھی..... پیار بڑا ہوتا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی سے بھی بڑا۔“ تو مسیحا بن کر آیا تھا اس کے لیے..... شیطان تو ہم تھے..... کیوں حسن جہاں۔“

قلب مومن نے ایک بار پھر اُسی ادھیڑ میر کی عورت کو کہتے سنا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پتیلی پر کچھ رکھ کر دوسرے ہاتھ کی پتیلی سے اُسے ملاتے ہوئے منہ میں ڈال رہی تھی۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھیں سیاہ کا جل کے ساتھ اس وقت بے خوف ناک لگی تھیں مومن کو۔ اور اُس کے ہونٹوں اور دانتوں دونوں پر عجیب سا لال رنگ لگا ہوا تھا۔ قلب مومن اُسے بنور دیکھ رہا تھا۔ وہ اُس کی باتیں سن رہی تھی حسن جہاں نے ایک بار اُسے بتایا تھا کہ چاند کی بڑھیا کی طرح اُس کی بھی ایک ہانی تھی۔ جو دور دیس میں رہتی تھی مگر قلب مومن نے جو تصور اپنی اُس نالی کا بنایا تھا وہ ممتاز جہاں جیسا نہیں تھا۔

”ایسے تو کوئی سوتیلے رشتوں کے ساتھ نہیں کرتا جس طرح اس نے سکے رشتوں کے ساتھ کیا۔ گارڈیہ شروع کیا تھا میں نے اور یہ اُس وقت بھاگ گئی۔ میرا کاروبار ڈبو گئی۔“

قلب مومن نے اُسی مرد کو دوبارہ بلند آواز میں کہتے سنا جس نے پہلے اُس کی ماں کو ملامت کی تھی۔ عجب بے چینی کے ساتھ اُس نے حسن جہاں کو دیکھا تھا۔ وہ ویسے ہی بیٹھی تھی خاموش سر جھکائے، خشک آنکھوں کے ساتھ۔ مومن بے قرار ہوا۔ اُس کی ماں کو بولنا چاہیے تھا، کچھ کہنا چاہیے تھا۔ اس طرح کیوں اُسے برا بھلا کہہ رہے تھے وہ سب لوگ۔ وہ ماں کو جھجھوڑنا چاہتا تھا۔

”بچے فلم میں کامیاب ہوا تھا پر نہیں۔ باجی کو کیا؟ بس خود نمبروں رہتی..... اپنا سکھ چلا رہتا۔ بہن جانے بھاڑ میں۔“ اب وہ لڑکی نئی سے کہہ رہی تھی۔ قلب مومن نے حسن جہاں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ ماں کو اُن سب کی باتوں سے بچانے کے لیے فی الحال صرف یہی کر سکتا تھا۔

”کیسی کیسی باتیں کی تھیں میں نے..... ماں کی سالوں کی محبت کو پیار کی بھنی میں نہ جھونک۔“ نمبر ایک میر دن کا کدبانہ گروار ہی تھی ممتاز، کروڑوں مردوں کے دلوں اور دماغوں پر..... اس کو چاہیے تھا ایک مرد کے نام کا پٹا..... اور یہ..... اب ممتاز کیا کرے تیرا..... اچار ڈالے..... اماں میں آگئی۔“ ممتاز اب بالآخر اپنے کاؤنٹی سے اتر آئی تھی اور اپنی پاٹ دار آواز میں حسن جہاں کو لعنت ملامت کرتے ہوئے اُس نے اس کی اصل اتاری اور پھر لاؤنڈی سے کھل گئی۔ اُس کے پیچھے باری باری وہ سارے لوگ بھی وہاں سے چلے گئے تھے جو صبح



جہاں کو متنازع کی طرح وقفہ وقفہ سے برا بھلا کہہ رہے تھے۔

عجب خاموشی تھی جو ان سب کے جانے کے بعد وہاں در آئی تھی اور اسی خاموشی میں قلبِ مومن نے پہلی بار وہاں اُس شخص کو نمودار ہوتے دیکھا جو ان کے ترکی والے گھر آیا تھا تو ان کی زندگی تباہ کر کے چلا گیا تھا۔ قلبِ مومن کی آنکھوں میں اُس کا چہرہ نقش تھا۔ وہ اتنے عرصہ بعد بھی اُسے پہلی نظر میں پہچان گیا تھا۔ کسی تعارف کے بغیر۔ وہ شخص اپنی کی طرح دبے قدموں اندر آیا تھا اور اندر آتے ہوئے اُس کی نظریں صرف حسنِ جہاں پر تھیں۔ وہ سیدھا اُس کے سامنے آیا تھا۔ پھر مومن نے اُسے اپنے سامنے کھڑے ہوتے دیکھا۔ وہ حسنِ جہاں کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھا رہا تھا۔ حسنِ جہاں اور اُس کی نظریں ملی تھیں۔ مومن کا دل چاہا وہ اپنی ماں کی ٹھوڑی کے نیچے لگے اُس کے ہاتھ کو جھٹکے۔ مگر اُس کی ماں اُس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا کر کے آئی ہیں؟“ اُس شخص نے عجیب دل گرفتگی کے عالم میں حسنِ جہاں سے کہا تھا۔ پانی سیلاب کی طرح حسنِ جہاں کی آنکھوں میں اُمڈا تھا۔

”پیارے کے آئی ہوں۔“ قلبِ مومن نے حسنِ جہاں کو کہتے سنا۔ اُس نے بچے آنسوؤں کے ساتھ اپنی ماں کو کہتے دیکھا۔ وہ اب اُس شخص سے لپٹی رو رہی تھی۔ وہ شخص بھی رو رہا تھا۔ صرف قلبِ مومن تھا جس کا دل اس وقت بھول کا کاٹنا بن گیا تھا۔

☆☆☆

مومن کو لگا جیسے کسی چیز نے اس کے پیٹ میں مکا مارا ہوا وہ داؤد اور اقصیٰ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اُسے وہاں کیوں لائے تھے مگر اُس کی زبان پر وہ سوال نہیں آ رہا تھا۔ وہ بدترین خدشات کے درمیان جھولنے کی اس کیفیت سے جیسے باہر نکل آنے کی جرأت نہیں کر پا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے جہاں تگیر کا چہرہ آ رہا تھا۔ دردِ اب پیٹ سے پسلیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اُس نے یاد ہونے کے باوجود انگلیوں کی پوروں پر وہ دن گئے جتنے دنوں سے اُس نے جہاں تگیر کی آواز نہیں سنی تھی..... چار دن..... اور ان چار دنوں میں اُسے اگر کچھ ہوا تھا تو اُسے پتا کیوں نہیں چلا تھا۔ اُس کی سانس کیوں نہیں رُکی تھی، اُس کا دل کیوں نہیں رُکا تھا؟ ”مومن۔“ برابر بیٹھی اقصیٰ نے اُس کا نام پکارا۔ اُس نے میکا نیکی انداز میں گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔ اقصیٰ ایک دم اُس سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔

”جہاں تگیر۔“ اُس نے بس ایک لفظ کہا تھا۔ مومن نے ایک بھی نہیں۔ سارے اندازے، قیاسے اُس کی پوروں پر تھے۔ وہ جہاں تگیر کا نام نہ بھی لیتی تو بھی وہ جان گئی تھی، وہ کہاں تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر وہ کسی بت کی طرح بیٹھی رہی۔ اقصیٰ اُس سے لپٹی روتی رہی اور مومن سلطان اُسے دیکھتی رہی۔ اُسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ آنسوؤں کو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ خشک نہیں ہوئے تھے، بہنا بھول گئے تھے۔ داؤد نے اُس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اقصیٰ اُس سے الگ ہو گئی۔ مومن میکا نیکی انداز میں کھلے دروازے سے باہر آئی تھی اور اسی انداز میں ہی اُس نے مردہ خانہ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

اقصیٰ نے اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا، اُس نے پکڑنے دیا۔ داؤد اس کے پیچھے آیا تھا۔ مردہ خانہ کے دروازے سے باہر تیرا آندھنے کی سیڑھیوں میں اُس نے دیوار سے ٹک لگائے زمین پر بیٹھے ٹریا اور سلطان کو دور لے جانے دیکھ لیا تھا۔

”تمہارے جانے کے بعد اگلے دن طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی اُس کی لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں نہ بتائیں۔ آنتی نے مجھے فون کیا تھا۔ ہم بڑی جگہ لے کر پھر رہے اُسے لیکن اُس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ دونوں گردنوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا..... کل وہ.....“ اقصیٰ نے بات مکمل نہیں کی۔ اُس سے آگے جو کہنا تھا، وہ



مومنہ جانتی تھی۔ مگر اب جیسے وہ یہ سنائی نہیں چاہتی تھی۔

ثریا اور سلطان نے اُسے دور سے دیکھ لیا تھا۔ سلطان اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں رورہا تھا جیسے کوئی بچہ کسی بڑے کو دیکھ کر تسلی چاہنے والے انداز میں روتا ہے۔ مومنہ نے ثریا کو دیکھا، وہ وہیں بیٹھی تھی۔

کے ساتھ، مگر صدمہ۔ مومنہ کو دیکھ کر بھی نہیں اٹھی تھی۔  
"لاش نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں پہلے ہسپتال کے بل کیئر کرو۔" اپنی آنکھیں رگڑتے، روتے ہوئے  
سے لپٹے سلطان نے کہا تھا۔ مومنہ سلطان کی سالوں سے اس گھر کا کمانے والا مرد تھی..... اور زندگی میں  
اُسے اپنے اس کردار پر رنج نہیں ہوا۔ اُس وقت وہاں کھڑے اُس نے زندگی میں پہلی دفعہ خواہش کی تھی  
کمانے والی ذمہ داری کا ش بھی اُس کے کندھوں پر نہ ہوتی، کوئی اور ہوتا اسے نبھانے والا..... کوئی اور.....  
جہانگیر..... اُس کی سوچوں کو جیسے بریک لگا تھا..... جہانگیر کا نام جیسے اُسے ایک بار پھر ہوش میں لے آیا تھا۔  
"انکل! میں مل چکا ہوں اندر فائنس والوں سے، آپ پریشان نہ ہوں..... ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔"  
نے سلطان کو تسلی دی تھی۔ مومنہ باپ سے الگ ہو گئی..... رونے سے زیادہ بڑے کام کرنے تھے اُسے  
رونے کے لیے تو زندگی پڑی تھی۔

"ابا! میں کرتی ہوں کچھ۔" مومنہ نے یدہم آواز میں باپ سے نظریں ملانے بغیر کہا۔ روتے جلتے سلطان  
کو عجیب قرار ملا۔ مومنہ جب بھی یہ جملہ بولتی تھی، کچھ نہ کچھ کر ہی لیتی تھی۔ وہ ثریا کے پاس نہیں گئی صرف اُس  
دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ثریا نے بھی اُس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔  
"کتنا مل ہے؟" مومنہ نے پلٹ کر داد سے پوچھا۔

☆☆☆

"پونے تین لاکھ..... کیسے بنا دیا آپ نے اتنا مل۔" وہ مل کی رقم سن کر کراہ کر رہ گئی تھی۔ وہ اقصیٰ اور دا  
کے ساتھ اس وقت بلز لیے ایڈمن آفس میں تھے اور وہاں موجود ڈاکٹر اُن سے بحث کر رہا تھا۔  
"دیکھیں، یہ پرائیویٹ ہسپتال ہے۔ اس شہر کا سب سے بہترین ہسپتال..... آئی سی یو میں رکھا آپ  
چھٹ کو، ڈائلاکس ہوتا رہا۔ میڈیسنز اور انجکشنز دیے جاتے رہے۔ آپ کو سارا بریک ڈاؤن اس مل میں  
جائے گا۔" وہ بڑے مشینی انداز میں اُنہیں تفصیلات بتا رہا تھا۔  
"میں کیئر کر دوں گی سارا مل..... لیکن ابھی نہیں کر سکتی۔ آپ اُسے لے جانے دیں۔ میں یہ سارا مل  
کر دوں گی۔" مومنہ نے منت سے کہا تھا۔

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن یہ میرا ہسپتال نہیں ہے۔ میں بھی ملازم ہوں یہاں..... مل کیئر ہوئے  
انہم میں لاش آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر نے بڑی نرمی لیکن بڑی صاف گوئی سے اُس سے کہا تھا۔  
جہانگیر کے نام کی کھلاش کا لفظ سن کر مومنہ کچھ دیر کے لیے عجیب سکتے میں آئی تھی۔  
"آپ ہمیں زیادہ نہیں بس تین چار دن کی مہلت دے دیں۔ میں گارنٹی کے طور پر اپنی گاڑی رکھوا چکا ہوں  
ہوں یہاں۔" اس بار داد نے مداخلت کرتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا تھا۔

"دیکھیں آپ میری پوزیشن سمجھیں۔ یہ ہسپتال اس طرح کی وابستگی نہیں رکھتا اور گارنٹی نہیں لیتا۔ آپ لوگ  
کسی سے لون لے لیں ہم اور قائم دے دیتے ہیں آپ کو۔" ڈاکٹر اسے اپنے سامنے رکھی ایک فائل کو بند کرتے  
ہوئے کہا تھا۔  
"اور قائم دینا کے لیکن اُسے لے جانے میں دیں گے؟" اس بار اقصیٰ نے کہا تھا۔ ڈاکٹر چپ رہا۔ مومنہ کو  
کس دم ہوش آ گیا تھا۔ انا ایک کھول کر اس نے وہ لالہ لعل شروع کیا جس میں اُس کی فلم کا ایڈوائس کا چمک



تھا۔ لغافل کیا تھا۔

”یہ..... یہ ایک لاکھ کا چیک ہے..... آپ اس وقت یہ لے لیں..... باقی بھی کل پرسوں تک دے دیتی ہوں۔“ اُس نے لفافے سے وہ چیک نکال کر ڈاکٹر کی میز پر رکھا تھا۔

”یہ چیک آپ کے نام ہے۔ ہسپتال اس کا کیا کرے گا اور ہم لوگ ویسے بھی چیک میں نہیں کیش میں پے منٹ لیتے ہیں۔“ اُس ڈاکٹر نے چیک پیچھے کھسکاتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

”آپ انورڈ نہیں کر سکتے تھے یہ ہسپتال..... آپ کو لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ چند لاکھ تو بہت معمولی رقم ہے۔ یہاں تو اس سے بھی زیادہ رقم کے بلز لوگ ایک بھی سوال کئے بغیر پے کر کے جاتے ہیں۔“ اُس ڈاکٹر نے جیسے اُن کو اُن کی حیثیت کا احساس دلایا تھا۔

”زندگی بچانے کے لیے لائے تھے..... کسی بھی قیمت پر مل جاتی..... وہ آپ نے بجائی ہی نہیں..... مرنے کے لیے تھوڑی لائے تھے۔“ مومنہ کی آواز پہلی بار بھرائی تھی۔ اسے پہلی بار لگا وہ رو دے گی مگر آنسو صرف اُس کی آواز کو ہلا گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں کو چھونے کی کوشش نہیں کی انہوں نے۔

”تم دیکھنا، میں یہ سب میڈیا پر دوں گی۔ سوشل میڈیا پر کمپین چلاؤں گی تمہارے ہسپتال کے خلاف..... تم لوگ گھٹا اور کہینے ہو۔“

اقصی ایک دم آپے سے باہر ہو کر اُس ڈاکٹر اور اُس کے ساتھ بیٹھے فائننس کے لوگوں پر چلائی تھی۔ مومنہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر دبا یا یوں جیسے اُسے روکنا چاہتی ہو۔

”اُس سے کیا ہوگا میڈم..... زیادہ سے زیادہ ہماری بدنامی..... بدنامی سے بزنس تو ختم نہیں ہوتا مل تو پھر بھی ہسپتال والے لیں گے آپ سے..... وہ تو مجھ سے بھی لے لیتے اگر آپ کی جگہ میں ہوتا۔“ اُس ڈاکٹر نے جیسے نرم لفظوں میں اُسے اپنی حیثیت اور اوقات کا بھی احساس ڈھکے چھپے لفظوں میں کر دیا۔

”میں ایکٹریس ہوں..... اپنے کام کو حلال بنانے کے لیے مر رہی ہوں پر آپ کو تو حلال کو بھی حرام بناتے ہوئے کوئی تکلیف، کوئی شرمندگی نہیں ہو رہی۔“

اقصی کا ہاتھ پکڑے اُس نے ڈاکٹر سے کہا تھا۔ اُس آفس سے نکلتے ہوئے زندگی میں پہلی بار مومنہ سلطان کو اپنا پروفیشن اتنا حرام نہیں لگا تھا جتنا ہمیشہ لگتا تھا۔

☆☆☆

پانچ نہیں اُس رات وہ کہاں کہاں پونے تین لاکھ کی رقم اکٹھا کرنے اقصیٰ اور دادو کے ساتھ گئی تھی۔ جہانگیر کے پچھلے کئی سالوں سے ہونے والے علاج نے انہیں پہلے ہی بہت سے لوگوں کا مقروض کر رکھا تھا اور وہ کوشش کے باوجود بھی پرانا قرض ادا نہیں کر پائے تھے اور اب اس اجانک آجانے والے پونے تین لاکھ کی رقم کے ملنے نے جیسے مومنہ سلطان کا سارا دم خم نکال دیا تھا۔ اُس کے پاس کچھ دنوں کا وقت ہوتا تو وہ اس رقم کو اقصیٰ اور دادو کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی طرح پورا کر لیتی۔ مگر اُسے دو دن سے اُس مردہ خانہ میں پڑے ہوئے جہانگیر کو اب گھر لانا تھا۔ اُسے اپنے آخری گھر بھیجنا تھا تا کہ اُس کے ماں باپ کو کچھ سکون مل جاتا۔ مومنہ سلطان کے ہاتھ میں بس اب اتنا ہی سکون دینا چاہتا تھا اُن کو۔

دادو کی پرانے مال مال کی آٹن سلوڈ کی پچھلی نیٹ پر بیٹھی مومنہ سلطان نے شہر کی سڑکوں پر رات کو در بدر پھرتے پانچوں کس کس کو فون کیا تھا..... بڑی بڑی رقموں کے لیے نہیں..... چھوٹی چھوٹی رقموں کے لیے..... تین..... پانچ..... سات..... اُس کا حلقہ احباب اتنی ہی رقم قرض میں دے سکتا تھا۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھی جانے والی ہر رقم اُس کی زندگی کے گلاس کو پانی کے قطرہ کی طرح بھر رہی تھی۔ عزت نفس اور خودداری کو وہ مردہ خانہ کے باہر بیٹھے ہوئے





”ان کی کوئی پارٹی چل رہی ہوگی۔ وہ ایسے ہی ہیں مرضی سے بات کرتے ہیں۔“ داؤد بڑبڑایا تھا۔ ”اور میں نے پہلے ہی کچھ فرخہ لیا ہوا ہے۔ اُن سے اب پتا نہیں اس بار وہ کچھ دیتے بھی نہیں۔“ اقصیٰ خاموش رہی۔ اُس ایڈریس پر پہنچنے ہی مومنہ میکا کی انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر کر چلی گئی تھی۔ ”یہ روکیوں نہیں رہی۔“ داؤد نے دور جاتی مومنہ کو دیکھ کر مضطرب انداز میں اقصیٰ سے کہا تھا۔ ”حوصلہ دکھا رہی ہے۔“ اقصیٰ نے ناک نشو سے رگڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اتنے حوصلے کا کیا کرنا ہے اس نے..... اس سے کہو کہ روئے۔“ داؤد نے جواباً اُس سے کہا تھا۔ وہ دس منٹ بعد دوبارہ نمودار ہوئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُس نے ہاتھ میں پکڑا لٹافہ اقصیٰ کو دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ دس ہزار ہیں..... سیات ہزار جبار بھائی بھی دیں گے۔ اُن کا گھر اسی لین میں ہے۔“ اُس نے ہاتھ سے داؤد کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اقصیٰ نے یک دم اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مومنہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ”تم رو لو مومنہ۔“ وہ اقصیٰ کو چند لمحوں تک دیکھتی رہی پھر اُس نے کہا۔ ”میسے پورے ہو جائیں پھر رو لوں گی۔“ اقصیٰ سے اُس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

”اللہ تاس مارے ان ہسپتال والوں کا..... دیکھنا کیسے کیڑے پڑیں گے انہیں۔“ جھومر نے اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے سلطان سے کہا۔ سلطان رات کے اس پہر اپنی گلی سے پیسے اکٹھے کرنے آیا تھا۔ ”لاکھ کیڑے پڑ جائیں جھومر..... میرا جہانگیر تو نہیں آئے گا۔“ سلطان نے روتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ جھومر نے دوپٹے کے پتو سے بندھے پیسے کھول کر نکالتے ہوئے سلطان کو تسلی دی۔

”بس کر سلطان بھائی! یہ پندرہ سو رکھ لے۔ میں نکلتی ہوں ابھی پھر رات کو..... جو کمائی ہوتی ہے وہ بھی لا کر دیتی ہوں تجھے..... ہسپتال میں ہی آ کے دے جاتی ہوں..... تو اب وہیں رہ۔“ جھومر نے سوسو کے خستہ حال نوٹ اُس کی منٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔ ”تیرا شکریہ کیسے ادا کروں جھومر!“ سلطان نے سسکیاں لیتے ہوئے اُس سے کہا تھا اتنے سالوں میں جھومر اور اُس کے درمیان کبھی شکریہ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ تو تزاخ اور گالم گلوچ میں ہی بات ختم ہوتی تھی۔ وہ اکثر اُس سے میک اپ کرانا اور بغیر پیسے دیے نقص نکالتا چلا جاتا یا سلطان اُس کا مذاق اڑاتا تو وہ گلی میں کھڑا ہو کر اُس کے پورے خاندان کو کوستا، مومنہ باجی کے علاوہ جس کا وہ قین تھا..... اور آج جہانگیر چلا گیا تھا تو جیسے سب کی طرح وہ بھی مرہم رکھنے چلا آیا تھا۔

”چھوڑ سلطان بھائی..... میرا تو جنازہ بھی جائز نہیں..... پر جن کا جائز ہے، اُن کا تو جنازہ ہو..... میں آتی ہوں پھر۔“

وہ کہتے ہوئے اسی طرح منکتا ہوا چلا گیا تھا۔ سلطان کو اُس لمحے جھومر کے سامنے وہ پورا معاشرہ بھڑوا گا جس کا وہ حصہ تھا۔

مومنہ نے ثریا کو چونک کر دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے ایک دم کچھ منگتا رہی تھی۔ مومنہ اور اقصیٰ ابھی کچھ دیر پہلے ہی واپس ہسپتال آئی تھیں اور داؤد پونے تین لاکھ میں سے باقی رہ جانے والے پچاس ہزار کسی سے مانگنے گیا تھا۔ سلطان وہاں نہیں تھا اور وہ اور اقصیٰ برآمدے کی زمین پر بیٹھے اکٹھے ہونے والے سارے لفافوں اور لوٹوں کو ایک آخری بار دوبارہ کن رہی تھیں، یوں جیسے کوئی سلامی کے لفافوں سے نوٹ نکال نکال کر گنتا ہے۔



ثریا اسی طرح اُن سے بے نیاز برآمدے کی دیوار کے ساتھ سرٹکائے گئیں۔ وہ ایک لوری تھی۔ مومنہ اور انھیں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مومنہ اپنی گود میں رکھے ہوئے سارے نوٹ انھیں کی گود میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اماں! کیا گارہی ہیں آپ۔“ ثریا کے پاس بیٹھ کر اُس نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا۔  
ثریا کے بال لٹوں کی شکل میں اُس کی چٹیا سے نکل کر بکھرے ہوئے تھے اور اُس کی آنکھیں سرخ اور سوخ ہوئی تھیں۔ اُس نے مومنہ کو دیکھا۔

”جب چھوٹا تھا تو دوسرے بچے لوری سن کر سوتے تھے، یہ اٹھ جاتا تھا..... شاید اب بھی.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر لوری گانے لگی تھی۔

”ملا لیا لوری..... دودھ کی کٹوری۔“

مومنہ، ثریا کا چہرہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ اُس کے ماں باپ ہمیشہ جہانگیر کے عشق میں جھلا رہے تھے جہانگیر کے سامنے اُن کے لیے مومنہ کچھ بھی نہیں تھی اور مومنہ نے ساری زندگی اس تفریق کو برامانے بغیر سہا۔ جہانگیر چاہے جانے کے قابل تھا وہ شاید نہیں تھی یا وہ یاد رہ جانے والوں میں سے تھا، وہ نہیں تھی۔ وہ دلوں کو مٹھی میں کر لیتا جاتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی..... اگر زندگی جہانگیر سلطان کو موقع دیتی تو وہ لاکھوں کروڑوں دلوں پر ہیر دین کر حکمرانی کر رہا صرف سلطان اور ثریا کا یقین نہیں تھا۔ مومنہ سلطان بھی یہ ماننے والوں میں سے تھی اور اگر سب کچھ ویسا ہوتا تو وہ بڑی خوشی سے جہانگیر کے سائے میں زندگی گزار لیتی..... اُس کے لیے تالیاں بجاتے ہوئے۔ اُس کی کامیابیوں اور فتوحات کو اپنانے ہوئے، اس کی ناموری پر راضی..... مگر یہ سب کچھ زندگی نے ہونے نہیں دیا تھا یا شاید موت نے۔ ثریا کا چہرہ دیکھتے ہوئے، وہ وہ الفاظ ڈھونڈتی رہی جن سے وہ ثریا کو یہ سمجھا سکتی کہ وہ، یہ لوری نہ گائے۔ جہانگیر اب کبھی نہیں اُٹھے گا۔

PakiBooks.Sit

”جھولا جھلاؤں گی“

”جھولا جھلاؤں گی“

”جھولا جھلاؤں گی۔“

”مومنہ۔“ ایک ہی مصرعے کو بار بار گاتی ثریا کو دیکھتے ہوئے مومنہ کو انھیں نے پکارا تھا۔ داد داد آ گیا تھا۔ اور اُس کا چہرہ ہلک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ مومنہ کو دکھاتے ہوئے اُس نے کہا۔  
”پورے ہو گئے میسے..... مجھے لگتا ہے۔“

وہ تینوں زمین پر آگئی پالتی مارے ایک بار پھر اُن پیسوں کو گن رہے تھے جب فجر کی اذان ہونے لگی۔  
”دولا کھستاسی ہزار۔“ داد نے بالآخر آخری نوٹ گنتے ہوئے کہا۔ مومنہ کو لگا وہ جیسے وہ شہزادی تھی جس کے جسم میں گاڑی ہوئی سوئیاں وہ سارے نوٹ نکال رہے تھے اور آخری سوئی اُس آخری رقم سے نکلی تھی۔ وہ اب جہانگیر کو کھلے جاسکتی تھی تاکہ ثریا وہ لوری نہ گائے۔

داد پیسے لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مومنہ برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر چت لیٹ گئی تھی۔ یوں جیسے بہت لمبی ریس میں دوڑنے والا انسانی لائن کو بار بار کرنے کے بعد زمین پر گرنا ہے، وہ بھی جیسے جیسے ریس کوئی اور جیت چکا ہو۔

”مومنہ! تم رولو۔“ انھیں نے اُس کی پٹائی پر ہاتھ رکھا تھا۔

وہ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد بڑبڑائی۔

”اب کس بات پر روتا ہے۔“ انھیں بول نہیں سکی۔

قلب مومن نے یہاں کو اپنے کسی کلائٹ کے ساتھ اپنے بوتیک اسٹوڈیو میں بیٹھ دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کا پرائیڈل ڈسکس کر رہی تھی۔ قلب مومن ہلکتے ہوئے ڈسک پر لگے برائڈ لڑ دیکھنے لگا۔ یہاں اسے دیکھ لیا تھا، لیکن وہ مکمل طور پر اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس کے بوتیک اسٹوڈیو کا وہ حصہ جو آفس کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ گلاس پارٹیشن سے بوتیک کے باقی حصہ سے الگ کیا گیا تھا۔ مومن وہاں ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تھا لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کو کلائٹ کو فارغ کر دینے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ تقریباً دس منٹ وہاں ٹھہرا رہا اور بالآخر جب وہ کلائٹ باہر نکلی تو وہ آفس میں داخل ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے یہاں کو دیکھا، اس نے جواباً بے تاثر چہرے کے ساتھ اس سے کہا۔ ”میں کلائٹ کے ساتھ میٹنگ میں تھی۔“

”میں نے تمہیں انٹرویو نہیں کیا۔“ مومن نے جواباً کہا۔ وہ اب ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ چکا تھا۔ ”ویٹ کرنا چاہیے تھا تمہیں، میں بلالی تب اندر آنا چاہیے تھا۔“ یہاں کا لہجہ ویسے کا دیرپا تھا۔ مومن بے اختیار ہنسا اور میر پر دونوں بازو پھیلا کر، کچھ آگے جھکتے ہوئے بولا۔

”ناراضی ختم کر دو اب۔“

”نہیں، میں کیوں ناراض ہوں گی تم سے اور ہوں گی بھی تو تمہیں کیا پروا؟“ یہاں نے جواباً اسی نزوٹھے انداز میں کہا۔ ”پروا ہے تو یہاں بیٹھا ہوں یہاں! تم نے ضوئی کا میری فلم میں کام کرنا ضد کیوں بنالی ہے اپنی۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ضد؟ خواہش ہے میری۔ تم ضد سمجھ رہے ہو تو ایسا ہی سمجھو۔“ یہاں نے اسی جیسے لہجے میں کہا۔

”تمہارے اور میرے تعلق میں ضوئی نہیں آنا چاہیے۔“ مومن کی حلقی بڑھی۔

”تمہارے اور میرے تعلق میں ضوئی نہیں ہے مومن..... تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم اپنے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے..... تمہاری ”میں“ بہت بڑی ہے..... تمہاری ناک اس سے بھی زیادہ۔“ اس نے بڑی سختی سے مومن کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ سمجھنے آیا تھا۔ وہ رگیدنے لگی تھی۔

”میں ایسا ہی ہوں یہاں..... میں ہمیشہ سے ایسا ہی تھا..... آج ایسا نہیں ہوا۔“ مومن نے شہد کی طرح اس کے زہریلے جملوں کا گھونٹ بھرا تھا۔

”میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔“ اس کے جملے نے مومن کو تکلیف پہنچائی۔

”تم مجھے ہرٹ کر رہی ہو۔“ اس نے یہاں سے کہا۔ وہ جواباً استہزاء سے انداز میں ہنسی۔

”نہیں یہ کام تو تمہارا ہے..... کوئی دوسرا کیسے کر سکتا ہے؟“

”میں تمہیں منانے آیا تھا آریو کرنے نہیں۔“ مومن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ہمت جیسے جواب دے گئی تھی۔

”ضوئی تمہاری فلم میں لیڈ رول کرے گا تو تمہارے اور میرے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا

ورنہ..... اس آل اور (سب ختم)۔“

مومن نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”تمہارے نزدیک ضوئی ہمارے رشتے سے زیادہ اہم ہے؟“

”نہیں، مجھے یہ دیکھنا ہے کہ تمہارا ہے، لیے تمہاری ضد اہم ہے یا میں۔“

وہ اس کے بعد وہاں رکا نہیں تھا۔ وہ لہجہ، وہ انداز، جملے اس نے پہلی بار یہاں کے منہ سے سنے تھے اور اگر قلب مومن کو شک لگا تھا تو یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ کسی دوسرے مرد کے لیے اس سے لڑ رہی تھی۔ اسے چھوڑ دینے پر تیار تھی۔ قلب مومن کے لیے یہ جگ آمیز تھا اور جگ کو برداشت کرنا مومن کی کھٹی میں نہیں تھا۔

☆☆☆



”دادا امی اس مومن بھائی کی شادی کر دیں اب۔“  
 حکمران مہد اعلیٰ کے کمرے میں بیٹھ کر فرس پر کپڑا بچھائے ان کے کپڑے اسٹری کر رہا تھا جب کپڑے اسٹری  
 کرتے کرتے اُس نے ایک دم مہد اعلیٰ سے کہا۔ ”وہ چونک کر مسکرائے۔“  
 ”پٹھے بٹھائے تمہیں اُس کی شادی کا خیال کیسے آ گیا؟“

”بس دادا امی! جب چوبیس کھنٹے پارٹیاں ہوں اور لڑکیاں آئیں تو پھر شادی کا شور نہ ہی دے گا نا کوئی بھی  
 شریف آدمی۔“ حکمران مہد اعلیٰ کی کریم ہاتھ ہوئے بولا اور پھر اچانک اُسے احساس ہوا، مہد اعلیٰ چپ ہو گئے تھے۔  
 اُسے اچانک احساس ہوا، وہ کچھ غلط بات کر گیا تھا۔  
 ”وہیے مومن بھائی ہیں بڑے شریف آدمی۔۔۔۔۔ لیکن لڑکیاں نہیں ناں! ابھی آج کل کی۔“ اُس نے فوراً ہی  
 کچھ مڑ بڑائے ہوئے انداز میں سچ کی۔

”شریوں کو بھی خراب کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔ اب مومن بھائی کو نہ بتائیے گا یہ ساری باتیں۔۔۔۔۔ ان کو پہلے ہی شہ  
 رہتا ہے کہ میں اُن کی باتیں لوگوں کو بتاتا ہوں حالانکہ آپ خود دیکھ لیں، آپ کتنے دنوں سے یہاں ہیں، میں  
 نے کوئی ایک بھی بات بتائی ہے آپ کو مومن بھائی کی۔“  
 حکمران نے بڑے فخریہ انداز میں جیسے اُن سے تصدیق چاہی تھی۔ مہد اعلیٰ منگتے تھے۔  
 ”نہیں، تم نے تو کچھ بھی نہیں بتایا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑائے جیسے بہت پریشان ہوئے تھے۔ حکمران  
 اُن کے تصدیقی جملے بڑے اختیار خوش ہوا۔

”یہی باتیں تو اچھی لگتی ہیں مجھے آپ کی دادا امی۔۔۔۔۔ آپ بڑے سچے آدمی ہیں۔۔۔۔۔ ویسے آپ کو ایک بات  
 بتاؤں۔ مومن بھائی آپ سے ڈرتے بڑا ہیں۔“ اُس نے جیسے کوئی انکشاف کیا۔  
 ”مجھ سے ڈرتا ہے؟“ مہد اعلیٰ حیران ہوئے۔

”وہ تو کبھی بچپن میں بھی مجھ سے نہیں ڈرا۔“ انہیں بتانے لگا۔  
 ”نہیں نہیں سچ میں۔۔۔۔۔ آپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اسی لئے تو ساری ایسی ویسی تصویریں اور مجھے اسٹور  
 میں رکھوا دیے ہیں انہوں نے۔۔۔۔۔ بلکہ فرنگ میں سے اُس چیز کی بوتلیں بھی ہوا دی ہیں انہوں نے۔۔۔۔۔ اور کین  
 بھی۔۔۔۔۔ وہ ”اُس چیز“ کے دادا امی۔۔۔۔۔ آپ سمجھ تو گئے ہوں گے دادا امی۔“

حکمران نے شراب کا نام لیے بغیر اپنے گفتگوں پر معنی خیز انداز میں زور دیتے ہوئے مہد اعلیٰ کے جسم میں سے  
 جیسے جان نکالی تھی۔ قلب مومن بھگ رہا تھا اور وہ بے بس تھے، کس کو پکارتے۔ کس سے کہتے۔۔۔۔۔ قلب مومن  
 کے سامنے بیڑہ سوال جواب کے تو عرصہ ہو گیا تھا، انہیں۔

”تم مومن کے لیے دعا کیا کرو حکمران۔“ مہد اعلیٰ کے لہجہ میں رنجیدگی تھی۔  
 ”کیا دعا؟ سارا کچھ تو ہے ان کے پاس دادا امی۔“ حکمران نے حیرانی سے کہا۔ مہد اعلیٰ چاہتے ہوئے بھی  
 زبان پر وہ دعا نہیں لاسکے جو وہ مومن کے لیے چاہتے تھے۔ قلب مومن کا پردہ کہاں کھولنے والے تھے وہ۔۔۔۔۔  
 کھولتے بھی تو بس ایک ہی نفس کے سامنے کھول سکتے تھے۔

☆☆☆  
 ماسٹر ابراہیم کے ہاتھ جو تے مرمت کرنے والے لوہے کے اُس اسٹینڈر دھرے ایک اپنے پروردہ یعنی نازک  
 اور بے حد تھیں ہل والے جوتے پر اپنے اوزار کے ساتھ مشین انداز میں چل رہے تھے۔ وہ فرس پر بیٹھے تھے اور  
 اُن سے کچھ قاصدے پر ان کی جوتوں کی مرمت کی اُس دکان میں دھرے ایک شیخ پر جینز میں ملبوس ایک نوجوان لڑکا  
 اپنے مہندی رہنے ہاتھوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور بے حد بے چین انداز میں بولتی جا رہی تھی۔ ماسٹر ابراہیم

اُس کی باتیں خاموشی سے سنتے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھے۔

”ہو جائے گا نا ٹھیک.....؟“ جوتے کو کچھ ہو گیا نا تو میری ویڈیو خراب ہو جاتی ہے۔ اب دو دن میں ایسا جوتا کہاں سے ڈھونڈوں گی میں..... کہا بھی تھا کتنی کو کہ میرے سائز کا مسئلہ نہ ہو جائے مگر وہ کہہ رہی تھی نہیں، پرفیکٹ ہے۔ ایسا جوتا لاؤں گی کہ لوگ سنڈریلا کے سینڈلز کو بھول جائیں گے اور اب دیکھیں۔ وہ شاید اسی رفتار سے بولتی جاتی مگر ماسٹر ابراہیم نے اُس کے جوتے کو اُس کے پیروں کے پاس رکھ کر اپنے اوزار سمیٹتے ہوئے کہا۔

”ہو گیا..... آپ دیکھ لیں۔“

لڑکی نے جیسے کچھ بے یقینی سے اُنہیں دیکھا اور پھر جوتے پہن کر وہ کھڑی ہو کر دو قدم چلی اور اُس نے بے اختیار دونوں ہاتھ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اپنے منہ پر رکھے۔

”مائی گڈنیس، یہ تو بالکل فٹ ہو گیا..... آپ نے کیسے کر دیا..... یہ تو اُمی سے آیا ہے..... کوئی ایسے ہاتھ نہیں لگا رہا تھا..... کہ بہت مہنگا ہے۔ ہم ذمہ داری لے کر نہیں کر سکتے۔“ وہ لڑکی اب جوتا اتارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں اس کمپنی میں کام کرتا تھا۔“ ماسٹر ابراہیم نے سر جھکائے مدھم آواز میں کہا۔ وہ اب اُس لڑکی کے پیروں سے اُتارے ہوئے جوتے کو اُس بیک میں ڈال رہا تھا۔ جن میں ڈال کر وہ اُسے لائی تھی۔

”کس کمپنی میں؟“ لڑکی جیسے سمجھ نہیں پائی۔

”جس کمپنی کے یہ سینڈلز ہیں۔ Sergio Rossi۔“ ماسٹر ابراہیم نے بے حد عام سے لہجے میں کہا تھا۔

”اُمی میں؟“ لڑکی کو جیسے کرنٹ لگا تھا سن کر۔

”میلان میں۔“ ماسٹر ابراہیم نے جیسے مزید صبح کی۔

”آئی ڈونٹ بلیواٹ۔“ لڑکی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اٹھارہ سو روپے۔“ ماسٹر ابراہیم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”کس چیز کے؟“ لڑکی نے بے ساختہ کہا۔

”اس کی مرمت کے..... سائز ٹھیک کرنے کے۔“

”پانچ سو دوں گی۔“ اُس لڑکی نے پانچ سو کا نوٹ بیک سے نکال کر ماسٹر ابراہیم کو تھمایا تھا اور وہ ہنس

پڑے تھے۔ کچھ کہے بغیر انہوں نے خاموشی سے پانچ سو کا نوٹ پکڑ لیا اور تب ہی اُس لڑکی کے عقب میں گھڑے عبدالعلی کو انہوں نے دیکھا تھا۔

وہ بے اختیار پانچ سو کا نوٹ چھوڑ کر گھڑے ہوئے تھے۔

”عبدالعلی صاحب۔“ اُن کے منہ سے نکلا تھا۔ اُس لڑکی نے فرش پر گرے پانچ سو کے نوٹ اور اُس ترکش

بوڑھے سے ملنے اُس جوتے مرمت کرنے والے ماسٹر ابراہیم کو دیکھا جو چند لمبے پہلے میلان میں Sergio

Rosio کی کمپنی میں کام کرنے کا دعوہ کر رہا تھا اور جس نے اُس کے لاکھوں مالیت کے اُس جوتے کو واقعی کمال

مہارت سے ٹھیک کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ Sergio Rosio میں کام کر چکا

ہوگا..... دکان سے نکلنے ہوئے اُس نے سوچا تھا، پچھوں گی اُس... جس نے یہاں بھیجا تھا۔ اُسے اپنی اُس

مال دوست کا خیال آیا جس کے توسط سے وہ یہاں آئی تھی۔

☆☆☆

”آپ نے تو اس ہارجر ان لی کر دیا مجھے..... آنے سے پہلے بتا دیں۔“

اپنا حوصلہ کا دروازہ کھول کر عبدالعلی کو اندر لاتے ہوئے ماسٹر ابراہیم نے اُن سے کہا تھا۔ وہ اب اُن کے



ساتھ حویلی کے صحن میں دانہ چلتے ہوئے کبوتروں کے درمیان سے گزر رہے تھے اور وہ کبوتر ڈر کر اڑنے کے بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے ادھر ادھر سرک رہے تھے۔

”میں نے سوچا، اس بار تمہیں اپنے پاس بلانے کے بجائے تمہارے گھر جا کر ملوں تم سے۔“ عبد العلی نے مسکراتے ہوئے حویلی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اب برآمدے میں داخل ہو چکے تھے۔

”تو یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔“ ماسٹر ابراہیم نے ایک کرسی انہیں بیٹھنے کے لیے دیتے ہوئے کہا۔

”میری کُنیا، بیٹھیں آپ۔“

”بڑی مشکل سے ملی تمہاری دکان..... کوئی تمہیں جانتا ہی نہیں۔“ عبد العلی بیٹھتے ہوئے بولے تھے۔

”آپ نے سوچی نہیں کہا ہو گا در نہ فوراً مل جاتا۔“

ماسٹر ابراہیم نے ہنس کر کہا تھا۔

”ہاں یہ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں ماسٹر ابراہیم کہہ کر اٹلی کا حوالہ دیتا رہا۔“ انہوں نے پانی کا وہ گلاس پکڑا جو ماسٹر ابراہیم انہیں دے رہے تھے۔ ماسٹر ابراہیم اُن کی بات پر مسکرائے تھے۔

”میں آپ کو اس لیے بار بار اس حویلی میں لانا چاہتا تھا تا کہ اسے بھی آپ کے قدموں کی سعادت نصیب ہو۔“ ماسٹر ابراہیم نے اُن سے کہا۔ وہ اب برآمدے کی الماری کی ایک دروازہ کھول رہے تھے۔

”میرے آئے بغیر بھی یہ حویلی بے حد برکت اور سعادت والی ہے۔ یہاں مجھ سے بہتر لوگ رہتے ہیں..... میرے کام سے بڑا کام ہو رہا ہے۔“ عبد العلی نے پانی کا ایک گھونٹ پیا پھر کہا۔

”گناہ گار نہ کریں عبد العلی صاحب! آپ سے بہتر کیا ہوں گے ہم..... ہاں کام شاید اللہ ہماری اوقات سے بڑھ کر ہم سے کروا رہا ہے مگر یہ بھی میری بیوی کا کمال تھا۔ میرا نہیں..... اُسی پر عنایت تھی اللہ کی..... میں تو صرف وسیلہ بنا۔“ ماسٹر ابراہیم عجیب سی کیفیت میں کہہ رہے تھے اور عبد العلی کی آنکھوں میں نمی جھلکی تھی۔

”یہ دیکھیں آپ کا تختہ۔“ عبد العلی کے سامنے یک دم وہ کیس لے کر آئے جو انہوں نے اُس الماری سے نکالا تھا۔ عبد العلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ وہ اُس کیس کو کھول کر اُس میں اپنے ہاتھ سے خطاطی کیا ہوا وہ قرآن پاک دیکھ رہے تھے جو انہوں نے کئی دہائیوں پہلے ماسٹر ابراہیم کو دیا تھا۔

”ماشاء اللہ۔ تم نے خوب سنبھال رکھا ہے۔“ انہوں نے اُس کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔

”سنبھالتی تو اس کو میری بیوی تھی، وہ تلاوت کیا کرتی تھی روز اس سے۔ اب اُس کے جانے کے بعد یہ ذمہ داری میں نے سنبھال لی اور ایک بچی آئی ہے میرے پاس مومنہ۔ وہ تلاوت کرتی ہے اس سے..... جو چھوٹی مونی مرمت سے اُسی نے کی ہے اس کی جلد پر.....“

وہ عبد العلی کو چمڑے کی جلد پر کیے ہوئے وہ خطاطی کے نقش و نگار دکھا رہے تھے جو مومنہ سلطان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے۔ عبد العلی کو پتا نہیں کیا یا د آیا تھا۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو خشک کیے تھے۔

”آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اس نسخے نے زندگی بدل دی تھی میری..... کیسے سنبھال کر نہ رکھتا اسے۔“ ماسٹر ابراہیم اب اُس قرآن پاک کو اُن کے ہاتھوں سے واپس لیتے ہوئے اُسے دیکھ کر جیسے خود ماضی میں جا رہے تھے۔

”پہلی بار جب کسی نے یہ نسخہ مجھے دے کر کہا تھا کہ ہاتھ سے لکھا ہوا ہے تو میں نے سوچا تھا۔ ماسٹر ابراہیم تو نے ریمپ پر چلتی عورتوں کے جوتے ہٹا کر ساری عمر گنوا دی..... ملا کُنیا..... پیسہ..... بس..... اور ایک یہ شخص ہے جس نے زندگی کے سال لگا کر جنت کمائی..... بس دماغ ہی اُلٹ گیا میرا..... آپ کو یاد ہے کیسے ڈھونڈتا ہوا پہنچا تھا میں آپ کو ترکی میں۔“ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ اپنی بھرا آئی ہوئی آواز کو ٹھیک کرنے کے لیے۔

”ہاں اور میرے لیے لائے تھے..... اٹلی کے جوتے۔ پیرس کے پرفومز اور میلان کے سوٹ۔“ عبد العلی



جیسے کچھ یاد کر کے نصے تھی، میں تو وہی لاسکتا تھا۔ حیران ہو گیا تھا اُس وقت آپ کو اردو بولتے دیکھ کر۔  
 ”جو میری اوقات تھی، میں تو وہی لاسکتا تھا۔“ وہ دلوں جیسے ماضی میں پہنچے ہوئے تھے۔  
 ”اپنے پوتے کے لیے سکھ رہا تھا ب۔“ وہ دلوں جیسے ماضی میں پہنچے ہوئے تھے۔  
 ”قلب مومن کیسا ہے؟“ ماسٹر ابراہیم نے یک دم پوچھا۔ عبد العلی نے ایک نھر ماسٹر ابراہیم کو دیکھا پھر  
 جیسے کوئی دُخداں کی آنکھوں میں آئی تھی۔  
 ”جیسے کبھی تم تھے۔“ اُن کی آواز میں عجیب ندامت تھی۔ ماسٹر ابراہیم بے اختیار نصے۔  
 ”یعنی منہ حار میں ہے..... نکل آئے گا باہر۔“

”عبد العلی بڑا گناہ گار انسان ہے ماسٹر ابراہیم..... یہ آزمائشیں اسی لیے آتی ہیں مجھ پر..... اللہ کا نام لکھتے ہوئے  
 کوئی کوتاہی، کوئی بے ادبی ہوگئی ہوگی مجھ سے۔“ اُن کے گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ ماسٹر ابراہیم نے بے قرار ہو کر کہا۔  
 ”آپ ایسا نہ کہیں عبد العلی صاحب..... سارے راستے ہیں..... ہر راستے سے گزرنا ہوتا ہے انسان  
 نے..... صرف سیدھے راستے سے چل کر کیسے پہنچے گا رب تک؟“ وہ اُنہیں تسلی دے رہے تھے۔  
 ”میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اب..... کام کرتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں میرے..... یہ کام میرے ساتھ  
 ختم ہو جائے گا..... وہ خاندان جو اتنی تسلیوں سے مسجد قرطبہ اور الحرام میں خطاطی کرتے کرتے ترکی کی مسجدوں اور  
 محلوں میں خطاطی کرتا آیا ہے، وہ میرے بعد محقق خطاطوں کا خاندان نہیں کہلائے گا..... میرے خاندان میں کوئی  
 اللہ کا نام لکھنے والا نہیں رہے گا۔ یہ غم بہت بڑا ہے میرے لیے..... طے کی موت سے بھی بڑا.....“  
 ماسٹر ابراہیم نے اُن کا کندھا تھمکتے ہوئے اُنہیں تسلی دی۔  
 ”چائے بنانا ہوں آپ کے لیے لیکن آپ روئیں نہیں..... استاد کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں  
 ہوتے.....“

عبد العلی نے رومال سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔  
 ”بس دل بھر آیا۔“

”وہ کہیں نہیں جاتا..... ادھر ہی آئے گا..... میرے ماں باپ بھی بڑے پریشان ہوئے تھے۔ سیدوں کا بیٹا  
 جو تے بنانے لگ گیا، وہ بھی عورتوں کے فیشن شو..... ریپ..... وہ کیا سرکل تھا جس میں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ نہ خاندان کی  
 پروا تھی، نہ دین کی..... بس دُنیا کا ہی ہو کر رہ گیا تھا اور دیکھ لیں۔ اللہ نے کہاں سے بھیج کر کہاں لا بٹھایا ہے مجھے.....  
 میلان، پیرس، نیویارک..... کس کی ٹائٹ لائف روک سکی ہے مجھے۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔  
 ”بس ایک وقت ہوتا ہے..... اور وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا..... آپ دُعا کریں۔ اللہ قلب مومن کا وہ  
 وقت پہلے لے آئے۔ آتا تو ادھر ہی ہے اُس نے۔“ وہ اُنہیں تسلی دیتے ہوئے گئے تھے اور عبد العلی اُن کا چہرہ  
 دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

سفید چادر پر اپنے ہاتھ سے مرنے والی مٹلیوں کو وہ کسی میکانیکی انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اپنے ایک کھنکھنے کو  
 سُجود کے اور دوسرے نہا پنی شہزادی نکائے وہ ایک بازو اُسی کھنکھنے کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ اُس کے گھر کے چھوٹے  
 سے کھن میں کچھ سفید چادر کے گرد عورتیں بیٹھی ہوئیں کب شب میں معروف مٹلیاں پہنچتی جا رہی تھیں۔ وہ  
 آیت کریمہ کا آخری بعد تھا اور اُس کے بعد ختم دلوایا جاتا اور پھر کھانا بننا شروع ہوتا۔ آج چائیکر کا سوئم تھا۔  
 سفید چادر کے درمیان مٹلیوں کا ڈھیر غائب ہوتے ہی یک دم چہل چل شروع ہوئی تھی۔ محلے سے اب  
 انہی عورتوں کے بچے بھی وہیں آنا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کے برابر بیٹھی انہی نے چادر پر پڑے فون کی طرف



اُس کی توجہ مبذول کروائی جو بار بار تھر تھرا رہا تھا اُس پر کاسٹنگ ایجنٹ کا نام چمک رہا تھا۔ مومنہ نے فون کو نہیں چھوا۔ آنکھیں بند کر لیں۔  
 ”اندر عورتوں کو بھی بھیج دو کھانا..... ارے شرفو! پانی کے دو جگ تو پکڑ..... اب وہ بھی کیا جھومر ہی لائے گا۔“ باہر گلی میں جھومر بلند آواز میں ختم کے بعد بول رہی تھی۔

جھومر باہر گلی سے رات میں چاول ڈالے پھرتی سے بار بار اندر باہر آ جا رہا تھا۔ سفید چادر اب چاولوں کی پلیٹوں سے باہر گرنے والے دانوں سے بھر رہی تھی..... اُس میں بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ کچھ چھوٹے بچوں کے مٹی سے بھرے پیروں کے نشان بھی نظر آرہے تھے اور جگہ جگہ گلاسوں سے جھلکنے والا پانی بھی۔ مومنہ سلطان کا گھر اس وقت شور سے گونج رہا تھا۔ رات میں بریانی کے اندر پڑی بوٹیوں کو چھیننے کے لیے ایک کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ صرف مومنہ سلطان اور اقصیٰ تھیں جو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی تھیں..... اور ثریا جو چادر کے دوسرے کنارے پر کچھ عورتوں کے بیچ بیٹھی تھی۔

”تو بھی کھانا کھالے جھومر۔“ کسی نے گزرتے ہوئے جھومر سے کہا تھا۔  
 ”جھومر شادی والے گھر سے کھاتی ہے، ماتم والے گھر سے نہیں..... بے شرم ہے جھومر، بے حس نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر اُسی طرح گزر گئی تھی۔  
 ”لو نخر ادیکھو تیرے کا۔“ کسی اور نے تیرہ کیا تھا اور عورتوں نے چاول کے نوالے منہ میں ڈالتے ہوئے

قتبہ لگایا۔  
 آدھ گھنٹے بعد وہاں کوئی نہیں رہ گیا۔ بس وہی تین لوگ اُس چادر پر بیٹھے ہوئے تھے اُسی طرح گم صم اور سفید چادر جواب پوری طرح داغ دار اور برتنوں، ہڈیوں اور چاولوں سے اتنی ہوتی تھی۔  
 مومنہ نے اقصیٰ کے ساتھ مل کر وہ چادر اٹھائی پھر حن کی صفائی کی۔ سلطان اب بھی کہیں باہر تھا۔ ثریا اندر کمرے میں۔  
 ”کل سے شوٹ ہے میری..... دو تین دن نہیں آ پاؤں گی پھر چکر لگاؤں گی۔“ اقصیٰ نے داؤد کے آنے پر مومنہ سے کہا۔

”تم نے پہلے بھی بہت وقت دیا اب بھی.....“  
 اقصیٰ نے اُس کی بات کاٹی۔ ”اب شکریہ ادا مت کرنا..... یہ وقت نہیں ہے شکریہ کا۔“  
 ”نہیں، شکریہ ادا نہیں کروں گی..... کروں بھی تو کس کس چیز کے لیے کروں۔“ مومنہ بڑبڑاتی تھی۔ اقصیٰ نے بات بدلی دی۔

”میں نکلتی ہوں پھر۔“  
 وہ اُس سے گلے ملی اور پھر باہر نکل گئی۔ جھومر کھلے دروازے سے اُسی وقت اندر آیا تھا اور اُس نے مومنہ کو کرسی اٹھانے سے روکا۔  
 ”چوڑ دیں باجی! جھومر اٹھاتی ہے..... آپ کا کام نہیں ہے۔“ اُس نے بھرتی سے اُس کے ہاتھ سے

کرسی پکڑی۔  
 ”بڑی مشکل میں کام آئے ہمارے..... کھانا لانا تمہاری ذمہ داری نہیں تھی جھومر۔“ مومنہ نے اُس سے کہا۔  
 ”مجھے شرمندہ نہ کریں باجی..... مجھے بس ایک ٹکڑی کھانا لانا ہے۔“  
 ”کیا؟“ مومنہ نے پوچھا۔ جھومر نے کچھ نادم انداز میں سر جھکا کر نظر ملائے بغیر کہا۔  
 ”حرام کے پیسوں سے لائی تھی۔ قبول ہو جائے گی نا۔“ مومنہ اُس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی پھر اُس نے مدھم

آواز میں کہلا۔

”ہاں جیسے جیسے۔۔۔“ جیسے جیسے کسی اٹھا کر مزید کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گیا۔

سوٹ میں ڈکے بغیر جہانگیر کے کمرے میں آئی۔ زیادہاں نہیں تھی۔ جہانگیر کا کمرہ ویسا ہی تھا، اُس کا بستر ویسا ہی سلوٹ زد تھا۔ بستر کے سر ہانے پر ہی ہوئی دوائیوں کا ڈھیر بھی وہیں کا وہیں تھا۔ اُس کے سارے دیواروں پر فرمہ تصاویر، اخبار کی تراشے۔ سب کچھ وہیں کا وہیں تھا۔ صرف وہ نہیں تھا۔ وہ سیدھا اُس کے بستر پر تھی اور چت لیٹ گئی۔ اُس کی چادر اُس نے سر پر تان لی تھی۔ کسی نے اُس کی چادر کھینچ کر کہلا۔

”آپا۔۔۔ آپا۔۔۔“

وہ جھجھکا کر بولی۔

”کیا ہے تمہیں، سونے بھی نہیں دیتے۔“

”میرے بستر پر کیوں سو رہی ہو؟“ وہ غصا ہوا تھا۔

”سو رہی ہوں، بس اور اب میرا دماغ مت کھاؤ۔۔۔ گھٹے بعد آنا۔۔۔ بازار چلیں گے۔“

”جو چیز تمہارے پاس ہے، میں نے وہ کیسے کھاؤں گا میں، البتہ میرے پاس ہے دماغ۔۔۔ جواب اماں، بابا

اور تم نے جانت لیا ہے۔“ جہانگیر نے جواب دیا کہ تھا۔

”جہانگیر! اب اگر میں اُنھی تو سیدھا چٹل ہروں گی تمہیں۔“

مومن نے چادر اُسی طرح تانے اُس سے کہا تھا۔

”چٹل تو میں پہلے ہی پھینک آیا ہوں۔۔۔ اتنا بے وقوف تو نہیں کہ چٹل تمہارے پاس ہو تو میں پاس آؤں اور

ایسی باتیں کروں۔“ مومن تب تک غنودگی میں جا چکی تھی۔ کسی نے اُس کی چادر کو زور سے کھینچا۔ وہ ہڑبڑا کر

اُنھی۔ وہ ڈریا تھی جو اُس کی چادر کھینچ رہی تھی۔

”کیا ہوا اماں؟“ مومن نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ایسے مت لیٹ چادر لے کر۔“ ثریا نے اتنے دنوں میں پہلی بار جہانگیر سے ہٹ کر کوئی جملہ کہا تھا اُس

سے اور پھر ز کے بغیر چلی گئی تھی۔ مومن اُس خواب سے باہر آگئی تھی جس میں جہانگیر بھی اُس کے ساتھ تھا۔ فون

پھر قہر قرآن لگا تھا اور مومن سلطان اُس دنیا سے بھاگنا چاہتی تھی جو اُس فون کے ذریعے اُس تک آنا چاہتی تھی۔

کسی آنکھوں کی طرح اُس کو اپنے شکبے میں لیرنا چاہتی تھی۔

ہم ہم ہم

قلب مومن کو نیند میں کسی آواز نے جگا دیا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں کھولے وہ نیم تاریکی میں آواز کے ماخذ کو

بھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا اور اُس کے کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور اُس خاموشی میں ہلکے ہلکے

دقے سے جیسے کوئی سسکی اُبھرتی پھر خاموشی چھا جاتی۔ غنودگی کے عالم میں وہ اُن سسکیوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا

اور پھر یک دم وہ پہچان گیا اور پہچاننے کے ساتھ ہی وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھا تھا۔ وہ دادا کی آواز تھی۔

کبل پھینکتے ہوئے بستر سے نکل کر ننگے پاؤں وہ اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ تقریباً بھاگتے ہوئے اُس نے

دنگ دیے بغیر دادا کے کمرے کا دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں صرف ایک بیڈ سائیز

نیمبل لب آں تھا اور اس زور زدگی میں عبدالعلی کمرے کے فرش پر بچے مصلے پر سر بسجود ہنگیوں سے رو رہے تھے۔

قلب مومن کا خیال تھا۔ اُن کی طبیعت خراب تھی۔ مگر وہ ٹھیک تھے۔ صرف رو رہے تھے۔۔۔۔۔ ہا آواز، ہنگیوں سے

دیوار پر لٹکے کلاک پر قلب مومن نے پہلی بار دقت دیکھا۔ وہاں پر تین بچے کرہنتیس منٹ ہو رہے تھے۔ وہ



یقیناً تہجد پڑھنے کے لیے جاگے تھے اور اب تہجد پڑھنے کے دوران کسی بات پر روئے تھے۔ لہجے بھر کے لیے مومن کو خیال آیا وہ اسی خاموشی سے وہاں سے چلا جائے۔ وہ عبدالعلی اور اُن کے رب کا معاملہ تھا۔ وہ اس رازداری میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتا۔ اُس نے دادا کی زبان پر اپنا نام سنا تھا۔ قلب مومن کو لگا اُس نے غلط سنا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ انہیں دیکھتا رہا۔ وہ دوبارہ اُسی کا نام لے رہے تھے کچھ کہہ رہے تھے اور جو کچھ کہہ رہے تھے۔ قلب مومن نے سن لیا تھا۔

”اے اللہ! میرے مومن کو سیدھا راستہ دکھا۔ اُسے ہدایت دے۔“ وہ روتے ہوئے بار بار یہ جملہ بنا کر رہے تھے۔ قلب مومن دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے پہلے پانی ہوا تھا پھر آگ..... دادا پر ایسا احساسے سالوں بعد آیا تھا۔ وہ اللہ سے اُس کی شکایت کر رہے تھے، دُعا نہیں..... اُن کو کیا حق تھا یہ کرنے کا..... وہ ہیں کھڑے حد تک سے انہیں دیکھتا رہا..... بے حد غصے سے..... پھر وہ پلٹ کر دیوار کے ساتھ پڑے اُس صوف پر بیٹھ گیا تھا جو دادا کی پشت پر تھا۔

”میرے مومن کو صراطِ مستقیم پر چلا..... اُن لوگوں کے راستے پر جن سے تو راضی ہو انہ کہ اُن لوگوں کے راستے پر جن پر تیرا عذاب نازل ہوا۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

زمین پر سجدے میں اُن کا وجود لرز رہا تھا اور قلب مومن کا سینہ جیسے اُن کے الفاظ نے چیر دیا تھا۔ اُس کی انا پر کاری ضرب لگی تھی۔ دادا کو یہ حق نہیں تھا۔ وہ اُسے رات کے اس پہر اللہ کی عدالت میں کھڑا کر دیتے۔ اُن کے سجدے میں گڑگڑاتے وجود کو دیکھ کر صوف پر ٹائلیں پھیلانے بیٹھے قلب مومن کو سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی..... شراب کی..... یا کسی ڈرنک کی جو چند لمحوں کے اندر اُسے اس احساس سے مبرا کر دیتی جس کا شکار وہ اس وقت ہو رہا تھا۔

عبدالعلی بڑی دیر گڑگڑاتے رہے تھے اور پھر اُنھہ کر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے اُس وقت کمرے میں قلب مومن کی موجودگی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دعا کر رہے تھے اور جب انہوں نے دعا ختم کی تو وہ قلب مومن کی بھاری آواز سے جیسے ہڑبڑا کر چوٹے گئے تھے۔

”دادا! آپ کے نزدیک سیدھا راستہ ہے کیا، جس پر میں نہیں ہوں؟“  
اس کا لہجہ ٹھنڈا، آواز سنجیدہ تھی۔ عبدالعلی کچھ دیر وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے پھر وہ اُنھہ کر کھڑے ہو گئے اور جب انہوں نے قلب مومن کو پہلی بار دیکھا۔ وہ اب صوف پر ٹائنگ پر ٹائنگ رکھے بیٹھا تھا اور اُس نے اُن کے کھڑا ہونے پر صوف کے ساتھ سائیڈ ٹیبل لیپ کو اُن کر دیا تھا۔ کمرے کی روشنی میں ایک دم اضافہ ہوا۔ عبدالعلی نے اُس روشنی میں قلب مومن کا چہرہ دیکھا۔ وہ مومن نہیں ملے تھا اور اُن سے کہہ رہا تھا۔  
”بابا..... آپ کے نزدیک سیدھا راستہ ہے کیا؟“ عبدالعلی بے اختیار آگے بڑھے تھے اور انہوں نے کسی معمولی حیرت زدہ انداز میں اُس کا چہرہ چھوتے ہوئے کہا۔

”نہ۔“ مومن نے حیرانی سے اپنے چہرے کو چھوا۔ اُن کا ہاتھ اور اُس کی انگلیاں دیکھیں اور پھر اُس نے عبدالعلی سے کہا۔

”دادا! میں قلب مومن ہوں۔“ عبدالعلی ایک دم ہڑبڑائے یوں جیسے کسی طلسم سے باہر آئے تھے۔  
”کیا ہوتا ہے سیدھا راستہ؟“ مومن نے دوبارہ اُن سے پوچھا تھا۔ وہ اُسے دیکھتے رہے پھر دم آواز میں بولے۔

”فلاح کا راستہ۔“

قلب مومن ایک دم اُنھہ کر کھڑا ہوا۔ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اُس نے پوچھا۔



”کیا ہوتی ہے فلاح؟ کامیابی نا؟ میں آپ کو دکھانا ہوں۔ کیا ہوتی ہے فلاح..... کیا ہوتی ہے کامیابی۔“  
اُس نے ایک دم اُن کا ہاتھ پکڑا اور انہیں ساتھ لیے لاؤنچ میں آگیا۔

دو بار رنگی اپنی ٹرائیوں اور ایوارڈز سے بھرے ریکس کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے دادا سے کہا۔ ”یہ ہے فلاح۔“ پھر وہ سینئر ٹیل پر بڑے اُن میگزینز اور نیوز سپرز کو باری باری انہیں دکھاتے ہوئے پھینکنے لگا۔ ”یہ ہے فلاح دادا۔“ آخری میگزین ٹیل پر واپس پھینکتے ہوئے اُس نے دادا سے کہا۔

”یہ گھر دیکھ رہے ہیں..... گلاس چنٹ ہاؤس..... شہر کا مہنگا ترین علاقہ ہے یہ..... چند سالوں میں بنایا ہے میں نے..... چند سالوں میں..... یہ پورا ملک مجھے جانتا اور پہچانتا ہے..... ایکٹرز، ایکٹریز میرے ساتھ کام کرنے کے لیے منتیں کرتی ہیں..... براڈ میز میرے ایک اشارے پر آنکلیں بند کر کے میرے پرائیکٹس پر پیسہ پھینک دیتے ہیں..... یہ فلاح ہے..... یہ سیدھا راستہ ہے۔“

وہ دیوار پر لگے سپر اسٹارز کے ساتھ فریم تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ یوں جیسے اُس پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اور دادا وہاں کھڑے یوں اُسے دیکھ رہے تھے جیسے سرکس میں مداری اُس سدھائے ہوئے جانور کو دیکھ رہا ہو جو یک دم اُٹھنے سے اُکھڑ گیا ہو۔

”جو تم کر رہے ہو..... وہ بے حیائی ہے..... بے حیائی میں سب ملتا ہے..... سب..... ایسے ہی گھر..... وہی گاڑیاں جو تم چلاتے ہو۔“ وہ مدھم آواز میں کوڑے برسا رہے تھے۔ ٹھنڈی، میٹھی آواز قلب مومن کے نظریہ کامیابی کے پرچے اُڑا رہی تھی۔

”وہ براڈ میز جو تم پر پیسہ لگا رہے ہیں۔ وہ تم پر پیسہ نہیں لگا رہے۔ اُس بے حیائی پر لگا رہے ہیں جسے تم پر دموٹ کرتے ہو..... تم جسم دکھاتے ہو اور جسم کی پرستش کرواتے ہو..... دُنیا تمہارا طواف کیوں نہ کرے مومن..... کیوں نہ سر پر بٹھائے تمہیں۔“

قلب مومن کا چہرہ کس رنگ کا ہوا تھا وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا..... سرخ..... زرد..... سفید..... وہ جو بھی رنگت تھی۔ نارمل رنگت نہیں رہی تھی۔

”آپ بہت زیادتی کر رہے ہیں دادا..... میرے کام کو حقیر اور چھوٹا کہہ کر..... آپ دراصل مجھ سے حد کرتے ہیں..... آپ نے آخر کیا کمایا کیلی کرانی کو اپنی زندگی کے ستر سال دے کر..... میں آپ سے آدمی عمر کا بھی نہیں ہوں مگر میری کامیابی کا اسکیل دیکھیں۔ دُنیا کی ہر آسائش ہے میرے پاس..... ناموری ہے..... لاکھوں کروڑوں لوگ فہن ہیں میرے۔ جان قربان کرنے والے دوست ہیں..... آپ کے پاس کیا ہے؟“

وہ بدتمیزی کی حد تک صاف گوئی پر اُتر ا ہوا تھا۔ وہ اپنا رخ اور رنگ دکھا رہا تھا عبد العلی کو جو اس سے پہلے صرف دنیائے دیکھا تھا۔

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم یہی سننا چاہتے ہو نا مجھ سے؟ میرے پاس تمہاری طرح کریڈٹ کارڈز سے بھرا ہوا والٹ نہیں ہے۔ یہ اسمارٹ فون بھی نہیں ہے جو تمہارے پاس ہے۔ دُنیاوی اٹاٹے صفر ہیں..... کروڑوں لوگوں کی چاہت بھی نہیں ہے میرے پاس..... نہ مجھے تمہاری دُنیا کے نامور لوگ جانتے ہیں مگر قلب مومن! مجھے اللہ جانتا اور پہچانتا ہے..... کیا تمہیں جانتا ہے اللہ۔“ قلب مومن کو بت بنا دیا تھا انہوں نے آگ کے گولے سے..... وہ سارے گت کھڑا اُن کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

”یہ میرا ایمان ہے۔“ انہوں نے جوابا کہا۔  
”سولہ سولہ کہنے اللہ کا نام لکھوں اور یہ خوش گمانی بھی نہ رکھوں کہ وہ مجھے پہچانتا ہے..... تم کو غرور لگتا ہے،



مرور ہی تھی۔ "انہوں نے چپے اے ٹیگ کر لے لے چپے کیا تھا۔

"میں آپ سے بات نہیں کر سکتا۔ آپ واپس چلے جائیں۔ میں اپنی زندگی، اپنی امانت آپ کے ہوش میں رکھی آپ کی امانت میں نہیں آؤں گا۔" وہ بڑی ٹھکی سے کہتے ہوئے لڑنے لگے۔ "اٹھ گیا تھا۔"

عہد اٹھل کھڑے رہے تھے۔ انہیں ملے پاؤں آیا تھا۔ اس نے بھی ایک ہمارا چپے ہی ضد کی تھی ان سے۔

ایک ہی ہمارا اور ایسے ہی پلٹ کر گیا تھا پھر وہ ہمارا نہیں آیا تھا۔

برآمدے میں بڑا سلطان کا دہشتی ہاکس زندگی میں پہلی بار گرد آلود دیکھا تھا مومن نے۔ اس نے "وہ بچے کے لیے اس مٹی کو پھینک دینے کی کوشش کی پھر اُسے اٹھا کر اندر کرے میں لے آئی۔ سلطان اپنے بستر میں منہ سر پٹے پر تھا۔

"ابا..... ابا....." اُس کے پاس کھڑے ہو کر دہشتی ہاکس ہاتھ میں لیے مومن نے اُسے پکارا تھا۔ سلطان نے چادر ہٹا کر اُسے دیکھا۔ اُس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال بے تکلم۔ آنکھیں سرخ۔ وہ مٹی جو اُس دہشتی ہاکس ہ پڑی ہوئی تھی، مومن کو اپنے ہاکس کے چہرے پر بھی دکھی..... وہ دونوں میں بوڑھا ہوا تھا۔

"آپ کا دہشتی ہاکس لائی ہوں۔" اُس نے لہجہ جتنی الامکان نادرل رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب گھر کے ہائی

دونوں وجودوں کو جیسے فرسٹ اینڈ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلطان نے اُس کے ہاتھ سے دہشتی ہاکس چپ چاپ لے لیا۔

"مٹی پڑی ہوئی تھی ابا۔" مومن نے جیسے اُس سے باتیں کرنے کی کوشش کی۔

"مٹی تو پتا نہیں کس کس چیز پر پڑ گئی ہے۔" وہ بڑبڑایا تھا اور اُس کی بڑبڑاہٹ نے مومن کو جب کرادیا۔

"اتنے دین ہو گئے، آپ نے حسن جہاں کی بات نہیں کی۔" اُس کو یک دم وہ موضوع یاد آیا جس پر وہ ہاکس سے بات کر سکتی تھی۔

"حسن جہاں۔" وہ بڑبڑایا۔

"حسن جہاں بھی تو مر گئی تھی۔" وہ یک دم کہہ کر رونے لگا، مومن کی ساری کوششوں پر پانی پھیرنے ہوئے۔ وہ وہاں رُک نہیں پانی۔ باپ کو اس طرح روتے دیکھنا بڑا مشکل کام تھا۔

باہر برآمدے میں لڑیا اپنے کندھے کو ہاتھ سے دباتی، جھکی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

"کندھے کو کیا ہوا اماں؟" مومن کو تشویش ہوئی۔

"دکھ رہا ہے۔" لڑیا نے کہا۔

"میں دباؤوں، ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں؟" مومن نے اُس کے کندھے کو ہلکا سا دباتے ہوئے کہا۔

"نہیں، خود ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا تو کچھ اور دیکھنا شروع ہو جائے گا۔ کس کس چیز کو دہشتی پھر دوں۔۔۔۔۔" اُس نے عجیب سی بے زاری سے کہا پھر اُسی سانس میں اُس سے پھر مخاطب ہوئی۔

"میں سوچ رہی تھی تم امریکہ نہ جاؤ۔" اُس کا اشارہ فلم کی طرف تھا۔

"کیوں اماں؟" اُس نے پوچھا۔

"بس دل گھبراتا ہے۔"

"ایک مہینے کی تو بات ہے۔" مومن نے تسلی دی۔ "فلم رہنے دیتیں..... اب تو ضرورت بھی نہیں۔"

دال برہنی تو فی وی سے بھی چل جاتی۔ "اُس نے مدھم آواز میں کہا۔

"قرض ہے سر پر اماں۔" مومن نے جیسے اُسے یاد دلایا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ پتا نہیں..... کوئی کام ڈھونڈ لی ہوں میں..... جہاں تکیر کے ابا سے کہتی ہوں میں۔" اُس

نے گڑبڑائے ہوئے انداز میں کہا اور پھر یک دم چپ ہو کر اندر سے سلطان کے رونے کی آواز سنی۔  
 ”اُن کو کیا ہوا؟“ وہ سہرے میں ہوئی۔

”ایک ہی تو صبر ہے اماں۔“ مومنہ نے مدہم آواز میں کہا۔  
 شہزادے نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر ہانی اُس کی آنکھوں میں اُلٹا۔ وہ بچے سے چہرہ ادا سمجھتے ہوئے اُس نے کہا۔  
 ”میں دیکھوں ذرا۔“ وہ کہہ کر اندر چلی گئی تھی۔ مومنہ وہیں کھڑی رہی۔  
 ”پانچویں میں اتنی بے حس کیسے ہو گئی ہوں۔ میرے جسم کے آنسو بھی اماں اور اماں ہی بہائیں گے۔“ ہمارے صحن میں پڑے اُس کے فون نے جیسے اُس کو چوکایا۔

”یار افون تو اینڈ کر لو اُس ایجنٹ کا..... داؤد کو پریشان کرنا شروع کر دیا ہے اُس نے کال کر کے۔“ فون پر اُٹھی تھی اور اُس نے اُس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔  
 ”ہاں بس لے رہی ہوں کال۔“ اُس نے اُٹھی کو ٹالا۔  
 ”پاسپورٹ چاہیے انہیں تمہارا فوراً..... ویزہ اپلائی کرنا ہے۔“ اُٹھی نے اُس سے کہا۔  
 ”وہ بنانا ہے ابھی۔“ مومنہ نے جوابا کہا۔

”کل چلو میرے ساتھ یہ کام تو پختہ ہوتے ہیں۔“ اُٹھی نے حل پیش کیا پھر یک دم کہا۔ ”تم فلم چھوڑنے کا تو نہیں سوچ رہی ہو؟“  
 ”یہ آپشن نہیں ہے میرے پاس، چاہوں بھی تو..... ایڈوانس کی رقم استعمال ہو گئی ہے۔“ مومنہ نے ہلکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ایسے مت کہو بار..... لائف ٹائم ایر چونیٹی (موقع) ہے..... تمہیں یاد ہے کتنی خواہش تھی تمہاری کہ یہ فلم تمہیں مل جائے۔“ اُٹھی نے جیسے اُسے جو کس دلانے کی کوشش کی۔  
 ”جہانگیر وجہ تھی“ تب۔“ اُس نے مدہم آواز میں کہا۔  
 ”تمہیں کیا ہو گیا ہے مومنہ؟“ اُٹھی نے تشویش سے کہا تھا۔

”میں سو نہیں پا رہی..... دل چاہتا ہے کئی دن کے لیے سو جاؤں مگر جب سونے کے لیے لیٹی ہوں تو اُن سب کے چہرے آنکھوں کے سامنے آنے شروع ہو جاتے ہیں جن سے قرض لیا ہے۔“ اُس نے بالآخر جیسے اُس سے دل کی بات شیر کر لی۔

”اس گلی کے ہر گھر سے قرض لے رکھا ہے ہم نے..... کچھ پہلے لیا تھا..... کچھ اب..... اور پھر جہانگیر کو ہسپتال سے لانے کے لیے..... وہ جو کہتے ہیں نا بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ مجھے آج پتا چلا ہے وہ کیسے ہوتا ہے۔“ دور نجد کی سے کہہ رہی تھی۔  
 ”دماغ پر مت سوار کر دیہ سب کچھ..... اُتر جائے گا سارا قرض..... کون سا ابھی کوئی مانگ رہا ہے۔“ اُٹھی نے تسلی دی۔

”مانگ رہے ہیں..... یہ غریبوں کا محلہ ہے اُٹھی! ان سب کو ضرورت ہے اپنے پیسوں کی..... ابھی ہمدردی میں نرمی سے تقاضا کر رہے ہیں اور پھر سختی سے کریں گے۔“ مومنہ نے کہا۔  
 ”تم اتنی حساس مت ہو مومنہ! ردو لو..... غبار نکالو اپنے اندر سے۔“ وہ اس کے علاوہ اور کوئی حل پیش نہیں کر سکتی تھی۔ جانتی تھی مومنہ ٹھیک کہہ رہی۔

”مجھے رونا نہیں آتا اُٹھی..... میرے گھر میں دو لوگ پہلے ہی دن رات روتے ہیں..... میں کیسے روؤں..... میرے سامنے ضرورتوں کا پہاڑ کھڑا ہے اور میرے ہاتھ ہیر کام نہیں کر رہے..... اس کو سر کروں تو



کیسے کروں۔" وہ اُس سے کہہ رہی تھی۔ صرف اُسی سے یہ سب کہہ سکتی تھی۔  
 "یہ فلم کرو مومنہ! بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔" اُسی نے اُسے جواباً کہا۔ وہ چپ چاپ اُس کی باتیں سنتی رہی۔

☆☆☆

دورات دیر سے گھر آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ دادا سو چکے ہوں گے۔ شکور نے دروازہ کھولا۔  
 "کھانا دے دو مجھے۔" وہ اتفاقاً اُس رات کھانا نہیں کھا۔ کاتھا درنہ اتنی رات کو ہمیشہ کھانا کھا کر گھر آتا تھا۔  
 "ہاؤ..... آپ کھانا کھائیں گے..... وہ تو میں نے بنایا ہی نہیں۔" شکور نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔  
 "کیوں دادا کو نہیں دیا؟" مومن نے پوچھا تھا۔  
 "دادا تو چلے گئے۔" شکور نے اُسی سانس میں کہا۔ مومن اندر جاتے جاتے ٹھٹھک گیا۔  
 "کیا مطلب کہاں چلے گئے؟"

"واپس ترکی..... اُن کی فلائٹ تھی آج..... آپ کو یہ بھی نہیں پتا؟" شکور نے اُس کے چہرے سے جیسے اندازہ لگایا۔  
 "تم نے مجھے نہیں بتایا۔" مومن کو اس کے سوا کوئی جواب نہیں سوچا پایا تھا۔ ایک عجیب سی پشیمانی نے اُسے آن گھیرا تھا۔

"مجھے لگا، آپ کو خود پتا ہوگا۔ مجھے کہا ٹیکسی منگوا دو..... میں نے فٹ سے کریم منگوائی ایپ ڈاؤن لوڈ کر رکھی تھی۔ کرو لا پر بھیجا ہے دادا جی کو۔" شکور نے فخر یہ مومن کو بتایا۔ مومن کھڑا اُسے دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔  
 "اب بھی کھانا کھائیں گے؟" شکور نے پیچھے سے آواز دی۔  
 "نہیں۔" مومن نے کہا۔

"شکر ہے کھانے کے چکر میں شورہ جانا تھا میرا۔" شکور کے سر سے جیسے بلا ٹلی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر دادا کے کمرے میں آ گیا۔ دروازہ بند کر کے اُس نے لائٹ آن کی۔ کمرہ یک دم روشن ہوا۔ وہاں ایک عجیب سا سکون تھا۔ فرش پر وہ مصطفیٰ ویسے ہی بچھا ہوا تھا بس اُس کا ایک کونہ مڑا ہوا تھا۔ اُس کی سا لگہ پر دی جانے والی۔ کئی گرائی دیوار پر لگی ہوئی تھی۔  
 اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

وہ پچھلے چھ سالوں سے ہر سا لگہ پر اُسے کوئی نہ کوئی آیت خطاطی کر کے دیے رہے تھے۔ وہ انہیں ایک نظر دیکھ کر رکھ دیتا تھا۔ سوائے اُس پہلی کئی گرائی کے جو اُس نے لاؤنج میں لگا رکھی تھی۔ بہت دیر وہاں کھڑا وہ اُس آیت کو دیکھتا رہا پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے وہی سین چلنے لگا تھا۔ رات کے اُس پچھلے پہر دادا کا اُس مصطفیٰ پر سجدے میں روتا۔

"اے اللہ! میرے مومن کو سیدھا راستہ دکھا..... اسے صراطِ مستقیم پر چلا۔"  
 قلب مومن دیوار پر لگے اُس فریم کے سامنے سے ہٹاؤں جیسے یہ سب وہ ستر سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ کان بند کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کمرے میں آتے ہی دادا کی ساری باتیں گونج بن کر اُس کے گرد پھرنے لگی تھیں۔  
 "تم خوش ہو؟"

"بہت بہت زیادہ..... بے تماشاً۔"

”کیتے کیوں نہیں۔“

قلب مومن نے لائٹ آف کر دی۔ وہ اس آواز کی بازگشت سے فرار چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ اس رات ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس سے ناراض ہو کر گئے تھے یا شاید پہلی بار اس نے اُن سے اتنے سخت لفظ بولے تھے۔

ناشتہ کی میز پر بھی اُس کا دھیان بار بار اُن کی طرف جاتا رہا۔ وہ اخبار دیکھ رہا تھا اور شکور اسٹور روم سے وہ سارے مجسے نکال نکال کر دوبارہ لاؤنج میں اُنہیں ان کی جگہوں پر رکھتے ہوئے جھاڑ پونچھ کر رہا تھا۔

”داداجی تھے تو صفائی کا کام کتنا کم ہو گیا تھا۔ ساری چیزیں اسٹور میں پڑی رہتی تھیں۔ اب پھر جھاڑ پونچھ ہوگی۔“ شکور ایک مجسمہ کنسول پر رکھتے ہوئے کچھ بے زاری سے بڑبڑایا اور پھر اسی بڑبڑاہٹ میں مومن نے اُسے کہتے سنا۔

”پتا نہیں کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہتے تھے۔“

مومن متوجہ ہوا۔ ”کون؟“

”داداجی..... کونوں دیواروں میں..... اور آپ پر بھی تو پھونکتے تھے۔“ شکور نے فوراً بتایا۔

”مجھ پر؟“ مومن چونکا۔

”ہاں..... دو بار تو میں نے خود اُنہیں دیکھا..... آپ کو جگانے جاتے تھے اور جگائے بغیر آ جاتے تھے۔ دادا جی بڑا پیار کرتے تھے آپ سے..... مومن ہیں بالکل..... مطلب اصلی والے..... آپ کا تو صرف نام ہے۔“ شکور نے روانی میں جو کہا تھا۔ اُسے شاید خود بھی اپنے جملے کی گہرائی اور اثر کا اندازہ نہیں تھا مگر مومن کو اُس کے آخری جملے نے جیسے کچھ چھو یا تھا مگر شکور سے وہ کیا بحث کرتا۔

”تم سے میرے بارے میں کچھ پوچھتے تھے؟“

”کیا؟“ مومن کے سوال پر شکور چونکا۔

”کچھ بھی؟“ مومن خود بھی نہیں جان پایا وہ کس چیز کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں، پوچھتے تھے کہ آپ کب آئیں گے جب آپ رات کو لیٹ ہوتے تھے تو۔“ شکور نے روانی سے کہا۔ مومن کو جیسے تسلی نہیں ہوئی۔

”کسی اور چیز کی بات کر رہا ہوں میں..... میرے بارے میں کچھ اور پوچھتے تھے؟ لڑکیوں سے دوستی وغیرہ کے بارے میں؟ یا میرے دوستوں کے بارے میں؟“ مومن نے بالآخر کھل کر کہا۔

”نہیں جی۔ داداجی کو تو سوال کرنے کی عادت ہی نہیں تھی..... یہ سب سے اچھی عادت ہے اُن کی..... بس میری ہی باتیں سنتے رہتے تھے ہر وقت اور آپ کو تو پتا ہے میں آپ کے بارے میں کتنی باتیں ہی نہیں کرتا۔“ شکور نے بے حد احتیاط انداز میں اُس سے کہا تھا، وہ اُس کے سوالوں سے کچھ ڈرا تھا۔

مومن نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ چپ چاپ چائے کے اُس کپ کو دیکھتا رہا جس میں وہ چائے پی رہا تھا اور جو ابھی آدھا بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ اُسی طرح اُنچھ کر چلا گیا۔ اُسے جاتے دیکھ کر شکور نے معنی خیز انداز میں تبصرہ کیا۔

”لگتا ہے، کچھ تیار ہے ہیں۔“

☆☆☆

”ہیلو نیٹا!“ نیٹا اُس وقت ضوفی کے ساتھ اُس کی گاڑی میں تھی جب ضوفی کے فون پر نیٹا کا نام چکا تھا۔

”ہائے ضوفی..... آپ کا انویشن کارڈ تھا میرے پاس..... قلب مومن کی اگلی قلم کی اناؤٹ لائنٹ کی



”ضوئی نے دھڑکتے دل کے ساتھ ٹیٹا کو اسٹیکر پر لایا تاکہ نیہا بھی اُس کی بات سن سکے۔  
 ”تیریب ہے۔“ ضوئی نے لہجہ بے حد نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”اچھا تو کاسٹ فائل ہوئی؟ کیا کاسٹ ہے؟“ ضوئی نے لہجہ بے حد نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”آپ کے لیے سر پرانہ ہے۔ مومن خود ہی آپ سے بات کریں گے لیکن آپ کا آنا لازمی ہے۔“ ٹیٹا نے  
 ہنستے ہوئے کہا۔ ضوئی نے بے یقینی سے نیہا کو دیکھا۔ اُس نے مکا ہوا میں جوش میں لہرایا تھا۔  
 ”شیور... شیور... آپ وائس ایپ بھی کر دیں آئی دل بی ریئر۔“ ٹیٹا نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔  
 ”میں ابھی کر رہی ہوں۔ مضمون کر کے ادا کر دیں۔“ ٹیٹا نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔  
 ”ہو، ہائی گاڈ۔ اس نے مجھے شامل کیا ہے۔“

اُس نے بے اختیار نیہا سے کہا تھا۔  
 ”میں نے کیا کہا تھا تم سے۔“ نیہا نے فخریہ انداز میں اُس سے کہا۔ ”وہ مجھے انکار نہیں کر سکتا۔“ وہ ہنس رہی  
 تھی۔ ”میں بہت ایکسٹینڈ ہو رہی ہوں۔ تم اشارہ بننے جا رہے ہو۔ تمہاری دارڈر دب میں کر دیں گی۔“ نیہا نے  
 اُسے جکے سے جکے لگاتے ہوئے کہا۔  
 ”بالکل بالکل۔ یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ہے۔ اپنا پہلا ایوارڈ تمہارے نام کر دیں گا میں۔“ ضوئی نے بھی  
 جواباً اُس کے گل پر بوسہ ثبت کیا تھا۔

”اور دوسرا؟“ نیہا نے بڑے باز سے پوچھا۔ ”دوسرا تیسرا... سارے۔“ ضوئی نے ذرا یوکریتے ہوئے کہا۔  
 ”اب ٹیٹا مجھے کال کر رہی ہے انوائٹ کرنے کے لیے۔ اور مجھے اتنے دنوں سے ٹینشن تھی کہ پتا نہیں کیا  
 ہو کہ کبیں بغیر مجھے انوائٹ کے ہی اناؤنسمنٹ نہ ہو جائے۔“  
 اُس نے ضوئی سے بات کرتے ہوئے ٹیٹا کی کال لی تھی اور بڑے بیٹھے لہجے میں اُس سے کہا تھا۔ ”ہائے ٹیٹا۔“

”ہائے ہائے ہائے“  
 ”قب مومن کہیں جانے کے لیے اپنے بیڈروم میں تیار ہو رہا تھا۔ جب اُس کا سیل فون بجا۔ نیہا کا نام دیکھ  
 کر اُس نے کال ریسیو کی۔“ ہیلو۔“  
 اُس کی ہیلو کا جواب نیہا نے بے حد رومانٹک انداز میں دیا۔  
 ”آئی لو یو جانو!“ وہ جواباً مسکرایا۔  
 ”آئی لو یو۔“

”یو آر دایسٹ۔“ نیہا نے اپنی آواز کو مزید میٹھا کرتے ہوئے کہا۔  
 ”لیس آئی نو۔“ مومن نے جواباً اُسی انداز میں کہا تھا۔ نیہا ہنسی۔  
 ”مجھے پتا تھا تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔“  
 ”تمہاری ایکسپیکشن پر پورا اترتا میرے لیے اعزاز ہے۔“ مومن نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”اوہ مومن! آئی لو یو۔“ نیہا نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔  
 ”تم آر ہی ہو یا کس؟“ مومن نے اس بار موضوع بدلا۔  
 ”کھا ہر سہ اپنی جان کا ایونٹ کیسے مٹ کر سکتی ہوں۔“  
 ”کون جان؟“ مومن نے عجیب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔  
 ”تم۔ کون؟“ نیہا نے اُس کے انداز کو مذاق سمجھا۔  
 ”تمہارے بغیر تو ایونٹ ہو ہی نہیں سکتا نیہا تمہارے بغیر نہ ضوئی کے بغیر۔“ مومن کچھ عجیبہ ہوا تھا۔  
 ”مجھے پتا ہے سر پرانہ دینا چاہتے ہو مگر... آئی لوسر پرانہ۔ ضوئی تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔“

”اور میں تم دونوں کو مایوس نہیں کروں گا۔“ مومن نے جواباً کہا۔

”ملتے ہیں؟“ نیہا نے اس بار بڑے رومانٹک انداز میں اُس سے کہا۔ ”اتنے دن ہو گئے، تم کو مس کر رہی ہوں۔“ مومن نے جواباً اُسی انداز میں کہا۔ ”کل ہی مل لیتے ہیں۔ آج میں کہیں جا رہا ہوں۔“

نیہا چوگی۔ ”کہاں؟“

”ایک نئی گرل فرینڈ کے ساتھ۔“

نیہا نے قہقہہ لگایا۔ ”ہو ہی نہیں سکتا۔“

”مومن پر اتنا اعتماد اچھا نہیں۔“ مومن نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

”اعتماد نہیں پیار ہے۔“ اُس نے بہت لاڈ سے کہا۔

”وہ بھی ناقابل اعتبار ہے۔“

”اچھا آج جو جا رہے کہہ لو۔ سب معاف ہے تمہیں۔ تم نے اتنی بڑی خوش خبری دی ہے مجھے۔“ نیہا نے اُس سے کہا تھا۔

”کل اس سے بھی بڑی دوں گا۔ بائے۔“

یہ پہلی بار تھا کہ فون مومن نے رکھا تھا اس طرح بات کرتے ہوئے۔ نیہا کو کچھ کھٹکا تھا۔ ناراض ہے۔ میں منالوں گی۔ اب اتنا خیر تو بنتا ہے اُس کا۔ اُس نے مطمئن انداز میں سوچا تھا۔ وہ مومن کو اچھی طرح جانتی تھی اور یہی اُس کی سب سے بڑی غلط فہمی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکی میں ترکی کے اُس علاقے میں آس پاس کے گھنے ہزرے کے درمیان وہ چھوٹا سا بے حد پرانا لکڑی کا دو منزلہ گھر کسی جگہ کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ اُس علاقے کے سب سے پرانے گھروں میں سے ایک تھا۔

عبدالعلی اُس رات کیونوس پر ایک نئی آیت پینٹ کرنے والے تھے اور اس وقت وہ وضو کر رہے تھے بے حد ٹھہر ٹھہر کر۔ یہ بھی اُن کی ایک روٹین تھی۔ وہ خطاطی ہمیشہ با وضو حالت میں کرتے تھے۔ فون کی پہلی گھنٹی پر انہیں جیسے پتا چل گیا تھا۔ فون کرنے والا کون تھا۔

”السلام علیکم۔“ قلب مومن کے لہجے میں عجیب سی ندامت تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ عبدالعلی نے بے حد محبت سے کہا۔

”میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔“

”بالکل بھی نہیں۔ کسے ہو تم؟“ انہوں نے مومن سے پوچھا۔

”ویسے کا دیا ہوں یعنی بُرا۔۔۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟“ اُس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

”الحمد للہ۔“ عبدالعلی نے اُس کے جملے پر تبصرہ نہیں کیا۔

”آپ ناراض تو نہیں؟“ مومن نے فوراً ہی پوچھ لیا تھا۔

”نہیں۔“ عبدالعلی مسکرائے۔

”جانے سے پہلے مل کر نہیں گئے۔“ مومن نے گلہ کیا۔

”تم مصروف تھے۔“

”آپ کے لیے تو نہیں تھا۔ مجھے لگا، آپ ناراض ہو کر گئے ہیں۔“ وہ مدہم آواز میں کمرے میں ٹپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ناراض ہو کر کیوں جاتا۔“ عبدالعلی کا لہجہ ویسا ہی ملائم تھا۔



”میرا اور آپ کا آرگورمنٹ ہوا تھا..... شاید میں نے کچھ ایسا بھی کہہ دیا تھا جو میرا مطلب نہیں تھا۔ اس لیے بس..... جو میں سوچا تو..... بڑے۔“ قلب مومن اٹھتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔ ساری زندگی اُس نے کبھی کسی سے معذرت تو درکنار اپنے رویے کی وضاحت بھی نہیں کی تھی تو انکار نہ تو کیا کرتا۔

”مجھے ٹوٹی ہے، آپ باراض نہیں ہیں۔“ اُس نے جیسے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

”تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ مجھے غصہ آتا۔ غصہ دلانے والی ساری باتیں تو میں نے کی تھیں۔“

عبدالعلی اپنے کمرے میں ایزل اور کیوس رکھتے ہوئے ساتھ اُس سے بات بھی کر رہے تھے۔

”یہ تو آپ کھڑک کہہ رہے ہیں..... باتیں تو ساری غصہ دلانے والی ہی ہیں آپ کی..... اور زندگی میں پہلی بار کی ہیں آپ نے ایسی باتیں۔“ مومن نے فوراً ہی اتفاق کیا۔

”پھر تم نے سوچا اُن باتوں کے بارے میں؟“ انہوں نے پوچھا تھا۔

”بالکل بھی نہیں..... سوچنے والی کوئی بات بھی ہی نہیں اُن میں..... دادا! میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا۔“ میں اپنی لائف پر، اپنے کام پر، اپنی اچھوتی منشی پر بہت پراؤ ڈھیل کرتا ہوں۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔

”کام غلط نہیں ہے۔ سب غلط ہے۔“ اُس نے عبدالعلی کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”دادا! میں آپ سے کہوں، آپ اپنا کام چھوڑ دیں..... آپ چھوڑیں گے؟ میں آپ سے کہوں آپ کا کام بُرا ہے۔ آپ مانیں گے؟ میرا اور آپ کا نظریاتی اختلاف ہے دادا۔ آپ زندگی کے بارے میں میرا نظریہ نہیں بدل سکتے۔“ وہ کہہ رہا تھا دو ٹوک انداز میں۔

”میں نہیں بدل سکتا مومن..... اللہ تو بدل سکتا ہے۔“ انہوں نے مدہم آواز میں کہہ کر جیسے اُس کی طنائیں کھینچی تھیں۔

”آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں دادا.....“ وہ زچ ہوا، اُکھڑا، خفگی کے عالم میں اُس نے فون بند کر دیا تھا۔ عبدالعلی ایسے نہیں تھے جیسے اب ہو رہے تھے۔

”دادا کو کیا ہو گیا ہے.....“ اُس نے پریشانی سے سوچا تھا۔ مگر وہ اُن کی کسی بات پر غور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”انسان عمر کے اس حصے میں آکر ایسا ہی ہو جاتا ہے..... مذہب، مذہب، نصیحتیں، نصیحتیں۔“ اپنی آستینوں کے بن کھولتے ہوئے اُس نے اُس بے قراری سے چھکارا حاصل کرنے کے لیے جیسے خود سے کہا۔ جو دادا کے کچھ جملوں نے اُسے دی تھی۔

☆ ☆ ☆

”ماسٹر صاحب! میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔“ اُس نو جوان لڑکے نے وہ ڈبہ کھولتے ہوئے ماسٹر ابراہیم سے کہا۔ وہ اُن کے پاس آنے والے بہت سے لڑکے لڑکیوں میں سے تھا۔

”کیا؟“ برآمدے میں بیٹھے اپنے کام میں مصروف ماسٹر ابراہیم نے کہا۔

”اگر یہ کام ہم نہ کر رہے ہوتے تو کیا ہوتا؟“

”تو پھر کوئی اور ہماری جگہ بیٹھا ہوتا یہ کام کرنے کے لیے..... اللہ کا کام ہے اور اللہ کے پاس اپنے کام کروانے کے لیے بندے بہت.....“ انہوں نے سکراتے ہوئے اُسے دیکھے بغیر کہا۔

”یہ تو ٹھیک کہا آپ نے.....“ اُس لڑکے نے بے اختیار تائید کی۔ ”لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو پتا کیسے چلتا ہے اس جگہ کا اور آپ کا؟ کہاں کہاں سے پرانے اور بوسیدہ قرآن پاک کے نسخے آرہے ہیں۔ آج جو ڈبہ آیا ہے، وہ چار سو روپے آیا ہے۔“ وہ اُس کا رٹن پرگے ایئر لیں کور دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا جسے اُس نے ابھی کھولا تھا۔

”اللہ خبر دیتا ہے..... اب لا کر بیٹایا ہے اس کام کے لیے تو کام بھی تو بیسے گا نا۔“ ماسٹر ابراہیم نے ہنسنے سے۔

”میں چلا ہوں اب..... آج ویزا کے لیے اپلائی کرنا تھا۔ دُعا کریں ویزا لگ جائے۔“ وہ لڑکا اپنا کام پٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ماسٹر ابراہیم نے اُسے دیکھے بغیر کہا۔  
 ”اس سال نہیں لگے گا..... اس لیے پیسے ضائع نہ کرو..... اگلے سال جانا..... تب تک کوئی آجائے گا  
 میرے پاس تمہاری جگہ۔“

لڑکا اُن کی بات پر گڑ بڑا کر ہنسا۔ ”چلیں آپ نے تو بات ہی ختم کر دی۔ خدا حافظ۔“  
 ”خدا حافظ۔“ ماسٹر ابراہیم نے اُسے جاتے ہوئے اور مومنہ کو آتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ بولے۔  
 ”تم کہاں غائب ہو جاتی ہو مومنہ؟“ مومنہ نے جواباً مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اُنہیں سلام کیا۔  
 انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔  
 ”لاہور سے کب آئیں واپس؟“  
 وہ اب برآمدے میں بیٹھ رہی تھی۔

”بڑے دن ہو گئے۔“ اُس نے کہا پھر اٹھ کر شریف سے اپنا قرآن اور کام نکال لائی۔  
 ”سب ٹھیک رہا؟“ ماسٹر ابراہیم کو وہ بہت کمزور لگی۔  
 ”ہاں۔ تجھے قلم مل گئی۔“ اُس نے دوبارہ فرش پر بیٹھتے ہوئے قرآن پاک کے وہ صفحے نکال لیے جن کی وہ  
 درستی کے لیے خطاطی کر رہی تھی۔  
 ”بہت مبارک ہو۔ بڑی خوشی کی خبر ہے یہ تو۔“ مومنہ نے جھک کر خالی کاغذ پر ایک لکیر کھینچی جیسے قلم کی  
 نوک چیک کر رہی ہو۔

”پتا نہیں۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے رُکی۔  
 ”جباتمیر کیسا ہے؟“ ماسٹر ابراہیم نے چند لمحوں بعد پوچھا۔  
 ”وہ مر گیا۔“ اُس نے سر جھکائے جھکائے اُن کا چہرہ دیکھے بغیر کہا۔  
 ”تم نے بتایا ہی نہیں، میں اُس کا جنازہ پڑھنے آتا۔“ تجھے بڑا افسوس ہوا ہے مومنہ بیٹی۔“ ماسٹر ابراہیم کو  
 واقعی صدمہ ہوا تھا۔ وہ اُسی طرح بے تاثر چہرے کے ساتھ سر جھکائے کام کر رہی تھی۔  
 ”چپ کیوں ہے؟“ انہوں نے اُس سے پوچھا۔ اُس کی خاموشی اُنہیں تکلیف دہ محسوس رہی تھی۔ وہ  
 سر جھکائے بہت دیر کچھ ہستی رہی پھر اُس نے سر اٹھایا۔

شائع ہو چکے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

غریب صورت سہرتی

غریب صورت پہنائی

مقبولہ جلد

آئسٹ ہوج

رضیہ جمیل قیمت: 300/- روپے

راحت جبین قیمت: 1000/- روپے

غزالیہ عزیز قیمت: 400/- روپے

☆ فصل غم کا گوشوارہ

☆ زرد موسم

☆ حساب دل رہنے دو



”آپ سے آزمائش ٹم ہونے کی دعا کی تھی۔ جہانگیر کے ٹم ہونے کی خواہش تو نہیں کی تھی۔“ اور  
 اور بھرائی۔ ”آسو اُس کے گالوں پر بہنے لگے۔ اُس نے رگڑنے کی کوشش کی یوں جیسے اُنہیں پمپانا پانی ہو  
 ”رودی کوئی نہیں ہوتا۔“ ماسٹر ابراہیم نے مرام جیسے لہجے میں اُس سے کہا۔  
 ”جہانگیر ٹم ہو گیا۔۔۔۔۔ آزمائش ٹم نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ ہال ہال قرض میں جکڑا ہے میرا۔۔۔۔۔ میں نے کیا روٹا

ماسٹر صاحب۔۔۔۔۔ سر درد پھر سے سارے آنسو پی کیا ہے۔“  
 اُس نے گھر اسانس لہا یوں جیسے رُکے ہوئے سانس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔  
 ”میں صبح اُٹتی ہوں تو لگتا ہے، مجھے اُس کو ہسپتال لے کر جانا ہے۔ پھر یاد آتا ہے، وہ تو ہے ہی نہیں  
 اور اماں کی کمر ٹوٹ گئی ہے، وہ ہر وقت روتے رہتے ہیں۔ اور میں۔۔۔۔۔ میں ڈھیٹ ہو گئی ہوں۔ کھانا ک  
 ہوں۔۔۔۔۔ پانی جیتی ہوں۔۔۔۔۔ سوئی ہوں۔ سارے کام کرتی ہوں بس روتی نہیں۔ میں کتنی ڈھیٹ ہوں۔“  
 نے عجیب انداز میں ماسٹر ابراہیم کو دیکھا۔ اُس کے آنسو واقعی لحوں میں خشک ہوئے تھے۔  
 ”اللہ نے تمہیں صبر دیا ہے۔“ ماسٹر ابراہیم نے کہا۔

”بہت زیادہ دے دیا ہے۔“ مومنہ نے کہا۔ ”مومنین پر آزمائشیں آتی ہیں۔ اجر بھی بڑا ہے۔“  
 ”میں گناہ گار ہوں۔۔۔۔۔ کہاں کی مومن۔۔۔۔۔ کہاں کا اجر؟“

”مومنہ نام ہے تمہارا۔۔۔۔۔ گناہ گار کیسے ہو سکتی ہو تم؟ اور اجر کا تو اللہ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے۔  
 اپنے وعدے کے خلاف نہیں جاتا۔ زبان کا بڑا پکا ہے میرا رب۔“ انہوں نے اُسے دلا سادے کی کوشش کی تھی  
 ”میں نے آج تک کبھی کوئی کام اجر کے لیے کیا ہی نہیں۔ نیکی بھی کی ہے تو اپنے آپ کو گناہ گار سمجھ  
 ہے۔“ وہ جیسے ماسٹر ابراہیم سے متفق نہیں ہوئی تھی۔

”اجر پھر بھی ملتا ہے مومنہ۔“ ماسٹر ابراہیم نے اپنا جملہ دہرایا۔  
 ”اجر کیا ہو گا اب میرے لیے ماسٹر صاحب۔۔۔۔۔ جہانگیر کے بعد۔۔۔۔۔ دُنیا کی کوئی شے نہیں جو میرا دل  
 کر دے۔ میرے ماں باپ کا غم ختم کر دے۔۔۔۔۔ کوئی اجر تھا بھی تا میرے لیے تو میرے گناہ کھائے اُسے۔“  
 نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”تم بہت اچھی روح والی لڑکی ہو مومنہ سلطان۔“  
 ”اچھی روح؟“ وہ غم آنکھوں کے ساتھ ہنسی۔ ”آپ مجھے نہیں جانتے ماسٹر صاحب۔۔۔۔۔ آپ شر  
 کر رہے ہیں مجھے۔“  
 ”ہم میں سے کوئی کسی کو نہیں جانتا مگر رب خوب جانتا ہے۔۔۔۔۔ آؤ جہانگیر کے لیے دعا کریں۔“ انہوں نے  
 اپنے ہاتھ اٹھائے تھے۔ مومنہ اُنہیں دیکھنے لگی۔

☆☆☆☆

ماسٹر ابراہیم کے گھر سے والہی کے پورے راستے وہ اُن کے جملوں کے بارے میں سوچتی رہی۔  
 ”اجر تو اللہ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں جاتا۔ زبان کا بڑا پکا ہے میرا رب۔“  
 اُن کے جملے اُس کے کالوں میں گونجتے رہے اور سفر کرتے ہوئے اُس نے سوچا، وہ کون سی چیز تھی جو اُسے  
 ملتی تو وہ اُسے اپنا اجر سمجھتی۔۔۔۔۔ اُس کے ذہن کی اسکرین پر ایک ہی نام اور چہرہ آیا تھا اور اُس نے اُسے اپنے  
 ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ ناممکنات پر یقین نہیں رکھتی تھی۔  
 اپنے گھر کے کون میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے اندر سے آتی ایک آواز سنی تھی اور اُسے ناممکنات  
 یقین آ گیا تھا وہ جسے اپنا اجر سمجھتی، وہ اُس کے گھر پر موجود تھا۔  
 (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



بشری احمد

# جس کے کان میں



”لگتا ہے کوئی الوکھا بچہ پیدا کر رہی ہیں بہو  
تھیں۔ داصف نے جو بہت گمن ہو کر پی دی پر ایک  
سیاسی مباحثہ دیکھ رہے تھے، بیوی پر ایک سرسری سی  
نیکم۔“ رئیسہ چنبلانی ہوئی آواز میں شوہر سے مخاطب



لگاؤ ڈالی۔

”خیر تو ہے، اب بے چاری بہو سے کون سا قصور سرزد ہو گیا۔“ فی وی کی آواز ذرا سی کم کرتے ہوئے بیوی سے دریافت کیا۔

”بس آپ کو تو وہ ہی بے چاری لگتی ہے اور میں جو دو گھنٹے سے کچن میں کھپ رہی تھی۔ مجھ بے چاری سے آپ کو کوئی ہمدردی نہیں۔“ رئیسہ تنک کر بولی تھیں۔

”ارے بھئی بے چارے ہوں آپ کے دشمن اور کیوں کھپ رہی تھیں آپ دو گھنٹوں سے کچن میں۔ سادہ سے دال، چاول ہی تو بنانے تھے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”پہلے برتن دھوئے پھر کچن کی صفائی کی، اس کے بعد کھانا بنایا۔ بہو بیگم تو صبح کا ناشتا کر کے جو کمرے میں تھیں تو اب تک باہر نہیں نکلی ہیں۔“

”تو بہو کی طبیعت بھی تو دیکھو۔ اللہیاں کر کر کے بے حال ہوئی رہتی ہے۔ دھان پان سی تو ہے۔ ڈاکٹر نے بھی مکمل بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی کام میں لگی ہی رہتی ہے۔ آج طبیعت زیادہ تحمل ہوئی تو بے چاری آرام کر رہی ہوگی۔“ داصف صاحب نے ثانیہ کی طرف داری کی تھی۔

”پھر وہی ہے بے چاری، میں پوچھتی ہوں داصف صاحب، اپنی بہو تو آپ کو دنیا جہان کی مظلوم ترین ہستی لگتی ہے۔ کبھی یہ وقت ہم پر بھی آیا تھا۔ پانچ بچے پیدا کیے میں نے۔ اس وقت میں بھی ایسی ہی دھان پان سی ہوئی تھی۔ آپ کی ماں مجھے کوئی رعایت دینے کو تیار نہ ہوتی تھیں۔

اللہ بخشے آپ کی اماں ایسے ایسے کام میرے ذمے لگا دیتی تھیں جو کوئی عورت نارمل حالت میں بھی کرتے ہوئے ہنکپائے اور میں بلاچوں چرا کیے آپ کی ماں کا ہر حکم بجالاتی تھی۔ ہمیں تو کسی حالت میں کوئی استثناء ملا۔“

”واہ بیگم واہ دل خوش کر دیا آپ نے ہنسنے لگی ہیں۔ یہ فائدہ دواتے میرے ساتھ بیٹہ کر سنا ہی ہاں شوز دیکھنے کا۔“ وہ لطف کہتے ہوئے بولے۔

”بات کو کھمانے پھرانے میں آپ تو سیاست دانوں کو بھی مات دینے لگے ہیں۔ میرے سوال کا جواب جو نہیں ہے آپ کے پاس۔ ہم تو سہانی زندگی کو لبو کے تیل کی طرح جتے رہے۔ پہلے ماں کی چاکری کی۔ پھر شوہر اور بچوں کی سیوا میں لگے رہے۔ سوچا تھا بہو آئے گی تو سکھ کا سانس ملے گا لیکن نہ جی، اب بہو بیگم کی نازیرداریاں کرنی پڑتی ہیں۔“ رئیسہ کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ ایسے میں ثانیہ کی حمایت میں کوئی ایک آدھا خرقہ مزید بولنے سے نقص امن کا خدشہ تھا بیواصف صاحب نے بکر کی بڑبڑاہٹوں پر کوئی رد عمل دینے کے بجائے ہر سے فی وی کی طرف توجہ مرکوز کر لی۔ آخر رئیسہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔ ان کے جانے بعد داصف صاحب نے بھی فی وی بند کر دیا۔ ٹھہر کر پرچھائیاں ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

ان کی شریک حیات نے زندگی بھر خود سے وابستہ ہر رشتہ مثالی انداز میں نبھایا تھا۔ داصف صاحب کا خیال تھا کہ جس لڑکی کو رئیسہ بہت چاہے بہو بنا کر لائی ہیں، وہ اس کے ساتھ بھی مثالی رویہ اپنائیں گی۔ لیکن یہاں ان کا اندازہ غلط ثابت ہونے لگا تھا۔

ان کی بہو ثانیہ سلجھی ہوئی عادات کی مالک، ہنس مکھ سی لڑکی تھی۔ شادی کے بعد اس نے مگر کی ذمہ داریاں بھی بطریق احسن نبھانا شروع کر دیں۔ ثانیہ اور اسند کی شادی کے بعد شروع شروع میں تو رئیسہ اپنے انتخاب پر خاصی مسرور اور بازاں رہیں۔

”ثانیہ نے تو مجھے سویرا کی کی محسوس ہی نہیں ہونے دی داصف صاحب! بہو مجھے کسی کام کو مانے



”اچھی بات ہے لیکن نعمان کو فون کر کے کہہ دو کہ رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائے۔ یہ نہ ہو کہ وہ اپنے دوست کے ہاں کھانا کھا کر آئے۔“ رئیس نے فوراً تاکید کی تھی۔ سویرا نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اور ثانیہ بھابھی آپ سنائیں کیسی طبیعت ہے۔ بہت کمزور لگ رہی ہیں۔“ وہ اب بھادج کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کچھ کھایا پیا ہی نہیں جاتا بس اسی لیے کمزوری محسوس ہوتی ہے۔“ ثانیہ نے سادگی سے بتایا تھا۔

”بس آپ اور میں تو ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔“ سویرا مسکرائی تھی۔ دونوں خند، بھادج کی شادیاں اکٹھی ہوئی تھیں اور دونوں کو خوش خبری بھی تقریباً اکٹھے ہی ملی تھی۔

”مجھ سے تو خود کچھ نہیں کھایا جا رہا لیکن آنٹی اور نعمان میرے پیچھے پڑ کر مجھے کچھ نہ کچھ کھلاتے پلاٹے رہتے ہیں۔ آنٹی تو کبھی فروٹ کاٹ کر دیتی ہیں تو کبھی کسی فروٹ کا ٹکڑا بنا دیتی ہیں۔ میرے منہ گرنے کے باوجود مجھے زبردستی پلا کر ہی دم لیتی ہیں۔“ سویرا نے فراخ دلی سے اپنی ساس کی تعریف کی تھی۔

”خیریت سے تو ہیں کلثوم آپا۔ بہت دن ہو گئے ان سے بھی ملاقات ہوئے۔“ رئیس نے سمجھن کی خیریت دریافت کی۔

”آنٹی کے گھٹنوں اور کمر میں بہت درد ہے امی۔ معدے کی تکلیف کی وجہ سے پین کمرز کا زیادہ استعمال بھی نہیں کر سکتیں۔“ سویرا نے بتایا تھا۔

”ہاں بیٹا یہ عمر ہی ایسی ہے۔ درد ہی جان نہیں چھوڑتے۔ رئیس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”آنٹی ریست بھی تو نہیں کرتیں امی۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی ہیں اور آج کل تو کچن کی ذمہ داری بھی آنٹی نے ہی اٹھا رکھی ہے۔

نہیں لگانے دیتی۔“ چلیں اسی بات پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ ایک بٹی گھر سے رخصت ہوئی تو اللہ نے بہو کی صورت ہمیں ایک اور بٹی سے نواز دیا۔“ داحف مسکرا کر کہتے۔ رئیس جی طمانیت بھرے انداز میں مسکرا رہے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ رئیس کا اطمینان رخصت ہونے لگا تھا۔

اب انہیں ثانیہ سے بہت سی شکایتیں ہونے لگی تھیں اور جب سے ثانیہ امید سے ہوئی تھی شکایتوں کا تناسب بھی بڑھ گیا تھا۔ طبیعت نڈھال رہنے کی وجہ سے وہ اب پہلے کی سی مستعدی سے گھر کے کام نہ نشانیاتی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر نے بھی بیڈ ریست کی تلقین کی تھی۔ اس کا ثانیہ آرام رئیس کی آنکھوں میں کھلکتا تھا۔

انہیں اپنا وقت یاد آتا جب ان کی ساس انہیں کسی بھی حالت میں کوئی رعایت دینے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ داحف صاحب کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی بھلی مانس بیوی کو اس موازنے کی عادت سے کیسے باز رہیں۔ اب بھی بیگم کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک مسئلے کا حل سوچتے رہے تھے۔

☆☆☆

اچھی شام کو سویرا چلی آئی۔ لاڈلی بیٹی کی اچانک آمد پر رئیس بیگم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ عموماً دیک اینڈ پر اپنے شوہر کے ساتھ آتی تھی۔ آج بنا اطلاع دیے ماں باپ سے ملنے چلی آئی تو ان کی خوشی فطری تھی۔

”صبح سے ہی آپ اور ابو بہت یاد آرہے تھے امی۔ آنٹی نے بھی میری اداسی محسوس کر لی۔ نعمان آج آفس سے جلدی آگئے تو آنٹی نے ہی ان سے کہا کہ مجھے آپ لوگوں سے بلوانے لے جائیں۔“ نعمان کو اپنے دوست سے ملنے جانا تھا۔ مجھے یہاں ڈراپ کر کے وہ چلے گئے۔“ سویرا نے مسکرا کر ماں کو بتایا تھا۔



سورہ کو پڑھ کر اس کی تفسیر کی اور اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔

مجھے جو کہ اس کے پاس کڑا تھا اس نے دیا۔  
 کوئی اور کڑا تھا اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے

سورہ کو پڑھ کر اس کی تفسیر کی اور اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔

اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے

سورہ کو پڑھ کر اس کی تفسیر کی اور اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔

اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے

سورہ کو پڑھ کر اس کی تفسیر کی اور اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔  
 اس کی تعلیم کے بعد اس کی تعلیم دی۔

اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے

اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے  
 اس کی طرف سے اس کی طرف سے اس کی طرف سے



# رشتے کے چھلکے

وہ جانتی تھی کہ وہ بے پناہ خوب صورت ہے، اس کے پاس دولت بھی ہے اور اب تو وہ ہاشم صاحب کے اکلوتے بیٹے کی بیوی بن گئی تھی۔ یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ وہ پورے خاندان کی سب سے خوش قسمت لڑکی تھی۔

بھولوں سے کچی سیج اور چاروں طرف پھیلی ان کی بھینی بھینی خوشبو اس کی چاہت اور رنگ کو مزید بڑھا رہی تھی۔ گہرے سرخ رنگ کے اس خوب صورت لہنگے نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔

تعریفوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہر طرف گونج رہا تھا جو حنا کے غرور کو ایسی تقویت بخش رہا تھا جیسے ہوا آگ کو مزید بڑھا دیا کرتی ہے۔





حنا کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آن اُس نے اپنی منزل پالی ہے۔  
انی ٹھیک کرتی تھیں۔ "میری بیٹی تو ہے ہی نصیبوں والی۔"

بچی وہ اپنے مہندی سے لال ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی تو کبھی ڈر پینک پر لگے شیشے میں دیکھتے ہوئے اپنے خوبصورت عکس کو نہارنے لگتی پھر اگلے ہی بل اس ڈر سے کہ کہیں اُسے اپنی ہی نظر نہ لگ جائے منسکر کر نظریں جھکا جاتی۔

جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور اپنے لپٹکے کو سیٹ کرنے لگی۔

حاشا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک پیار بھری نظر اپنی دلہن پر ڈالی جس سے وہ شرمائی۔  
حاشا نے اس کے رو برو بیٹھے ہوئے اُسے سلام کیا۔

اس کے خوب صورت ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھا ما اور ایک خوبصورت آنکھی اس کی آنکھی میں پہنا دی۔ جس سے اس کے ہاتھوں کے حسن میں مزید اضافہ ہو گیا۔ حاشا نے چند لمحوں کی باتوں کے بعد گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ ہر ممکن خوشی دوں گا پر اس کے بدلے میں تمہیں میرا ہاں رکھنا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی شک و شبہ رہ جائے اس لیے کچھ باتیں ہیں جو میں تمہیں پہلے ہی بتا دینا چاہتا ہوں جن کے حوالے سے کوئی بھی مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔

حنا! اب تم میری زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکی ہو لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجھے اپنے والدین سے بڑھ کر اور کوئی اہم نہیں ہے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں مگر تم یہ سمجھ نہ سوچنا کہ تم مجھے اُن سے الگ کر لو گی۔" حاشا نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے کہا۔

"میری جان رشتے بھانا اہم نہیں ہے، انہیں مضبوطی سے تھامے رکھنا اصل کامیابی ہے اور اگر

مضبوطی قائم رکھے کے لیے آپ کو قربانیاں بھی دینی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تمہارے لیے کچھ چاہیے کہ دن سے ہی اسے اپنا گھر بھر اس گھر کے سرکل میں مسائل سمجھو مجھے وہ پورے خبر تھی میں جس کا حل نہ ہو سکے کی طرف ہی انکار جاتا ہے۔

ذرا کوئی بات ہوئی اور فوراً اس کے فون کا کرسمس داستان سنا ڈالی پھر وہاں سے نکلے وہاں سے حاشا کو بنا سوچے کچھ سسرال میں اپلائے کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں تم سمجھ رہی ہو نہ؟" حاشا نے پوچھا۔

حنا کو خیر تو بہت آ رہا تھا پر اس وقت وہ کسی طرح اپنے جذبات کو ضبط کر رہی تھی اور اس نے ہال کھینچے میں ہی عافیت جانی۔ اور دل ہی دل میں بڑبڑاتے گی۔

(بڑے آئے مجھے مشورے دینے والے تمہارے لیے تمہاری فیملی عزیز ہے تو میں بھی اپنے گھر والوں کو جان سے زیادہ چاہتی ہوں کہ سنا جو کہنا چاہتی تھی وہ بس سوچ کر ہی رو کر دیتا ہوں۔)

اگلے دن دلہنہ تھا۔ ہر بار کی طرح حنا سے الگ لگ رہی تھی۔

"ماں صدقے جائے، وہ کچھ میری بیٹی پریشانی کی طرح کتنی پیاری لگ رہی ہے، حاشا تو مر رہا ہوگا۔" حنا کی ماں نے آتے ہی اس کی بلائیں لیں شروع کر دیں۔  
"ادھو..... کیا خاک مر رہا ہوگا، وہ تو نہایت ہی

فیر لکھ لکھا امی۔" حنا نے منہ پڑاتے ہوئے کہا۔  
"کیوں کیا ہوا بیٹا جی.....؟" ماں نے حنا کی کا اظہار کیا۔

"بس وہی تھکی بی بی ہائیں، میرے گھر والوں کا خیال رکھنا، مجھے یہ پسند نہیں مجھے وہ پسند نہیں..... ان بھلا کوئی اپنی بی بی کو ایسے بات کرتا ہے؟" حنا نے اپنی شکایات کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی۔



”اچھا اس نے یہ سب ہاتھ کیا کیوں تم سے،  
آنے والے ذرا دیکھنا کیسے کان چنتی ہوں اس  
کے میری بیٹی اس گھر کی مالکین ہے، نوکرائی نہیں جو  
اس سے اس طرح کا فرائض کی جارہی ہیں۔“ اس کی  
ماں بلاتا کان بولنے لگیں۔

حاشر جیسے ہی مہمانوں سے فارغ ہوا سیدھا  
اپنے سسرالی رشتے داروں سے ملنے چلا آیا۔  
”کیسی ہیں آپ آنٹی؟“ اس نے نہایت  
مودبانہ انداز میں پوچھا۔

”ہم تو ٹھیک ہیں میاں مگر مجھے تمہارے مزاج  
کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ حاشر نے حیرانی کا اظہار کیا۔  
”خود سوچو بھلا کوئی نئی نویلی دہن سے ایسی  
باتیں کیا کرتا ہے؟“

”کیسی باتیں؟“ حاشر مزید الجھا۔  
”یہاں کہ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھنا، اپنے گھر  
والوں سے رابطہ کم رکھنا یہ سب۔“

حاشر کو یک دم حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے حنا کو  
دیکھا وہ تو۔ ایسے۔ نارمل تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ  
ہو۔ حاشر کو بہت غصہ آیا اور ڈکھ بھی ہوا پر اس نے  
خود پر قابو پاتے ہوئے بات آئی گئی کر دی۔

☆☆☆

رات کو جب حاشر کمرے میں آیا تو اس کا موڈ  
آف تھا، حنا کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ اس  
لیے اس نے خود بات چیت شروع کر دی پر وہ ساری  
باتوں کا جواب ہاں ہوں میں ہی دے رہا تھا۔

”آپ امی کی باتوں کی وجہ سے ناراض ہیں،  
چھوڑیں وہ تو بس ایسی ہی ہیں۔“

”مجھے ان کی نہیں، تمہاری باتوں کا دکھ ہے، تم  
ایک دن بھی میری باتوں کا بھرم نہ رکھ سکیں۔“ حاشر  
نے گہرے ڈکھ کا اظہار کیا۔

”سواری، وہ سب تو ایسے ہی باتوں باتوں میں  
میرے منہ سے نکل گیا۔ نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہوگا۔

اب تو اپنا موڈ ٹھیک کر لیں، سواری۔“ حنا نے ترے  
کرنے شروع کر دیے۔

”دیکھو حنا! میاں بیوی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا  
ہے اتنا ہی نازک بھی ہوتا ہے۔ غلط فہمی کی ایک چنگاری  
اُسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے مجھے بس یہی کہنا تھا آگے  
تمہاری مرضی۔“ حاشر نے اتنا کہہ کر اپنی بات مکمل کر  
دی اور فیصلے کا اختیار حنا پر چھوڑ دیا مگر حنا کہاں باز آنے  
والی تھی۔ اس نے ہارنا اور جھکنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

ہر گزرتے دن ایک نئے مسئلے پر بحث ہوتا  
معمول بن گیا۔ حنا گھر میں ہونے والی معمولی باتوں  
کو بھی بہت محسوس کرتی اور آسمان سر پر اٹھا لیتی۔

ہر وقت اپنے گھر والوں سے بات اور شکوے  
کرنے کے لیے فون اس کے کان سے لگایا رہتا۔

حاشر جو اپنے گھر والوں سے بہت محبت کرتا تھا۔  
اس کے لیے یہ سب برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا جا رہا  
تھا۔ آج بھی جب حاشر کمرے میں آیا تو حنا حسب  
معمول شروع ہو گئی۔ نہ سلام، نہ دعا بس وہی شکایات۔

”اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا، آپ کی  
اماں اور آپ تو جیسے میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہیں۔ پتا  
نہیں میں نے اُن کا کیا بگاڑا ہے۔ ہر وقت وہ میری  
جاسوسی میں لگی رہتی ہیں یکب جاگتی ہوں، کیا کرتی  
ہیں ان کو سب پتا ہوتا ہے۔“

”پلیز اسٹاپ اٹ۔“ پہلے ہی میں آفس کے  
کام کی وجہ سے پریشان ہوں۔ کم سے کم تم تو میرا  
دماغ خراب نہ کرو۔“

”اچھا تو آپ کو صرف اپنا سکون عزیز ہے اور  
میں جو یہاں مل پل تڑپتی رہتی ہوں اس کا کیا۔ آپ  
کی ماں کیا کم بھی میرے لیے جواب آپ کی بہن بھی  
مصیبت بن کر روز نازل ہو جاتی ہے۔“

”بس کرو حنا میں تمہیں لاسٹ وارننگ دے  
رہا ہوں۔“

”ورنہ کیا کر لیں گے آپ؟ آپ کو میری ذرا  
فکر نہیں ہے؟“



"اگر تمہیں مجھ سے اور میرے گھر والوں سے اتنی ہی پرہیز ہیں تو بے شک اپنے گھر چلی جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر حاشر کمرے سے باہر چلا گیا، حنا نے فوراً بیک نکالا اور فون پر ہی روتے دھوتے ساری داستان اپنی ماں کو سنادی۔

ادھر سے اُسے فوراً گھر چھوڑ دینے کا مشورہ مل گیا۔ حاشر کو خبر تھ ہوئی جب باہر ڈرائیور اُسے لینے آ گیا۔ وہ بڑا سوٹ کیس چھینتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔

"یہ کیا کر رہی ہو حنا! یہ پاگل پن کرنے کی ضرورت نہیں ہے میری بات سنو۔"

"اب آپ کو جو بات کرنی ہے وہ مجھ سے نہیں میرے گھر والوں سے کرنا۔" حاشر نے اسے روکنے کی کوشش کی پر وہ اتنا کہہ کر چلی گئی۔ حنا کے گھر پہنچنے ہی جیسے کہرام مچ گیا۔

سارے خاندان میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ محض دو ماہ پہلے ہونے والی شادی اچانک یہ موڑ اختیار کرے گی۔ حنا اور اس کے گھر والوں نے تو اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا تو یقین تھا کہ حاشر اس سے پناہ محبت کرتا ہے اس لیے وہ زیادہ دن اس کی دوری برداشت نہیں کر پائے گا اور بھاگا بھاگا اُسے لینے آ جائے گا۔ یہی وہ طریقہ تھا جس سے بدلے میں وہ اپنے سارے ناجائز مطالبات منوا سکتی تھی اور ادھر حاشر پہلے ہی حنا کے روئے اور بچنے سے تنگ تھا اور اپنے گھر والوں کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو راضی نہیں تھا۔

اپنے گھر والوں کے اصرار پر اُس نے حنا کے گھر والوں سے بات کرنے کی ہانی بھری مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ حنا تک گھر نہیں جائے گی جب تک اُسے الگ گھر لے کر نہیں دیا جائے گا۔

اس ساری ضد کو مہینہ ہونے کو آیا تھا پر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل رہا تھا۔ حاشر کے والدین نے

اُسے حنا کے گھر والوں کا مطالبہ ماننے پر مجبور کیا مگر ایسا کرنے کے لیے راضی نہیں تھا ادھر جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے۔

حنا کو تشویش اور دوسو سے گھیر رہے تھے ایک بار تو اس نے سوچا کہ وہ خود ہی چلی جاتی ہے یہاں کی ماں نے اُسے روک دیا کہ اب حنا کا اس طرح جانا اس کی انا پر نہیں لگنے کے مترادف ہوگا، میسے کے آخر میں حنا کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ سارا دن سستی اور بے زاری میں گزر جاتا۔ جب طبیعت زیادہ بگڑی تو اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جہاں اُسے ایک خوشی کی خبر ملی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ حنا کے گھر والے بہت خوش ہوئے۔ حنا کا دل بھی اب مضبوط ہو گیا کیونکہ اب اس کا پلڑا بھاری تھا۔ اسے ایک طاقت ملی تھی ایک ایسی بات تھی جو حاشر کو جھکنے پر مجبور کر سکتی تھی جیسے تیسے اس خبر کو حاشر تک پہنچایا گیا۔

اس کے گھر والے جھومنے لگے آخر ان کے گھر اتنی بڑی خوشی جو آنے والی تھی۔ کسی طرح حاشر کو سمجھایا کہ اب تو ان کی بہو کو لے آئے اور بالا آخر حاشر کو ان کی بات ماننی پڑی اُس نے حنا کو کال کی کہ کو تو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اُس نے تو امید ہی چھوڑ دی تھی کہ حاشر اُسے لینے آئے گا۔

"کیسی ہو حنا؟"

"جی میں ٹھیک آپ سنائیں۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم اپنا سامان پیک کر لو۔"

"میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔"

"مگر وہ....."

"اگر مگر کچھ نہیں باقی کے معاملات ہم بعد میں طے کر لیں گے۔"

حنا نے پینلنگ شروع کر دی۔ اپنی ماں کے روکنے کے باوجود اُس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ آخر وہ بھی تو حاشر سے محبت کرتی تھی۔

"حنا بے وقوف نہ ہو۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاؤ میری جان ادیکھو ابھی صرف خوش خبری ملی ہے تو حاشر کتنا بے شک



ہو گیا ہے کسی کو وہ تھارے قدموں میں پڑا ہوگا، اگر تم ابھی  
 دھکیلا پڑ گئیں تو پھر ہر بار جہیں ہی جھٹکنا ہوگا اور کچھ بھی ہاتھ  
 نہیں آئے گا۔ اس کی ماں نے اس کی برین واشنگ کرنے  
 کی کوشش کی پر حنا کہاں کسی کی سننے والی تھی۔

ہم ہم ہم

حنا کو وہیں گھر آئے چھ ماہ ہونے والے تھے  
 سب اس کا شہزادیوں کی طرح خیال رکھتے مگر وہ بھی  
 کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ ہر وقت بدگمان  
 رہتی۔ الگ گھر لینے کا جنون اس کے سر پر سوار  
 رہتا۔ ہر قدم اپنی ماں کے مشورے سے اٹھاتی جس  
 کی وجہ سے وہ حنا کی نظروں سے گرتی جا رہی تھی۔  
 پھر وہ دن بھی آ گیا جب ان کے گھر ایک چاند سا  
 بیانا حمارٹ پیدا ہوا۔ حنا بھی خوش تھا کہ شاید اب حنا  
 کو محض آجائے اب وہ خود ماں بن گئی ہے تو شاید اسے  
 احساس ہو کہ ایک ماں کے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے  
 جذبات کیا ہوتے ہیں۔ ادھر حنا اور اس کی ماں کی  
 سوچوں اور آرزوؤں کو تو جیسے پر لگ گئے۔

مگر حمارٹ چھ ماہ کا ہونے والا تھا۔ حنا اسے ہر  
 وقت سینے سے لگا کر رکھتی۔

اپنی ساس اور اکلوتی نند کو تو پاس بٹکنے بھی نہیں  
 دیتی تھی۔ مگر انہوں نے صبر کا مظاہرہ جاری رکھا۔ اپنی  
 بہو کی ہر بات برداشت کی اور حنا کو کالوں کا خبر تک  
 نہ ہونے دی کہ ان کے بیچ کوئی بدسلوکی پیدا نہ ہو۔

ایک دن حنا کے گھر والے اس کے گھر دعوت  
 پر آئے ہوئے تھے۔

خوب گہما گہمی کا ماحول تھا۔ حنا کی ماں نے  
 اپنے پوتے کو اٹھایا اور خوب سارا پیار کیا۔ حنا کی نظر ان  
 پر پڑ گئی اس نے تو نہ آؤ دیکھنا نہ آؤ اور شروع ہو گئی۔

"گنی بار کہا ہے آپ کو میرے بیٹے سے دور رہا  
 کریں۔ میں اس پر آپ کی نحوست کا سایہ پڑنے نہیں  
 دینا چاہتی۔ اپنے بیٹے کے کان بھر بھر کر تو اسے میرے

خلاف کر رہی ہو ہیں اب میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئی  
 ہیں۔" ابھی حنا یہ سب بولتے ہوئے حمارٹ کو ان سے

بھین رہی تھی کہ حنا جو یہ قیاس دیکھ رہا تھا۔ قریب آیا  
 اور حنا کے منہ پر ایک زوردار پھپر سید کر دیا جس پر اس  
 کے گھر والے آگ بگولا ہو گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک کمرہ ام بن گیا۔

"میں ابھی اپنی بیٹی کو لے کر چلی جاؤں گی۔ تم  
 لوگ اس کے قابل ہی نہیں ہو یا تو تم ابھی۔ اسی وقت  
 حنا کو الگ رکھنے کا وعدہ کر دیا پھر اسے طلاق دے دو۔"

حنا غصے اور جذبات میں تھا اس نے کہہ دیا۔  
 "جا میں سنبھالیں اپنی بیٹی کو میں اسے طلاق دیتا  
 ہوں۔ ابھی حنا کا اتنا کہنا تھا کہ اس کی ماں نے اس کے  
 منہ پر ہاتھ رکھ کر اگلے الفاظ نکلنے سے روک دیا۔ پورے  
 کمرے میں سناٹا چھا گیا حنا تو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

اس کے گھر والے حنا کو لے کر گھر آ گئے۔ ان  
 کی بلا وجہ کی ضد نے سب پر باد کر دیا سالوں گزر گئے  
 پر نہ حنا گھر گئی اور نہ وہ دو طلاقیں آئی۔

یوں ایک ہنسا بستا گھرانا ضد کی نظر ہو گیا۔ یہ  
 ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ ماں میں  
 اپنی بیٹیوں کی شادی تو کر دیتی ہیں مگر انہیں ان کے  
 گھر میں بسنے نہیں دیتیں ہر وقت ان کے دل میں  
 نفرت کے بیج بوئی رہتی ہیں اور حنا جیسی بے وقوف  
 لڑکیاں جانے انجانے اپنی زندگی برباد کر لیتی ہیں۔

آج حمارٹ چھ سال کا مگر انتہائی بھوک اور احساس  
 کسری کا شکار ہے حنا بھی نفسیاتی مرید بن گئی تھی، جنتی بھی  
 کیوں نہ، ہر وقت سب کے طعنے سنا کرتی تھی اب تو اس  
 کے گھر والے بھی اس سے تنگ آ گئے تھے۔ اس کی خوب  
 صورتی، ڈگریاں سب اس کے لیے بے کار تھیں۔

حنا نے بھی دل پر پتھر رکھ کر دوسری شادی کر  
 لی اور اب اس نے ایک مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی  
 سے شادی کی تھی۔ وہ باقاعدگی سے حمارٹ کے لیے  
 خرچا بھیجتا پر حنا کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ  
 نہیں تھی اور نہ ہی کسی قسم کی منجائش۔





# حالاتِ دل

جلدی کرو۔“

وہ دروازہ بند کر کے گئیں تو ہاتھ میں پکڑے چار پائی پر ڈال کر وہ پھر وہیں بیٹھ گئی۔ سروسوں رنگ جوڑے پر ہاتھ پھیرتی وہ تھیں تھی کہ اس نے بہن کے بجائے سبیلی کو کھیل بلایا۔ دل میں کہیں چور دروازہ کھلنے لگا تھا۔

☆☆☆

شہزاد اس کی سبیلی کا تاپا زاد تھا۔ ایک دن میرا کے دروازے پر رخصت لیتے اس سے سامنا ہوا تھا۔ یہ اتنی عام سی بات تھی کہ اس نے دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ قریباً کوئی ڈیڑھ ماہ بعد اسے اس حوالے کے ساتھ کال موصول ہوئی۔ سادہ لہجے میں ہوتا ہوا کبھی کبھار بات کرنے کی خواہش لے لے ہوئے تھا۔ اسے سیر پر حیرت تھی کہ اس نے اس کا نمبر اسے دے کیوں دیا۔ اس کے بعد اس کا بھی فون تو نہیں آیا البتہ پیغام آتے تھے۔ معنوی گہرائی لیے اشعار جو ایک بار تو دل سمندر میں طوفان اٹھا دیں۔ سامنے اگر کبھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی تو اسے منع نہیں کیا تھا ان پیغامات سے۔ دل میں عجیب عجیب خواہشیں سر اٹھاتی تھیں پر اس کا دل چھپے تعلقات سے ڈرتا بھی تھا۔ خود وہ اصرار نہیں کرتا تھا بات پر

لیکن اس کے اشعار کا چٹاؤ اکساتا تھا۔ وہی آج پر اس کے جذبات گر ماتا کبھی وہ سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ جس ملاقات کا اس نے حوالہ دیا تھا صبا کے ذہن میں اس کا سیاق و سباق تو تھا پر خود وہ نہیں۔ اب اگر وہ صبا کے پاس سے بھی گزر جاتا تو وہ اسے پہچان نہ پاتی اس لیے خیالی بے رخی سی شبیہ ابھرا بھر کر معدوم ہو جاتی۔

کچھ بہت سی لڑکیوں کی طرح وہ بھی بچپن میں اپنے پھوپھی زاد سے منسوب ہو گئی تھی۔ اس لیے بھی اس معاملے میں ڈری ہوئی تھی۔ اب پھوپھی بڑا تھیں تو آغا فانا اس کی شادی کی تاریخ رکھی تھی۔ محض اکیس دن..... جس میں سے انہیں تکرر

ہاتھ میں پکڑے موبائل پر رومن میں لکھا پیغام اس نے اتنی بار پڑھا تھا کہ حروف کے ساتھ ساتھ بھیجے گئے وقت کے منٹ اور سیکنڈ تک اسے ازبر ہو گئے تھے۔

”رات بارہ بجے تک جب چاہو صرف پندرہ منٹ کے لیے چھوٹی گلی کے کونے پر آ جانا۔ گزرے سات ماہ میرے کردار کی گواہی کے لیے کافی ہوں گے۔“

اس کی نظر ایک بار پھر اس پیغام پر تھی۔ دفعتاً دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ فون والا ہاتھ اس نے دوپٹے کے پتے تلے کر لیا تھا۔

”صبا..... ابھی تک تم کپڑے نہیں بدل سکیں۔ تھوڑی دیر میں سسپنڈ تمہارا پوچھنے لگیں گے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔“ یہ گئی تھی اس کی بڑی بہن۔

آج صبا کی مہندی کی تقریب تھی۔ عین مایوں والے دن اسی بہن کے سر کی وفات کی وجہ سے مایوں کی رسم نہیں ہو سکی تھی اس لیے آج اسے پیلا جوڑا پہننا تھا۔

”باجی بس جارہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کپڑے اٹھا لیے۔

”جلدی کرو۔ پھر میں ارم کو بھیجتی ہوں تمہیں ذرا پھولوں کے کہنے پہنادے گی۔“ مصروف انداز میں کہتی۔ وہ دروازہ کی طرف بڑھیں تو جھجک کر اس نے آواز دی۔ ”باجی اسام کو بیچ دینا۔ وہی تیار کر دے گی مجھے۔“

”اچھا اچھا..... اسے ہی بیچ دوں گی بس تم



”اس فون سے سم نکال کر توڑ کر پھینک دو میں  
کپڑے بدل کر آئی۔“ ایک لمحے میں فیملہ کر کے  
فون اسماء کو پکڑا کر دوواش روم میں مرس گئی۔

باپ کی عزت، ماں کی تربیت، بہنوں کی محبت  
اور بھائی کا مان۔۔۔ ایک پندرہ منٹ کی خاطر وہ ان  
سب کی قربانی نہیں دے سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ گھر کے آئین میں سگی ساتھیوں  
کے بیچ پوری عزت کے ساتھ بیٹھی باتوں پر حسانی  
نقش و نگار بنوا رہی تھی اور چھوٹی گلی کے کونے پر بیٹھا  
شہزاد مسلسل اس کے بند نمبر پر فون کرنے کے بعد  
ایک اور نمبر ملا کر کہہ رہا تھا ”گاڑی واپس لے جاؤ لگتا  
ہے از گئی چڑیا۔ دیکھنے میں تو بڑی سیدھی لگتی تھی۔“

ایک گندی گالی دے کر ادھ جلا سگریٹ پھینک  
کر کپڑے جھاڑتا اٹھ کر وہ اندر حیرے میں گم ہو  
گیا۔ چند قدم دور صبا کے انتظار میں کھڑی گاڑی بھی  
اسے لیے بغیر واپسی کا سفر شروع کر چکی تھی۔

☆

آج بیسواں دن تھا۔ شہزاد کو میرا سے ہی اس کی  
شادی کا پتا چلا تھا۔ تب سے وہ اس سے مسلسل بات  
کرنے کی کوشش میں تھا۔ وقت نکالنا تو پہلے بھی  
آسان نہیں تھا اور اب تو گھر مہمانوں سے بھرا پڑا  
تھا۔ جب اسماء کو راز دار بنا کر اس نے ایک کال کا  
وقت چرایا تھا۔

”میں نے کبھی بلند و بانگ دعوے نہیں کیے  
کیونکہ میں اپنی حیثیت جانتا ہوں۔ اس کے باوجود

دل کج فہم کے کہنے پر ایک خواہش آپ کے سامنے  
رکھ رہا ہوں۔ سرخ پھول تو قسمت والوں کو ملتے ہیں  
میں بس ایک بار اپنی قسمت میں نہ لکھے جانے زرد  
پھول کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں شگفتگی  
اور اہتجاج تھی۔ اس کے لفظوں کا محتاط چٹاؤ۔۔۔ وہ سوچ  
میں پڑ گئی تھی۔ سات ماہ میں اس نے کبھی کوئی نازیبا  
بات نہیں کی تھی۔ کبھی وقت بے وقت فون کر کے  
بات کرنے کے لیے جھگ نہیں کیا تھا۔ کبھی براہ  
راست مخاطب کر کے کوئی پیغام نہیں لکھا تھا۔ وہ  
عزت کہتا نہیں کرتا تھا۔ سلجھے ہوئے کردار کے اس  
لڑکے کی ایک آخری خواہش پوری کرنے میں جانا  
ہی کیا ہے۔۔۔ وہ جانتی تھی اتنی دیر کے لیے پارلر کے  
بہانے یا چھپ کر بھی جایا جاسکتا تھا لیکن مسئلہ  
جانے کا نہیں تھا۔ مسئلہ تو اس کا اپنا تھا۔ پندرہ منٹ  
کے لیے انیس سال کی تربیت کو اٹھا رکھنے کے لیے  
اسے کوئی طاق نہیں مل رہا تھا۔

جب اسماء اندر آئی وہ اپنے دھیان میں گم تھی۔  
”تو یہ ہے عکسی لڑکی ابھی تک ایسے ہی بیٹھی  
ہو۔“ پھولوں کے گہنے رکھ کر وہ اس کے برابر میں بیٹھ  
گئی۔

”اسماء۔۔۔۔۔“ گہری نیند سے جاگنے جیسا خمار  
لہجے میں سموائے اس نے اسماء کو پکارا۔ اس کی سنجیدگی  
اور بھاری آواز سے لگ رہا تھا وہ روتی رہی ہے۔  
اسماء نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جن میں کسی  
برسات کا ذکر نہیں تھا۔





# آوازِ سیر

بات چھوڑ کر ایک جملہ پکڑا اور بے سرو پا بولنا شروع کر دیا۔

فری باجی عمر میں اس سے محض دو سال بڑی تھیں۔ سارا بچپن تو ”فری کو لگاؤ تری“، ”فری کچرے میں گر پڑی“ کا گما کر چراتے اور لڑتے جھگڑتے گزارا تھا۔ وہ تو انٹر کے فوراً بعد جب ای نے فری کی شادی کر دی تو اسے سختی سے باجی بولنے کی تلقین کی۔ باجی بولنا تو اس نے شروع کر دیا لیکن آپ جناب والی عزت نہ دے سکا۔

”فضول ہی بولنا ہمیشہ، میری ناک موٹی ہے اور خود تو جیسے وحید مراد ہو۔“ باجی نے آگ بگولا ہو کر ہاتھ میں پکڑے پکڑے بچے۔

”وحید مراد تو انعام بھائی کے زمانے کی باتیں ہیں۔ ہمارا مقابلہ تو فواد خان، دانش تیمور اور حمزہ عباسی سے کرو۔“ اس نے پھر بات اڑائی۔ اس نازک وقت میں اس کی غیر سنجیدگی فری کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ غصے میں انھیں تو ہاتھ نہ کیے ہوئے کپڑوں کو لگا اور سارا ڈھیر مسہری سے لڑھک کر زمین پر آ رہا۔ وہ اپنی آنکھوں میں آتی نمی چھپائے چلی گئی تھیں۔

انہیں منانے یا چپ کرانے کے لیے وہ کیا

آواز دیتا، حسرت بھری نظریں تو نیچے بکھرے کپڑوں پر لگی تھیں۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ اب یہ سب یقیناً اسے ہی سیننا تھا۔

وہ اسی لیے ادھر ادھر کی بات کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کی حساس بہن کا دل بھرا ہوا ہو گا لیکن وہی ہوا

”بات ہو گئی ہے میری، اب بس شنفنگ ہو تو میں بھی سکون سے جاؤں۔ تم تمیز سے رہنا دہاں، میری ناک مت کٹوا دینا نانی کے سامنے۔“ کپڑے تہ لگاتے فری باجی بول رہی تھیں۔ جلے کے آخر تک آتے آتے ہاتھ رک گئے۔ لیکن زبان بدستور چلتی رہی۔

ای سچی کہتی تھیں کہ ”فری کی زبان کی رفتار سے ہاتھ بھی چلنے لگ جائیں تو سب کام وقت پر بلکہ وقت سے بہت پہلے ہو جائیں۔“ شہبیر نے کینہ تو ز نظروں سے فری کے رکتے ہاتھوں کو دیکھا۔

”تمہاری ناک کچھ کٹ ہی جائے تو اچھا ہے۔ اتنی موٹی ناک ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں پانی پیئے وقت گلاس بھی نظر نہیں آتا ہو گا۔“ اس نے اصل





جس کا ڈر تھا۔ اب ملکہ جذبات کے مارل ہونے تک سب کچھ اسے ہی سہیٹا تھا۔  
”ہائے امی جی، آپ ہوتیں تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

تیزی سے ہاتھ چلاتے اس کے دل سے دہائی نکلی تھی۔ وہ شروع سے اپنا غم، ہنسی میں چھپانے کا عادی تھا۔

☆☆☆

”شانی میرا بچہ، جاؤ اوپر سے اپنا سارا سامان لے آؤ۔ آج فری ماسی کے ساتھ گھر صاف کرواری تھی تو کتنی چیزیں دے کر گئی ہے۔“  
نانی نے پڑھنے میں محوشانزے کو دلار سے مخاطب کیا۔ وہ جب بھی پڑھ رہی ہوتی، انہیں اس پر بے تحاشا پیار آتا۔ یہ اور بات کہ ایسا موقع کم ہی آتا۔

”اوپر کیا سامان ہے میرا، صاف ستھرا گھر ہے۔ دو، چار چنگلیں بچوں کی ہوں گی۔ وہ دے گئیں تو کیا احسان کیا۔“ شانی نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔  
”دو، چار چنگلیں، پانچ، سات گیندیں، بلے، نوکر لگے ہیں یہاں سب جو اوپر سے نیچے لا کر دیتے رہیں گے سامان۔ تمہیں ضرورت کیا تھی محلے بھر کے بچوں کو گھر میں گھسانے کی۔“

نانی کا دلار ختم ہوا، وہ اپنے اصلی موڈ میں آگئیں۔ بات ان کی بھی درست تھی۔ اوپر والا حصہ کرائے پر ہی رہتا تھا۔ اب اگر کچھ عرصے سے خالی بھی تھا تو بچوں کو چنگ اڑانے یا کھیلنے کے لیے چھت پر جانے کی اجازت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر ست ایسی جا کر دیکھا جھی نہیں کہ کیا، کیا اوپر چھوڑ آئی ہے۔

فری کا سسرال مدتوں سے ان کا پڑوسی تھا سو اچھی میل ملاقات تھی۔ کل ماسی کے ساتھ دو موڈھے، چائے کا کپ، گلاس تین چیزیں فری لائی اور کہہ گئی کہ ہم اب شفٹ ہو جائیں گے، آپ باقی

سامان اٹھوالیں۔ وہ تو شرمندہ ہی ہو گئیں جب کمر دے دیا ہے تو وہ خالی ہی ہونا چاہیے تھا۔  
”اچھا، ابھی مجھے پڑھنے دیں۔ رات کو لے آؤں گی۔“

شانی نے نانی کی کمزوری پکڑی اور انہماک سے کتابوں پر جھک گئی۔ گویا آج ہی سب گھول کر لپی جائے گی۔ اسے اندازہ تھا کہ ابھی اوپر گئی تو سامان میں رسالوں اور ناولوں کی تعداد ان کو طیش دلا دے گی۔ اس کا ڈائجسٹ پڑھنا انہیں پسند نہیں تھا۔ اس کے رونے، دھونے پر اجازت تو دے دی لیکن اب بھی ڈائجسٹ دیکھ کر ان کا مزاج برہم ہو جاتا تھا۔ نانی نے غصے سے اسے گھورا اور کچھ کہنے سے گریز ہی کیا۔ شاید اسی بہانے وہ کچھ پڑھ لے۔ چیزوں کا کیا تھا، آتی جاتیں۔

☆☆☆

فری نے میٹرک کیا تھا تب ابو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ابو کے انتقال سے ان کے چھوٹے سے گھرانے میں کبھی نہ پر ہونے والا خلا آ گیا تھا۔ ابو بہت محبت کرنے والے اور خیال رکھنے والے باپ اور شوہر تھے۔ ان کی جدائی سے جہاں فری بہت زور درخ ہو گئی تو امی وہمی ہو گئی تھیں۔ شہیر خود لاپرواہ اور اپنی پڑھائی سے دور ہو گیا تھا۔ ابو اسے خود پڑھاتے تھے، ان کے جانے کے بعد اس کا کتابیں کھولنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

دو خیال میں کوئی تھا نہیں۔ نہ خیال والے معاشی طور پر ان سے کم تھے لیکن حتی المقدور خیال رکھتے۔ ایک بڑا سا گھر تھا۔ ماموں نے بھاگ دوڑ کر کے ابو کی پنشن جاری کروادی تھی۔ مالی مسائل نہیں تھے لیکن احساس تحفظ کہیں کھو گیا تھا۔ امی کو کمر میں مردکی کمی شدت سے محسوس ہوتی سو اپنے بچے سے بیٹی بیاہ کر انہیں ساتھ ہی رکھ لیا۔

بیٹی بھیجنے کے بجائے انہیں پلا پلایا جو ان مثال گیا جو ہاتھوں سے نکلتے شہیر پر بھی نظر رکھ سکا اور کمر



کے دیگر کام بھی کرتا۔

ماسوں، مائی کو کیا اعتراض ہوتا تھا۔ ماشاء اللہ پانچ بیٹے اور چھوٹا سا گھر، شادی کے بعد مسئلہ تو ہوتا ہی تھا۔ چلو بہن کے کام آئے۔ اعتراض اگر کسی کو تھا تو وہ تھا شہیر احمد، دلہن کا اکلوتا بھائی۔ ایسی نازک مزاج، بات بات پر لڑنے اور رونے والی باتونی بہن کی رخصتی کے بجائے ایک عدد درعب دار، سنجیدہ اور ذمہ دار بھائی گھر آ گئے۔

وہ اس کی پیچرز سے ملتے، بیک چیک کرتے اور دوستوں پر نظر رکھتے۔ گا ہے لگا ہے اسے ماں، بہن سے قریب کرنے اور عملی زندگی میں آنے کے لیے نصیحتیں بھی کرتے رہتے۔ درحقیقت انعام بھائی ان کے لیے تحفہ خداوندی ہی ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں پھوپھو کو بیٹا اور شہیر کو بڑا بھائی بن کر دکھایا تھا۔

انعام بھائی کا سلجھا ہوا روپہ ہی تھا کہ امی کو یکا یک اپنی نازک مزاج بیٹی کے خخرے زیادہ محسوس ہونے لگے۔ وہ فری کو بات بات پر ٹوکتیں، شوہر کا خیال رکھنے کی نصیحت کرتیں، اس کی ماں کے بجائے ماس ہی لگتیں۔

فائدہ یہاں بھی فری باجی کا ہوا، انعام بھائی پھوپھو کو ماں کی جگہ سمجھتے اور اپنی محبوب شریک حیات کو ماس کے ظلم سے بچا لیتے۔

فری باجی شاید وہ واحد فرد تھیں، جن کی الٹی، سیدھی ضد بھی وہ آرام سے برداشت کرتے۔ ان کے سامنے شہیر کی بھی مجال نہ تھی کہ فری باجی کو کچھ کہتا۔ زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔ فری باجی کے دو ننھے بچے ان کی زندگی کی رونق بڑھانے آ گئے تھے۔

شہیر بھی اب یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر کے کچھ می مرے میں عملی زندگی میں آنے والا تھا۔ گھر کی طرف سے مطمئن ہو کر انعام بھائی نے مستقبل کا سوچ کر ملک سے باہر نوکری کا فیصلہ کیا تھا۔ پہلے شہیر

چھوٹا تھا لیکن اب وہ کچھ دار ہو چکا تھا۔ پھوپھو کے اسکے بہن کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ باہر سیٹل ہونا چاہتے تھے۔

انسان سوچتا چھوٹا ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ انعام بھائی ابھی گئے بھی نہ تھے کہ امی کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے نے کتنے ہی دن انہیں کچھ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ پھر انعام بھائی کو ایک بہت اچھی آفر آ گئی تو وہ سعودیہ چلے گئے۔ اب تو فری باجی اور بچوں کے کاغذات بھی بن کر آ گئے تھے۔

شہیر کا آخری سمسٹر ابھی باقی تھا۔ امی کے انتقال کے بعد پنشن کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ سوٹے یہ پایا کہ اس گھر کو کرائے پر چڑھا کر شہیر چھوٹے سے گھر میں چلا جائے۔ بڑے گھر کو سنبھالنے کا مسئلہ بھی نہیں ہوگا اور آمدنی کا ذریعہ بھی ہو جائے گا۔ فری باجی نے ماسوں کی کٹی میں ہی اس کے لیے ایک گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ انعام بھائی کے پاس جانے کی خوشی اپنی جگہ لیکن امی کی یاد، اپنے گھر، بھائی اور ملک سے دوری کا خیال فری باجی کو جذباتی کیے دے رہا تھا۔

آج فری باجی زیور اور قرآن پاک ماسوں کے گھر لے گئی تھیں۔ گھر چھوڑنے کا خیال انہیں روہانسا کر رہا تھا سو واپس آ کر آنسو چھپانے کے لیے کچن کے کام میں لگ گئیں۔

”کیا ہے باجی، بچوں کو کیوں چھوڑ آئیں دادی کے پاس۔ کتنا سنا ہوا رہا ہے گھر میں۔“ شہیر بولتا ہوا کچن میں داخل ہوا، وہ فری باجی کا موڈ ٹھیک کرنا چاہ رہا تھا۔ انہوں نے سلاڈ کاٹتے مڑ کر اسے دیکھا۔

”ماسوں بہت اداس ہو رہے تھے کہ پھر جانے کب ملاقات ہو، انہوں نے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیا۔“ ان کا لہجہ اداس تھا۔ شہیر نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا۔ اس نے غلط موضوع کا انتخاب کر لیا تھا، پھر رو پڑتیں تو الگ کہانی شروع ہو جاتی۔

”کیا ہمارے ہو، بڑی خوشبو آ رہی ہے۔“



بات بدلنے کے لیے وہ عہدے سے ہٹا دیا۔  
 کرتے آگے آیا۔

”برائی بتائی ہے، بعد میں کون بنا کر دے گا۔“ فری باجی نے خوش گوار لہجے میں کہنا چاہا لیکن جان بھر دیں آ کر ٹوٹی۔

”مارے بازاری کھانے زندہ باد، شکر ہے اب میں بے فکری سے جودل چاہے کھاؤں گا۔ کوئی ٹوکے گا نہیں۔“ اس نے بٹاشت سے کہا۔

”بیٹا چار دن کھاؤ گے تا پھر قدر آجائے گی مگر کے جڑو کھانوں کی۔“ فری باجی نے بھی اپنا مزاج بدلنے کی دانستہ کوشش کی۔

”اچھا ہے، پھر میں ڈھونڈ لوں گا کھانا بنا کر دینے والی، اب تو انعام بھائی بھی نہیں، جو مرضی کرو۔“ اس نے شرارت سے کہا۔

”اے خبردار جو کچھ الزا سیدھا کیا۔ دو پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ شبیر کو کہنا، دھیان سے پڑھے، فالٹو مشغلوں میں وقت ضائع نہ کرے بلکہ اپنی فیلڈ میں انٹرن شپ کرے اور جاب ڈھونڈے۔“ باجی کی بات اسے تباہی۔

”ان کا بس چلے تو دو، چار جاسوس چھوڑ دیں میرے پیچھے۔ میں کہاں وقت ضائع کرتا ہوں۔“

انعام بھائی شروع سے نہ صرف اس کے چال چلن پر کڑی نظر رکھتے تھے بلکہ استثنائی نتائج بھی باریک بینی سے چیک کرتے تھے۔ ان کی سختی ہی تھی کہ عمران سیریز، مختلف میگزین اور ڈائجسٹ پڑھنے کے باوجود اس کا رزلٹ بہت اچھا آتا۔ پڑھتے، پڑھتے اسے لکھنے کا بھی شوق ہو گیا لیکن اس کے لکھنے کا فائنل بھی انہیں وقت کا زیاں ہی لگتا۔

وہ کافی عرصے سے مختلف اخبار اور رسالوں میں لکھتا تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرینسٹری پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔

وہ کافی عرصے سے مختلف اخبار اور رسالوں میں لکھتا تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرینسٹری پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔

”تمہارے بھگے کے لیے تو کچھ تو کر رہی ڈھونڈو، تو نہ دلوں تو تمہارے شہر میں قاتل باغ ہوں۔“ باجی نے فوراً اپنے میاں کی طرف دھمکی کی۔

”بھئی، تمہیں کے مل بھر، سیدھا ایس سی کے میرے سر ہے اور کتنا تو نہ دلوں ہوں۔“ وہ تڑپ کر بولا۔

”مل بھرنے کے لیے پیسے کمانے ہوتے ملتے اس کی ہی ممکن تھی۔ شرمندہ کرنے نہ پڑا کوشش کی لیکن اس کی ڈھونڈی ایسے موقعوں پر بہت کام آتی۔

”پیسہ تو بیوی کے نصیب سے ملے آنے والی اپنا رزق لے کر آئے گی، میں بھی اس کے ساتھ دو، چار نوالے لے لوں گا۔“ اس نے تندرے سے کہا تھا لیکن لیوں پر کھینچی شرارتی مسکراہٹ دیکھ کر فری باجی بھی اس میں پھر یاد آنے پر نصیحت کی۔

”صبح صبح شفیق کرتی ہے ہم نے۔ کھانا کھا کر جلدی سو جانا۔“ وہ سر ہٹا کر رو گیا۔

بڑے ٹرک میں بھر کر سارا سامان اکٹھا ہی لے گیا تھا۔ وہ سامان لے کر نئے گھر آ گیا تا کہ اپنی عمرانی میں فرنیچر مزدوروں سے درست جگہ پر رکھوا لے۔ بعد میں سیننگ کے لیے خوار ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ فری کو ابھی ماموں کے گھر چھوڑ دیا تا کہ بچوں کو کھانا کھلا کر آجائے اور کارشن کھول کھول کر الماری میں کپڑے اور کچن میں برتن رکھ سکے۔

”گھر تو اچھا ہے، اب مالک مکان بھی اچھے نکلیں۔“ سامان سیٹ کرواتے اس نے سوچا تھا۔ ایک بار رات میں وہ فری کے ساتھ گھر دیکھ گیا تھا لیکن مالک مکان سے اس کا کوئی تعارف نہ تھا۔ اسی کامیک اور فری باجی کا سسرال اسی محلے میں تھا۔ یہ لوگ ان کے پرانے جاننے والے تھے لیکن اپنی فطری لاپرواہی کے باعث شبیر کا ان سے کوئی

تعارف نہ تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرینسٹری پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔

وہ کافی عرصے سے مختلف اخبار اور رسالوں میں لکھتا تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرینسٹری پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔

وہ کافی عرصے سے مختلف اخبار اور رسالوں میں لکھتا تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرینسٹری پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔

وہ کافی عرصے سے مختلف اخبار اور رسالوں میں لکھتا تھا۔ اس کی خواہش بھی ماس کمیونیکیشن پڑھنے کی تھی لیکن انعام بھائی کے زور دینے پر ہائیڈرینسٹری پڑھنی پڑی۔ اب بھی ان کی بے وقت نصیحت اسے بے زار کرتی۔



ان کے ایک دم بھڑکنے پر شہیر حیران رہ گیا۔  
لیکن بزرگ تھیں سو بات پر فوراً کیے نامعالمہ رفع دین  
کرنے کی نیت سے بولا۔

”نوکر والی کیا بات ہے نانی۔ ہم بڑی ہیں،  
دوستی کی غرض سے کہہ دیا تھا۔ آپ کو نہیں پسند تو  
جانے دیں۔“

”تم تو حد سے بڑھ رہے ہو بدتمیز، ہماری  
لڑکیاں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی پھر تم۔“ وہ  
غضب ناک ہوئیں اور ان کا جملہ سن کر شہیر حیران  
اور سمجھ کر شرم سار ہو گیا۔

”سوری نانی میں سمجھا شانی کوئی لڑکا ہے۔“

”بس کر دو اب، ہزار باتیں بنالیں، ایک کام  
نہ ہوا۔ خبردار جو مجھے آئندہ نانی کہا۔“

نانی کا بارہ ایسے ہی چڑھتا تھا۔ وہ دروازہ اس  
کے منہ پر بند کر کے چلی گئیں۔ شہیر حیران پریشان  
کھڑا سوچتا رہا۔

”نئے گھر کی تو ابتداء ہی بری ہوئی ہے، اب  
آگے کیا ہوگا۔“

☆☆☆

”تم تو میری اپنی بیٹی ہو فری، معذرت کی کیا  
بات ہے لیکن اسے بھی بات کرنے کی کچھ تو عقل  
ہونی چاہیے۔“ پیار سے برابر بیٹھی فری کے ہاتھ پر  
ہاتھ رکھتے نانی نے بولتے بولتے ترچھی نظروں سے  
شہیر کو گھورا۔

ایک گھر میں ساتھ رہتا تھا۔ غلط فہمی فوراً رفع  
کرنے کے لیے ہی فری باجی، شہیر کو لیے نانی کی  
خدمت میں حاضر ہوئی تھیں۔ نانی کے مزاج کے بھی  
کیا ہی کہنے۔ پیار سے بیٹی، بیٹی کرتے وہ شہیر کو  
دیکھتیں تو لب و لہجہ و انداز ہی بدل جاتا۔

لمحے کی چوتھائی میں بدلنے والے ان کے

تاثرات شہیر کو حیران کئے دے رہے تھے۔

”بشری انصاری بھی نانی سے ہی سیکھتی ہوں  
گی۔“ مرعوبیت کے عالم میں اس نے سوچا۔

نانی کے دجگ انداز کے سامنے اس کی بیٹی کی

تعارف نہ تھا۔ بس سامان اتراتے ہوئے گھر سے  
ایک بارہ، تیر سال کا لڑکا لکھنا نظر آیا تھا۔

”لڑکے سے سامان اترتا دیکھ کر نانی اماں کو  
کرائے داروں کی آمد کا علم ہو گیا۔“

شانزے کالج گئی ہوئی تھی۔ گھر میں ہوتی تو

اس وقت ضرور صلواتیں سنتی۔ وہ اوپر سے کچھ نہیں

لائی تھی۔ وہ میٹھیوں کی طرف کا دروازہ کھول کر خنجر

بیٹھ گئیں۔ کالی اٹھا شیخ کے بعد ایک خوب صورت

جوان مزدوروں کے ساتھ نیچے آیا تھا۔ وہ مزدوروں کو

فارغ کر کے پلٹا تو انہوں نے پیار سے آواز دی۔

”شہیر بیٹا، بات سننا۔“

اپنے نام کی پکار پر وہ چونک کر پلٹا۔ میٹھیوں

کی سائیڈ پر دروازہ جو پہلے بند تھا۔ اب کھلا تھا۔ ایک

عمر رسیدہ خاتون مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھیں۔

”السلام علیکم آئی!“ وہ ان کے سامنے آیا۔

”علیکم السلام بیٹا، مجھے آئی کہلوانا نہیں پسند

ہے۔ تم بھی سب کی طرح مجھے نانی ہی کہہ دیا کرو۔“

انہوں نے خوش اخلاقی سے فرمائش کی، پھر مقصد پر

آئیں۔

”اوپر جو ہمارا سامان رکھا ہے، وہ یہاں چھوڑ

جاؤ۔“

”کیسا سامان۔“ وہ سمجھا نہیں تو بے اختیار

پوچھا۔

”وہ شانی کے بیٹ بال، کتابیں وغیرہ ہوں

گی۔“ سامان کا درست اندازہ نانی کو بھی نہیں تھا۔

مختصر فری کی بات ذہن میں تھی۔

”جی، جی یہ سامان تو ہے پچھلی گیلری میں رکھا

ہوا ہے، میں لانا ہوں بلکہ آپ شانی کو بھیج دیں۔

میرے ساتھ، میری کتابیں بھی سیٹ کروادے۔“

اس نے ان سے بڑھ کر خوش اخلاقی کا مظاہرہ

کیا لیکن نانی کو کرنٹ لگ گیا۔

”دماغ ٹھیک ہے۔ شانی کیوں تمہاری

کتابیں سیٹ کروائے۔ تمہارے باپ کی نوکر ہے۔“



طرح چلتی زبان خاموش تھی اور وہ نظریں جھکائے  
شرمندہ سا بیٹھا تھا۔ اس تمام قہے کے درمیان، وہ  
جسے شرم آئی چاہیے تھی۔ ان کی نو اسی شانزے عرف  
شانی وہ مزے سے بظاہر چہرہ جھکائے مصروف مگر  
مسکراتے ہوئے اس کی بے عزتی انجوائے کر رہی  
تھی۔

”اتنی عقل ہوتی تو وہاں اپنے گھر میں ہی رہ  
لیتا۔ اسی لیے یہاں آپ کے زیر سایہ چھوڑ رہی  
ہوں۔ آپ ہماری بزرگ ہیں۔ اگر کچھ غلط دیکھیں تو  
منع کریں۔ اس کی کیا مجال آگے سے چوں بھی  
کرے۔ تھوڑا نادان ہے لیکن بدتمیز نہیں میرا  
بھائی۔“ فری باجی نانی کے مقابل۔ آج اپنی  
ساری صلاحیتیں استعمال کر رہی تھیں۔ شہیر دل ہی  
دل میں کراوا تھا۔

”ایک اور دست شفقت؟ اللہ کسی کو جہنم نہ  
کرے۔ والدین نہ ہوں تو پورا زمانہ ہی تھانیدار بن  
جاتا ہے۔“ بظاہر توجہ سے سنتا وہ دل ہی دل میں اس  
کلاس کے جلد برخاست ہونے کی دعا مانگ رہا تھا۔  
ایک طرف رکھے تحت پر سلیقے سے دوپٹہ لیے  
شانی بیٹھی اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھی۔ بچی  
نظروں کی زد میں خوب صورت پاؤں تھے۔  
”لڑکی واقعی پیاری ہے۔“ نانی اور فری کی  
موجودگی کے باعث احتیاط سے اس نے پاؤں کا  
فرض انجام دیا۔ اب لڑکی خود سامنے بیٹھی تھی تو کیا  
دیکھتا بھی نہ؟

”اچھے گھر کا بچہ ہے، ماں کی تربیت تو بولتی ہی  
ہے بچا۔ تم بالکل بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں خود اس کا  
خیال رکھوں گی۔ کیا پڑھ رہے ہو تم؟“ آخر فری باجی  
کی محنت کام آئی، نانی نے قدرے نرم لہجے میں اس  
سے پوچھا۔ ایک دم مخاطب کیے جانے پر وہ چونکا۔  
نانی کو سمجھنے میں مشکل نہ، وسواسان الفاظ کا چناؤ کیا۔  
”سولہویں جماعت میں ہوں نانی۔“

”عقل بھی تمہاری سولہویں کے سن میں ہی رہ  
گئی، جانتی ہوں ماسٹرز کر رہے ہو۔ مضمون کیا ہے؟“

نانی نے بے اداری سے ہاتھ لے کر  
شرمندہ کیا۔ شانی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر سہا ہوا  
ہنسی روکی تھی۔ حسینہ کے سامنے اس بے عزتی  
نے منہ ہٹا کر جواب دیا تھا۔  
”بائیو کیمسٹری پڑھ رہا ہوں۔“

”چلو اچھی بات ہے، شانی کی پڑھائی میں مدد  
کر دینا بلکہ وقت مقرر کر لو تو روز آجانا۔“ نانی نے گہرا  
سکون کی سانس لی۔ اتنی حسین لڑکی کو ٹیوشن دینے  
کے خیال سے جہاں شہیر کے چہرے پر رونق اتری  
وہیں شانی کے ہونٹ بھیج گئے۔ اس نے ایک خاموش  
نظر نانی پر ڈالنے کے بعد، نظروں ہی نظروں میں  
شہیر کو جھسم کر دینے کی کوشش کی۔ یوں گھر میں نانی  
کے زیر سایہ ٹیوشن کا مطلب واقعی پڑھنا تھا۔ نہ یہ کہ  
یہاں رہنے آتا، نہ نانی کو یہ نادر خیال آتا۔

☆☆☆

فری باجی، انعام بھائی کے پاس چلی گئیں اور  
پچھلے وہ اکیلا رہ گیا۔ انعام بھائی کی تختی نے ایسا کوئی  
بے تکلف دوست بھی نہیں بنے دیا تھا۔ جس کے گھر  
جاسکا یا وہ اس سے ملنے آتا۔

ایک دن ماموں کے اصرار پر وہ ان کے گھر  
کھانا کھانے گیا لیکن پھر سہولت سے منع کر دیا۔ بہن  
کا سسرال تھا آخر، پھر بھابیوں سے تکلف بھی تھا۔  
اب دو دن سے وہ بازار سے کچھ لا کر کھا لیتا۔ ارادہ تھا  
کہ جلد ہی خود کچن میں اپنی کوکگ کے جوہر دکھائے  
گا لیکن ابھی تک ہمت نہیں ہوئی تھی۔

شہیر لا ابالی تھا۔ تفریح کے لیے دل میں کچھ بھی  
سوچ لیتا لیکن ہلکے کردار کا مالک نہ تھا۔ جب ہی اپنے  
نیچے والے گھر میں رہنے والی حسینہ کی خوب صورتی  
سے وقتی طور پر متاثر ہوا، پھر سب بھول گیا۔ ایسی نظر  
نانی کے گھر میں جانا یوں بھی شیر کی کچھار میں گھسنے کے  
برابر تھا۔

لیکن نانی جان کچھ نہیں بھولی تھیں۔ اپنے  
وقت میں میٹرک کیا تھا۔ اب ان کے خیال میں نانی  
نسل کو تو پی ایچ ڈی ہونا چاہیے تھا مگر یہاں نوا



برت سکیں اور فوراً مطلب کی بات پر آگئیں۔ کھانا انہوں نے شاید اپنے طور پر ٹیوشن کا معاوضہ ملے کیا تھا۔

شہیر واقعتاً بھوکا تھا۔ شدید بھوک میں گھر کے بنے کھانے کی آفر ایسی نہیں تھی کہ انکار کرتا۔ بیک میں رکھے سینڈویچ اپنی قسمت کو رو دتے رہ گئے اور شہیر نے ڈٹ کر تانی کے ہاتھ کا مزے دار شملہ مرچ قہر کھایا۔ اس دوران اندر سے آئی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی اکلوتی اسٹوڈنٹ بھی کالج سے آکر سو رہی ہے اور نیند کے اوقات میں اس جبری ٹیوشن کے لیے شہیر کی طرح بالکل تیار نہیں۔

تانی کے سامنے کس کی چلتی، سو کچھ دیر بعد سلیقے سے دوپٹا اوڑھے، نیند سے بند ہوئی آنکھوں کو زبردستی کھولتی، اپنے حسین چہرے پر بے زاری کے تاثرات لیے کتابیں اٹھائے شانی کی آمد ہوئی تھی۔ شہیر کا تھکا ہوا جسم و ذہن بھی کھانے کے بعد اب آرام کا طالب تھا لیکن تانی تین کپ بھاپ اڑائی جائے لیے اپنا کھانا رزق حلال کروانے سامنے بیٹھی تھیں۔ پہلا دن تھا، تعارف بھی نہیں تھا سو جھجک تھی، کچھ تھے بھی دونوں غنودگی میں سو کورس دیکھ کر اور شانی کی معلومات جانچ کر شہیر اٹھ گیا۔ اس نے ٹیوشن کا وقت رات کے کھانے سے پہلے کا طے کیا تھا۔ اس وقت وہ فارغ بھی ہوتا تھا پھر یہ کہ دوپہر میں تو ادھر ادھر سے کچھ بھی کھا لیتا، اس طرح رات میں اچھے مزے دار کھانے کا آسرا بھی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے کھانے سے پہلے کا وہ وقت تانی کی مصروفیت کا ہوتا تھا۔ وہ اس وقت ہی سالن بناتیں اور آٹا گوندھ کر روٹی ڈالتیں۔ صحن میں جہاں بیٹھ کر شہیر، شانزے کو پڑھاتا، وہیں سامنے کچن تھا۔ تانی جانے کے باوجود ان کے ساتھ نہیں بیٹھ پاتیں لیکن نظر پوری رکھتیں۔ اس بات کا اندازہ شہیر کو تب ہوا، جب وہ بہت محنت سے شانی کو کیمسٹری پڑھا رہا تھا اور وہ محویت سے سنتی سر ہلار ہی تھی۔

ماب پچاس سال بعد بھی میٹرک سے آگے پڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ شانی بہت ذہین تھی، جتنا پڑھتی اچھے نمبر لے آتی مگر لاپرواہی۔ اعلیٰ تعلیم اس کی ترجیحات میں کہیں نہیں تھی۔ اسے پڑھانے کے لیے بانی کو خود حیاں دینا پڑتا تھا۔

وہ گھر سے باہر جاتی تو بھی وہ پریشان رہتیں، گھر میں اچھا باعتبار ٹیوٹر بہت مہنگا پڑتا۔ اب فری نے جس اپنائیت سے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کر دئی تھی۔ اس موقع کو تانی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ تب ہی سہ پہر میں صحن میں ہی چلتی رہیں، ادھر شہیر اپنے دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوا ادھر انہوں نے صحن سے میزچیوں کا دروازہ کھولا۔ شہیر نے اچانک انہیں دیکھا تو سابقہ منظر یاد کر کے سلام کرتے چمچے گڑ بڑا گیا۔

”السلام علیکم آئی..... تانی..... آئی۔“ اسے فوری طور پر یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے تانی پکارنے کی رعایت حاصل ہے یا منسوخ ہو چکی ہے۔

”ولیکم السلام بیٹا، آؤ اندر آ جاؤ۔“ پرتیاک انداز میں اسے جواب دیتے انہوں نے کمال مہربانی سے اس کی بوکھلاہٹ نظر انداز کی اور اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس کا جواب سنے بغیر وہ خود صحن میں رکھے تخت کی طرف بڑھ گئیں تو انکار کے الفاظ شہیر کی زبان پر ہی رہ گئے، طوعاً و کرہاً وہ ان کے پیچھے چل دیا۔

”فری کیسی ہے؟ بچے سیٹ ہو گئے؟“ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

”جی، اللہ کا شکر ہے۔“ دل ہی دل میں حیران ہوتے اس نے جواب دیا تھا۔ اس کے حساب سے یہ تانی کا مزاج نہیں تھا۔

”کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟ ایسا ہے کہ میں کھانا لاتی ہوں، کھانا کھا کر پھر تم شانی کو پڑھا دینا۔ روز پڑھانے کا نام اپنی سہولت کے حساب سے سیٹ کر لو کھانا بھی نیچے ہی کھا لیتا۔“ وہ زیادہ دیر تکلف نہ



(الیکٹرونکلیکٹو) یعنی ازینڈنسی آف انامک لو  
ازیکٹ الیکٹرونز)  
بانی کو دور کمرے صرف الیکٹ کا لفظ سمجھ آیا  
تھا۔ اب اتنی انگریزی تو نی دی دیکھ کر ہی آ جاتی ہے  
کہ الیکٹیشن کشش کو کہتے ہیں لیکن یہ مونی سائنس  
کے مضمون میں کون سی کشش ہے، وہ فوراً لپکیں۔  
قل سے تو لا کا شریف، بلند کردار لگتا تھا پھر ان کی  
معصوم نوا سی کو کون سی پٹیاں پڑھا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ بن  
میں ابھی پاس آ کر بولیں۔  
”کیا کہہ رہے ہو؟“

”جی“ وہ دونوں چونکے تھے۔  
”ذرا دوبارہ سے اردو میں بولو بیٹا، مجھے سمجھ  
میں نہیں آیا تھا۔“ انہوں نے نرمی سے مسکرا کر کہا۔  
”کیا بولوں؟ میں نے تو آپ کو کچھ نہیں  
کہا۔“ شبیر نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔ حسب  
عادت بانی کا پارہ لمبے میں چڑھا۔  
”جو اسے گٹ پٹ کرتے پڑھا رہے ہو، وہ  
بولو۔“ انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔  
”الیکٹرونکلیکٹو یعنی کسی ایٹم کی الیکٹران کو کشش  
کرنے کی صلاحیت ہے، جس سے وہ الیکٹران جوڑا  
بناتا ہے۔ جتنی زیادہ الیکٹرونکلیکٹو یعنی کسی ایٹم کی  
ہوگی، اس کی الیکٹران کو کشش کرنے کی صلاحیت بھی  
اتنی زیادہ ہوگی۔“

شبیر اب کتاب سے دیکھتے ہوئے آہستہ  
آہستہ ترجمہ کرتا نہیں سنا رہا تھا۔  
بانی کو کوئی قابل اعتراض مواد نہیں ملا، شانی  
کے چہرے کی حیرت بھی بتا رہی تھی کہ سب ٹھیک تھا۔  
شبیر سے زیادہ انہیں اپنی بچی پر اعتماد تھا۔ دل ہی دل  
میں وہ کشش اور جوڑے جیسے لفظوں پر غور کرتے  
سائنس کے نصاب کو کوسہ واپس باور پنی خانے کی  
طرف مٹا گئیں۔ شبیر اب بھی حیرت سے انہیں دیکھ  
رہا تھا۔

”جی، کن چیزوں پر ازینڈن کرتی ہے  
الیکٹرونکلیکٹو؟“

انامک نمبر ہے۔“ شانی نے اسے سمجھا دیا۔  
”جی راست تناسب ہے۔“ یہ تمام اصطلاحات انگریزی  
میں استعمال کرنے کی اس قدر عادت تھی کہ انگریزی  
میں ہی نہیں آیا اردو میں کیا بولے۔  
”آپ آرام سے جیسے سمجھا رہے تھے، ویسے  
سمجھائیں۔ بانی کچھ نہیں کہیں گی۔“ اس کی ہر بات  
پر وہ مسکرائی تھی۔ یہ پہلی بار تھی ہونی مسکراہٹ تھی جو شبیر  
نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی۔  
وہ بہت شرافت سے نظریں نیچی کر کے چڑھا  
تھا۔

وہ بھی بہت سنجیدگی سے پڑھتی تھی۔ سوال  
جواب کے علاوہ ایک لفظ اضافی نہ بولتی اور بارے  
باندھے بڑھ کر اندر غائب ہو جاتی۔ آج نظر اٹھی تو  
غیر معمولی۔ مسکراہٹ نے اس کی آنکھوں کی چمک  
بڑھا دی تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر پڑتے خم نے اس کے  
حسین چہرے کی دلکشی میں اضافہ کیا تھا۔ بس لمبے  
کا کھیل تھا۔ پھر خود کو ڈانٹتے ہوئے شبیر نے زبردستی  
نظریں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں۔  
”شیطان کا پہلا وار نظر سے ہی ہوتا ہے۔ نظریں  
حفاظت کرو۔“

اس نے خود کو سمجھا رہا تھا۔ پھر بھی رات گئے تک  
اسے وہ کھلتی مسکراہٹ اور چمکتی آنکھیں یاد آتی رہیں۔  
”یہ بات تو طے ہے، شانزے جیسی حسین  
لڑکیاں بے شمار ہوں گی لیکن اس جیسی مسکراہٹ کی  
کے پاس نہیں ہوگی۔“ کروٹ بدلتے سونے سے  
پہلے اس نے فیصلہ صادر کیا تھا۔

☆☆☆

آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن بانی کو اب اس پر  
خاص اعتبار ہو گیا تھا۔ گو وہ اب بھی ان کے آس پاس  
ہی اپنا کام کرتی رہتیں لیکن درمیان میں ٹوکنے سے  
گریز ہی کرتیں۔ شبیر نہ صرف بہت اچھی طرح  
سمجھتا تھا بلکہ وہ شانزے سے ٹیٹ بھی لیتا اور اس  
کی کارکردگی پر نظر رکھتا۔ یہ اس کی شروع سے عادت



جی۔ کرلی کام آسانی سے نہ کرتا لیکن اگر کرتا تو اسے  
دوسری سے ابھام دیتا۔

نیمٹ، اس کی غلطیاں، اصلاح سب کچھ تالی  
کے سامنے ہوتا تھا سواشانزے کو بھی پڑھائی پر دھیان  
دینا پڑتا۔ پھر شہیر کا دوستانہ اور نرم انداز بھی اسے  
پڑھائی کی طرف راغب کر گیا تھا۔ وہ بار بار سوال  
کرنے پر برا نہیں مناتا تھا، ایک موضوع کو بار بار  
سمجھاتا، مثالیں دینے کے لیے بھی روزمرہ کی اشیاء  
استعمال کرتا۔ یکسٹری پڑھتے، پڑھاتے وہ تینوں  
ایک دوسرے کی یکسٹری جان گئے تھے۔

شہیر آج کل ڈگری پٹنے کے بعد نوکری کی  
جاس میں تھا۔ انٹرن شپ ہو گئی تھی۔ فرصت کے ان  
دن، رات میں وہ خوب لکھنے پڑھنے پر دھیان دے  
رہا تھا۔ اس مہینے کے ڈائجسٹ میں اس کی کہانی  
شائع ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ مارکیٹ سے  
ڈائجسٹ لیتے وہ پہلے نیچے پڑھانے آ گیا تھا۔  
شانزے نے ایک طرف رکھے ڈائجسٹ دلچسپی سے  
دیکھے۔

”آپ ڈائجسٹ پڑھتے ہیں؟“

اس نے ڈائجسٹ ہاتھ میں لے کر صفحات  
پلٹے پوچھا تھا۔

”جی، پڑھتا بھی ہوں اور لکھتا بھی ہوں۔“

شہیر نے فخر سے بتایا، خوب صورت مسکراہٹ  
والی اس حسیہ کو متاثر کرنے کا اس سے نادر موقع نہیں  
ملتا تھا۔ وہ واقعی متاثر ہو گئی۔ فوراً سر اٹھا کر تحسین آمیز  
انداز میں اسے دیکھا، لہجے سے اشتیاق جھلک رہا  
تھا۔

”کچ، آپ واقعی مصنف ہیں۔ پہلے تو کبھی نہیں  
بتایا۔“

اس کے انداز پر شہیر کا دل ہواؤں میں اڑنے  
لگا تھا۔ وہ اپنے طور پر لمبے قد کا خوب رو، پڑھا لکھا لڑکا  
تھا۔ اسے اکثر محسوس ہوتا کہ تانی بھی اسے اپنا داماد  
ٹانے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ اکثر اس کی تعلیم، گھر،  
باب اور مکتبی وغیرہ کے بارے میں پوچھتی تھیں۔ وہ

خود دل و جان سے ان کی لڑائی میں آئے کو ہمارا تھا  
لیکن آج تک شانزے اس کی کسی بات سے جڑ  
نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کا انداز اسے خوش کر گیا۔  
”پہلے آپ نے بھی پوچھا ہی نہیں۔“

اس نے کن اکھبوں سے دیکھتے — اپنے  
طور پر ہیر و پختہ بہت دلربا انداز میں جواب دیا تھا۔  
شانزے اس کی طرف متوجہ نہیں تھی، وہ فہرست میں  
اس کا نام دیکھ رہی تھی۔

”میرے بابا بھی شاعر تھے۔“

اس نے دھیمی آواز میں بتایا تھا۔  
شہیر کو لمبے کے چوتھائی حصے میں اس کے اس  
قدر جذبہ بانی ہونے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ اس کے شوق  
میں اسے اپنے باپ کا عکس نظر آیا تھا، اسے ان کی یاد  
آئی تھی تب ہی ایک دم اتنی اپنائیت اس کے انداز  
میں آ گئی تھی۔

چند لمحوں کے لیے وہ خاموش ہو گیا، اس کی سمجھ  
میں نہیں آیا کہ کیا کہے، شانزے کے والدین کا انتقال  
ہو چکا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا  
تھا۔ شانزے کے جھکے سر پر نظریں جمائے اس نے  
الفاظ جوڑے۔

”کیا ہوا تھا انہیں۔“

”روڈ ایکسیڈنٹ۔ امی ہارٹ پشمنٹ تھیں،  
ان کے انتقال کے ایک ماہ بعد ہی بابا کا ایکسیڈنٹ ہو  
گیا تھا۔ میں سات سال کی تھی۔“ شانزے نے مختصر  
جملوں میں پوری زندگی کی کہانی سنا دی تھی۔

شہیر کا دل غم سے بھر گیا۔ اس نے خود تیمی کا  
دکھ سہا تھا لیکن اس کے پاس امی تھیں، فری تھی، انعام  
بھائی کے روپ میں باپ کی طرح محبت کرنے والا  
اور خیال رکھنے والا رشتہ تھا۔ جب کہ شانزے بالکل  
اکیلی تھی۔ اس نے آج تک محلے کے چند بچوں کے  
علاوہ کسی کو ان کے ہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔

چمکتی آنکھوں میں نمی تھی اور کھٹی مسکراہٹ والا  
چہرہ اس وقت شام ڈھلے اداسی کا منظر پیش کر رہا تھا۔  
شہیر کا اپنا دل کسی نے منہ میں سمجھ لیا تھا۔ اس وقت



اسے اندازہ ہوا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس لڑکی سے دلی تعلق جوڑ بیٹھا ہے۔ اس دن انہوں نے کچھ نہیں پڑھا۔ وہ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کھانا کھائے بنا آ گیا۔ شانزے کے چہرے پر بکھرے یاسیت کے رنگ اسے بہت برے لگے تھے۔

”میں اسے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“

خود سے عہد کرتے وہ بھول گیا تھا کہ ان کا ایسا کوئی تعلق نہیں، جس کی بنیاد پر وہ ایسی خوش فہمیاں پاتا۔

☆☆☆

قسمت اور تعلقات کی بدولت شہیر کو اچھی جاب مل گئی۔ ایکسٹنٹ لیٹر ملے ہی وہ فری باجی کی تاکید کے مطابق مٹھائی کا ڈبامسوں کے گھر لے کر گیا تو نانی کا خیال بھی آ گیا۔

”لیس نانی مٹھائی کھائیں۔“ اندر داخل ہوتے ہی سلام کے بعد اس نے پرجوش انداز میں ڈبا ان کے آگے کیا۔

”خیریت، مٹھائی کس خوشی میں؟“

نانی نے ہاتھ بڑھانے کے بجائے اپنے مخصوص روکھے انداز میں پوچھا، اس کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔

”نو کری مل گئی ہے مجھے۔“ اس نے مرے مرے لہجے میں بتایا تھا۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ میرا بچہ، مرد لوگ محنت کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔“

نانی نے پہلی بار اسے شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور دلار سے پکارتے ہوئے خود آگے بڑھ کر مٹھائی کا ڈبا تمام لیا تھا اور اسے ساتھ لیے برآمدے کے تخت کی طرف بڑھیں۔

”جی نانی، کافی دن سے کوشش کر رہا تھا۔ اللہ کا شکر ہے۔ اچھی کہنی ہے، تنخواہ بھی مناسب ہے۔ کچھ عرصے بعد تجربہ آ جائے گا تو تنخواہ بھی بڑھ جائے گی۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسا رد عمل ظاہر

کرے۔ محتاط انداز میں انہیں تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

”بیٹا صلاحیت ضائع ہو جاتی ہے لیکن محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ حلال رزق کے لیے کوشش کرنا بھی عبادت ہے۔ بس محنت سے لگے رہو اور اس پاک پروردگار سے دعا مانگتے رہو۔ رزق کی کچی بہت بڑی آزمائش ہے۔ اللہ تمہیں کامیابیاں دے۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں گزشتہ زمانے کے تجربوں کی گہرائی تھی۔ شہیر بس ”آمین“ کہہ کر رہ گیا۔

آخر نانی کو خود ہی خیال آیا۔ کمرے کی طرف منہ کر کے انہوں نے شانزے کو پکارا۔

”شانی، چائے بنا لو۔“

”ابھی تو پی ہے نانی۔“

دو پٹا کندھے پر ڈالے وہ کچھ جھنجھلائی ہوئی باہر آئی پھر اسے دیکھتے ہی سرسری سا سلام کرتی ہوئے سر پر ڈالتی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ ایک غیر ارادی بھرپور نظر کے بعد شہیر نے نظریں جھکا لی تھیں۔

”بھال ہے جو پوری بات سن لے یہ لڑکی اب مٹھائی پلیٹ میں کون نکالے گا۔“

نانی اس سے زیادہ جھنجھلا گئیں۔ شہیر خاموشی سے سنتا رہا۔ دل تو کر رہا تھا کہ فوراً اپنی خدمات پیش کرے۔ اس پر ہی چہرہ کے ساتھ کام کرنے کا بھی اپنا لطف ہوتا لیکن پاسان عقل ابھی چھٹی پر نہیں گیا تھا۔

”تم پھر شانی کو پڑھاؤ گے اب یا نہیں؟“

نانی نے خود ہی قصہ کو تازہ کرتے اگلی بات شروع کی۔

”اگلے پیر سے جوائن کرنا ہے۔ پھر جاب کی درست ٹائمنگ کا اندازہ ہو جائے گا۔ ارادہ تو یہی ہے کہ وقت نکال کر ضرور پڑھاؤں گا۔ کافی سلیس تو ہو ہی گیا ہے۔“ اس نے سچائی سے جواب دیا۔

اچھی سی چائے، مٹھائی کے ساتھ لطف اندوز ہو کر وہ خوش خوش وہاں سے آیا تھا۔



شانزے نے نہ صرف بہت خوشی سے مہار کہا وہی جی بلکہ اسے لکھنا نہ چھوڑنے کی تاکید بھی کی۔ وہ اس سے حریف بائیں کرنا چاہتا تھا لیکن نانی آگئیں تو دل سوس کر رہ گیا۔ وہ چار لمبے جو نانی اٹھ جاتیں، اسے آزادی کے ملتے۔

☆☆☆

جوائنگ کے بعد سے شہر کا کافی مصروف ہو گیا تھا۔ نئی جاب کی بے شمار مصروفیات تھیں۔ وہ دہشتی سے کام کر کے جلد ترقی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ٹاٹے میں تو بریڈ، جام، اسپرید وغیرہ سے کام لگ جاتا۔ آفس کینٹین سے کرتا۔

رات کا کھانا وہ شانزے کو پڑھانے کے بعد نانی کے گھر کھا لیتا تھا۔ اب نانی اس کی مصروفیت سمجھتے ہوئے اس سے شانزے کو پڑھانے پر اصرار نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے از خود یہ اصول بتایا ہوا تھا کہ اگر اسے دیر ہو جاتی تو کسی پیالے میں ساکن نکال کر میز پر رکھ دیتیں۔ وہ بازار کی روٹی سے کھا لیتا۔ درمیان والے دروازے کو وہ ویسے بھی لاک ہی رکھتیں لیکن رات میں وہ اسے کبھی نہیں کھولتیں کہ وہ جلدی سو جاتی تھیں۔

اتوار کو وہ گھر کی صفائی اور کپڑے دھو بی کو دینے لینے کے کام کرتا تھا۔ تنہا رہتا اتنا آسان نہ تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔

ان ہی مصروفیات میں کافی دن گزر گئے۔ اس اتوار کو وہ شام ڈھلے ماموں کے گھر سے لٹچ اور چائے پی کر آیا تو نانی نے اسے دروازے پر ہی سامان لی اسٹ تھا دی۔

”یہ کیا ہے؟“  
بیکری آئلنگ کے ڈھیروں نام دیکھ کر بے اختیار اس نے پوچھا۔

”شانی کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آرہے ہیں، تم ذرا بیکری سے تازہ سموسے، کپک لادینا۔ یہ سب تو سب باسی اٹھا لاتے ہیں۔“ نانی اسے سامان کی تفصیل سمجھا رہی تھیں اور وہ غائب دماغی سے سر

ہار رہا تھا۔

شانزے کا کہیں اور رشتہ ہونے کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے خیال میں تو وہ ابھی اتنی کم عمر تھی کہ نانی وہ چار سال تک اس کی شادی کا ارادہ بھی نہ کرتیں۔

”اتنی جلدی کیوں کر رہی ہیں، ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔“ اس نے نانی کی بات کاٹ لی۔ سیکٹ کی چٹائی اور چھپس کے کنارے پہن پھانسیا کر نانی کی زبان رک لی۔

”اس کی کوئی دوست اپنے بھائی کے لیے آ رہی ہے۔ ابھی رشتہ ہو جائے گا تو دو، تین سال میں شادی کر دوں گی۔ وہ لڑکا بھی ملک سے باہر ہے۔ جب تک اس کا کافی بھی ختم ہو جائے گا۔“ انہوں نے اس دخل در محولات پر اسے ٹھکرایا لیکن بہت جلد سے سمجھایا۔

شانزے کی لکھائی پڑھتے فہمست کے مطابق سامان خریدتے وہ خود کو چند محسوس کر رہا تھا جو اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں پرانی کر رہا تھا۔ سامان نانی کو کھانا کر رہے کمرے میں آکر سر تھام کر بیٹھ گیا۔

”دوست کا بھائی ہے تو شاید شانزے کی پسند بھی ہو۔“ ایک خیال ذہن میں سوئی کی طرح چھپا۔ لیکن لڑکا تو ملک سے باہر ہے۔“ دوسرا سلی پنش خیال بھی فوراً آیا۔

تھنی دیر سوچوں میں الجھے رہنے کے بعد اس نے فری باپتی کو کال ملائی۔

”تم نے میری شادی نہیں کرنی باپتی، امی پوچھیں گی تم سے۔“ چھوٹے ہی اس سے سوال کیا بلکہ خوف خدا یاد دلایا۔

”رات تک تو تمہارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ امی بھی خواب میں آئیں تو انہیں بھی کوئی جلدی نہ تھی تو اب کیا ایمر جنسی آگئی؟“ فری نے حیرت سے کھڑا توڑ جواب دیا۔

”شانزے کا رشتہ دیکھ رہی ہیں نانی۔“ اس نے ایک جملے میں، لہجے میں درد بھر کر ساری رام کھا



کہہ ڈالی۔  
 ”اور، مانی کو پہلے ہی اکیلے لڑکے کو رکھنے پر  
 بہت تحفظات تھے۔ تم بھی ان کی امیدوں پر پورے  
 اترے۔ ان کا نمک کھاتے ہو اور ان کی نواہی پر نظر  
 رکھتے ہو۔“ فری باجی نے چھیڑا۔ یہ سارے بدلے  
 لینے کا بہترین وقت تھا۔  
 ”ان کا نمک ہی تو حلال کر رہا ہوں، مجھ جیسا  
 بھیرا نہیں کہاں ملے گا۔“ شہیر نے شوخی سے جواب  
 دیا۔

فری باجی کے فریٹس موڈ سے وہ جان گیا تھا کہ  
 انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ تمام خدشات جو اس کے  
 ذہن میں تھے، اپنی موت آپ مر گئے۔  
 فری نے واقعی تیزی دکھائی۔ انعام بھائی سے  
 بات کرنے، مانی سے اجازت لے کر ماموں، ممانی  
 کو باقاعدہ رشتہ لے کر جانے میں محض دو، تین دن  
 لگے تھے۔  
 شہیر کی خوش فہمی البتہ دور ہو گئی تھی کہ اس جیسا  
 مانی کو نہیں ملے گا۔

انہوں نے صاف بتا دیا تھا کہ شانی کی دوست  
 کا بھائی انجینئر ہے اور وہی میں۔ جاب کرتا ہے۔  
 اچھے لوگ ہیں۔ اب دور رشتے ایک وقت میں موجود  
 تھے تو سوچ کر جواب دینا تو بنتا تھا۔  
 ماموں نے پرانے تعلقات کا سارا زور لگا دیا۔  
 یہی کتبہ شہیر کے حق میں تھا۔ اس کے پورے خاندان  
 سے مانی واقف تھیں۔ وہ خود مہینوں سے ان کی نظروں  
 کے سامنے تھا۔ اس کے کردار میں کوئی جھول نظر نہیں  
 آیا تھا۔ ملک سے باہر بھیج کر شانزے کی صورت کو  
 ترسنے سے بہتر تھا کہ ساتھ ہی رکھ لیتیں۔

جواب کے انتظار میں گزرتے چند دن شہیر پر  
 بہت بھاری تھی۔ آفس میں بھی اس کا کسی کام میں  
 دل نہیں لگتا تھا۔ بالآخر مانی نے مثبت جواب دیا۔ اور  
 وہ کو یا خوشی سے ناپنے لگا۔ چند ماہ بعد جب فری اپنی  
 پاکستان آئیں تو ان کی شادی ہو جاتی، اسی لیے ابھی  
 محض زبانی کا ہی بات کہی کر دی گئی۔

ممائی جان لے اسے باکر مانی کے سامنے بچا  
 بھرے انداز میں کہا۔  
 ”خالہ! یہ اب آپ کا بیٹا ہے۔ ماشاء اللہ بہت  
 باادب، شریف بچہ ہے۔ شانزے بہت خوش رہے  
 گی۔ پڑھائی کا کوئی مسئلہ نہیں، شادی کے بعد پتہ  
 چاہے پڑھ لے، یہاں کون سا بھرے سسرال کی  
 ذمہ داریاں ہیں۔“

وہ بنا وقفہ دیے بول رہی تھیں۔ ماموں اور مانی  
 مسکراتے ہوئے شہیر کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے  
 سن رہے تھے اور شہیر میاں بظاہر بہت شرافت سے  
 بیٹھے، کن اکھیوں سے کمرے میں جھانکتے شانزے  
 کے دیدار کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلسل ناکامی اور  
 کانوں میں ممائی جان کی تسلسل سے آتی آواز سے  
 جھنجھلا کر سوچا۔

”فری باجی اور ممائی جب آپس میں باتیں  
 کرتی ہیں تو سننا کون ہے۔“

ممائی اس موقع پر کسی ایک بھوکولا کر دوسری کو  
 شکوے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں۔ سب کو لانا بھی  
 مانی پر بار ڈالنے والی بات تھی سو اس وقت تمنا  
 بزرگوں کے زرخے میں شہیر اکیلا بیٹھا شاندار ماضی کی  
 ان قیمتی یادداشتوں سے فیض یاب ہو رہا تھا، جن کی رو  
 سے شانزے اور اس کی مانی دو پٹا بدل بنیں تھیں۔  
 اس کی اور شانزے کی امیاں بچپن کی سہیلیاں تھیں  
 اور پیار، محبت کی یہ کڑیاں تیسری نسل میں آ کر ایک  
 رشتے میں جڑنے والی تھیں۔ مسکرا مسکرا کر اس کے  
 جڑوں میں درد ہو گیا۔

”بہت گئی ہے شانزے، یہ نہیں کہ آ کر برتن ہی  
 اٹھالے۔“ ماموں ہو کر اس نے میز پر رکھے چائے  
 کے برتنوں کو گھورا۔ موبائل کی بجٹی ٹیل کو اپنے لیے راہ  
 نجات تصور کرتا معذرت کر کے وہ اٹھ کر جا رہا تھا  
 جب مانی نے پیچھے سے آواز دی تھی۔

”وقت نکال کر شانزے کو پڑھانے آ جانا بیٹا،  
 امتحان نزدیک ہیں۔“  
 اس غیر متوقع آفر پر ایک لمحہ کو اس کا منہ کھلا،



جس طرح ابھی شانزے اس کے سامنے آنے سے  
گزرتی تھی، اس سے تو وہ ٹیوشن پر فاتحہ بڑھ چکا  
تھا۔ اگلے لمحے منہ بند کر کے یا ہو کا نفرو دل میں  
نہرا دیا۔

دبائے اس کے سر پر دیا۔  
 "کوئی تو سبیل نکلی۔" خوشی سے اس نے سوچا۔  
 رات کو فری باجی نے بات کرتے ہوئے اسے  
 اہمیتیں کر کے اس کی خوشی ملیا میٹ کرنے کی  
 پوری کوشش کی۔  
 "تو کیا کروں میں۔" بہت دیر تک سن سن کر وہ  
 خرچ کیا گیا۔

آخر چھ لیا۔  
 ”میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ متکلفی کی شرعی  
 حیثیت کوئی نہیں ہے سو۔“ فری باجی نے بہت دیکھی  
 سے دوبارہ تقریر کا آغاز لیا لیکن وہ جل کر بات کاٹ  
 گیا۔

”سو جب تک اکاح نہیں ہو جاتا، میں شازے کو بہن ہی سمجھوں۔“ فری ہاجی کے ساتھ ساتھ انعام بھائی کے غیر متوقع فریہ کی آواز بھی اسے آئی جو اس نے دواہ لے آئے لکڑا لکایا۔

”پہ لکڑا ہیں، بہن ہی سمجھتا ہوں، خالہ ذرا بہن۔“

”تم بھی نہیں سمجھو گے۔“ اسی روز سہیلی نے اپنا مسئلہ کہا تھا۔

اپنی مصروف ترین روئین سے وقت نکال کر  
 بھی دوستانہ کو ہر حالے ضرور جانا۔ غالی پہلے کی  
 طرح بھی ساتھ دینے ہائیں اور کبھی سامنے لیکن میں  
 حاضر رہا ہوں۔

ایمانی تارے کا فی نورانی روشنی میں ہے  
جہاں غائب ہے سرور کائنات کی  
حالیہ دنیا پر نظر میں ہے یہی روشنی  
وہ ہے جس سے ہر چیز کو حیات ملتا ہے

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں نے آرام سے  
اس کے پاس سے گزرا تھا۔ اس کے پاس سے  
میں گزرا تھا۔ اس کے پاس سے

جب وہ خود نو میریکل حل کر کے اسے دکھانے  
 لگی تو اس کی نظروں کا ارٹھاری تھا جو اسے کھینچ کر  
 رہا تھا۔

”آپ ایسے مت دیکھیں مجھے۔“ اس نے  
 نظریں اٹھا کر اپنا دھڑ بھال کرتے کہا تھا۔  
 ”پھر کیسے دیکھوں۔“ شہر نے مسکرا کر ہاتھ  
 بالوں میں پھیرتے، سر ہٹنے کی پوری کوشش کی۔  
 شانزے نے اب کی بار تھبرانے، شرمانے کے  
 بجائے ایک ہل اسے دیکھا اور ایک دم باور  
 خانے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔  
 ”ہائی!“

شہر گھبرا کر بچے ہو کر شرافت سے بیٹھا مانی  
 فوراً سامنے آئی تھیں۔  
 ”کیا ہوا؟“

”سردار! ہاں، چائے بنا دیں۔“  
اس کے جواب پر وہ سر ہلاتی اور بڑھ کر  
چائے کی شاخ سے لے کر شراب سے کتاب کھول کر  
دیکھ کر کہہ دیتی تھی۔

”جی ایس، کیسیں اور پڑھائی۔“ اس کے  
 چہرے پر سب سے سائنہ مکان شہر کے گھڑوں پر چلی  
 تھی۔ وہ ان کی سیدی سادی نہیں مٹی ہوتا، بھڑا  
 اس دن کے ہر وہ دونوں دوستانہ ماحول  
 میں پڑھتا اور دوسری کہہ گئی تھی کہ  
 شہر کے کل ہر ہال ٹیبر شہر کے لیے لیا تھا لیکن  
 افسار کے تاج۔ (یاد رہے کہ ان کا پتہ نہیں لگتی  
 تھی۔)

شہر کو بھی گھری ہوئی تھی۔ بڑا بڑا سیڑھی  
 اچھڑا اچھڑا کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے بھی  
 جھپٹے گا۔ وہ دھڑک کر رہ گیا۔ وہ دھڑک رہا تھا۔  
 اسے پتہ چلا کہ وہی وہی ہے۔ لیکن اس نے اسے  
 ہاتھوں کی گھڑی لے کر ہاتھوں کی گھڑی  
 ہاتھوں کی گھڑی لے کر ہاتھوں کی گھڑی



لکھنے کے شوق سے بھی رابطہ بحال کر لیا تھا۔ اس دن بھی ڈاکیا کسی کہانی کا اعزاز یہ لے کر لایا تھا۔ شہپر احمد کے نام کا مٹی آرڈر وصول کرتے تانی کو کافی حیرت ہوئی۔ ایسا کون ہے جو اسے پیسے بھیجتا ہے۔ جوان جہان کماؤ لڑکے کو کسی کے پیسے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے ڈاکے سے بھیجنے والے کا نام پوچھا۔

”میرے پاس چشمہ نہیں ہے، یہ پڑھو تو کس نے بھیجا ہے۔“

ڈاکے نے مٹی آرڈر پلٹ کر ڈائجسٹ اور کہانی کا نام بڑھ کر بتانے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ بہت جوش سے مبارک باد بھی دی تھی۔ ایسا ہونہار ادیب ان کے گھر میں موجود تھا اور وہ بے خبر تھیں۔ وہ بامشکل اپنا غصہ ضبط کرتی اندر آئی تھیں۔ اندر آ کر وہ منہ سرپلیٹ کر لیٹ گئی تھیں۔ شانزے نے طبیعت پوچھی، چائے لا کر دی لیکن انہوں نے سر سے چادر نہ اتاری۔ وہ اسے اپنی سرخ آنکھیں دکھا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شام کو وہ خود کو سنبھال کر انھیں اور درمیانی دروازہ کھول کر سخت برا بھیسیں۔

شہپر بہت تھکا ہوا اندر داخل ہوا تو درمیان والا دروازہ کھلا دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ آج پھر تانی کو اس سے کوئی کام ہے۔ دل نہ چاہنے کے باوجود وہ سلام کرتا اندر داخل ہو گیا۔ حسب عادت نگاہ شانزے کی تلاش میں دوڑائی، وہ کہیں نہیں تھی۔

”السلام علیکم تانی۔“

”تم کہانیاں لکھتے ہو؟“ سلام کے جواب میں محض سر ہلاتے انہوں نے بلا تشہید پوچھا تھا۔

”جی، جی ہاں..... بس کبھی کبھار.....“ حیرت کے پہلے جھٹکے سے منجھل کر شہپر نے خوشی سے عاجزی کا مظاہرہ کیا۔ یہ اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔

”آئندہ مت لکھنا۔“ انہوں نے حکم جاری کیا۔ اسے دھچکا لگا تھا۔

”کیوں؟“ بے اختیار اس نے تیز لہجے میں کہا تھا۔

شانزے کمرے کے کھلے دروازے میں آ کر باندھے مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ اس پر ٹکا ہوا ہے تانی نے اپنا لہجہ مدھم کیا۔

”لیکن کیوں تانی، اس میں کیا مسئلہ ہے۔“

اب وہ لہجہ کر پوچھ رہا تھا۔

”لکھنے، پڑھنے والے لوگ ہمیشہ اپنا خیال میں رکھتے ہیں۔ اپنے یونو پیاسے نکل کر مسائل کا مقابلہ کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔“

رشتوں کے لیے وہ بھی سہارا نہیں بن پاتے۔ تانی نے بہت ٹھہر ٹھہر کر محل سے سوچا سمجھا جواب دیا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے، ادیب تو بہت حساس ہے۔ اس سے بڑھ کر کون اپنے رشتوں کے لیے سوچتا ہوگا۔“ وہ جذباتی ہوا۔

”بہر حال مجھے پہلے معلوم ہونا تو شاید یہ رشتہ نہ ہو یا تا لیکن اب بھی اگر تم اپنی ضد پر قائم رہو تو ہمارا تعلق ختم ہو جائے گا۔“ انہوں نے بحث سے انکار کر فیصلہ سنایا۔

شہپر نے بے یقینی سے انہیں اور پھر شانزے کے ڈبڈباتی آنکھوں اور ساکت وجود کو دیکھا تھا۔

”آپ اتنی سی بات پر ایسا کیسے کر سکتی ہیں ویسے بھی شانزے تو یہ بات پہلے سے جانتی ہے۔“

اس نے دوبارہ تصدیق کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا۔ تانی کی نظریں بھی اس کی سمت آئیں۔ ایک آنسو اس کی آنکھ کے کونے سے نکل کر گال پر بہتا چلا گیا تھا۔ شانزے خاموشی سے مڑ کر اندر بڑھ گئی۔

”تمہارے پیسے۔“

تانی نے اسے متوجہ کیا، وہ اسے مٹی آرڈر کی سلف اور نوٹ تھما رہی تھیں۔ اس نے ان کے چہرے کو کوجاہہ وہ بہت سنجیدہ تھیں۔ تب ہی اس کے ہاتھ بڑھائے بول گئیں۔

”امید ہے کہ تم سنجیدگی سے میری بات پر غور کرو گے۔“ وہ بہت پڑ مردہ انداز میں اوپر آیا تھا۔

☆☆☆

سوچ، سوچ کر اس کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ آج



کے اور میں بھی کوئی نکلنے والے وہ بھی مرد لکھنے والے کو  
 ہوا چہرہ میں سکتا ہے۔ وہ کوئی نامور ادیب نہیں تھا۔  
 پھر بھی اس نے اپنے کالرز اور کہاں کہاں  
 زندگی بھر کی کوئی لکھی تھی۔ وہ جب بھی کسی کو اس  
 بارے میں بتاتا تو ہمیشہ سب سے پہلی کلمات سنتا۔ انعام  
 بولتا تو اس کے مستقبل کی فکر تھی، وہ معاشی خوش حالی  
 چاہتے تھے۔ اس لیے اسے اس فیلڈ میں آنے نہیں  
 دیا تھیں اب تو وہ نوکری کرتا تھا۔ اس کا مستقبل محفوظ  
 تھا۔ پھر بانی کی بے جا ضد کا کیا مقصد تھا۔ اس گفتگو  
 میں ہی بانی کا فعلی لہجہ ان کے فیصلے کا غماز تھا۔ پھر  
 بھی چند دن اسے انتظار رہا۔ شاید بانی کچھ کہہ دیں۔  
 انہوں نے کہا بھی تو کیا۔

”تمہارے فیصلے بری ہی اس رشتے کے مستقبل کا  
 وار و مدار ہے۔ سوچ کر مجھے بتا دیتا۔“  
 وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ کیا کہتا۔ کیا یہ رشتہ اتنا  
 کچا تھا۔ نہ اس نے شانزے سے رابطہ کیا اور نہ ہی  
 شانزے نے اسے کوئی میسج کیا۔ وہ دل ہی دل میں  
 اس سے خفا تھا۔ بانی کو سمجھانا اس کا فرض تھا۔ اس  
 کے گال پر لڑھکے آنسو اور سپاٹ، سپید چہرہ تصور میں آتا  
 تو اسے دکھ میں مبتلا کرتا لیکن پھر غصے سے سوچتا، ردنا ہر  
 مسئلے کا حل نہیں۔ میں لکھتا نہیں چھوڑ دوں گا۔ چند دن  
 بعد اسے فری باجی کا فون آیا تھا۔  
 ”شہر! یہ کیا ہو رہا ہے؟“  
 ”کیا ہوا؟“

اس نے ابھی تک اس بات کا ذکر کسی سے نہیں  
 کیا تھا لیکن فری باجی کے لہجے سے وہ بھانپ گیا کہ  
 ”کس بارے میں بات کر رہی ہیں، پھر بھی بظاہر  
 انجان بنے ہوئے پوچھا۔“

”آج بانی سے بات ہوئی تھی میری، دماغ کھما  
 دیا انہوں نے تو میرا۔“ فری باجی بہت پریشان تھیں۔  
 ”انہیں اور آتا ہی کیا ہے۔“ اس نے بدلتی  
 سے کہا تھا۔ فری باجی نے فوراً انوکھا تھا۔

”خیر، بزرگ ہیں وہ۔ تم بھی کیا ضد لگا  
 کر بیٹھے ہو ان سے۔ مان لو ان کی بات یا نہ بھی

مانو تو بس مال دو ابھی۔ بعد میں جو مرضی کر لیا۔“  
 ”میں کیوں بلاؤں۔ جھوٹ ہوں۔“ وہ چپ  
 کیا۔ آج کل ویسے ہی اسے بہت فضا آتا تھا۔  
 ”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ خود اتنی دبی  
 ہو رہی تھیں۔ جنہیں کچھ معلوم نہیں، اچھا ایسا کرو تم  
 شانزے سے بات کرو۔ جو بھی ہو، اب اس مسئلہ  
 کو حل کرو۔ میں نے انعام کو ابھی کچھ نہیں بتایا۔ بات  
 باہر نکلنے سے پہلے ختم کرو۔ بے ربط سے جملے بولتے  
 اور ادھوری باتیں کرتے فری باجی نے فیصلہ صادر کر  
 کے فون بند کر دیا تھا۔

اس نے فون کو دیکھا اور چند لمحوں کے بعد سوچا اور  
 پھر شانزے کے نمبر پر پیغام بھیجا۔  
 ”کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟“

”رات دس بجے۔“ مختصر جواب آ گیا تھا۔  
 رات تک وہ بہت کچھ سوچتا رہا۔ وہ اس قصے  
 میں۔ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ بانی کی بے ٹکی شرط  
 ماننا، انہیں آئندہ ساری زندگی کے لیے شہ دینا تھا۔  
 دس بجتے ہی اس نے کال ملائی۔

”السلام علیکم۔“ شانزے نے دھیمے لہجے میں  
 کہا تھا۔  
 ”وعلیکم السلام، کیسی ہو؟“

وہ کتنے دن سے نیچے نہیں کیا تھا۔ اب آواز  
 سنتے ہی اس کی سونپی ہوئی محبت بے دار ہوئی تھی۔  
 ”اللہ کا شکر۔“ اس نے اب بھی ایک لفظ قائلو  
 نہیں بولا تھا۔

”تم تو شکر ہی کر رہی ہو، جنہیں کیا پروا، جان تو  
 میری مشکل میں پھنسی ہے نا۔“ وہ شکوہ کر رہا تھا۔  
 ”آپ بانی کی بات۔“ شانزے نے کچھ کہا  
 چاہا لیکن اس نے فوراً بات کاٹ دی۔

”میں ان کی بات نہیں مان سکتا۔ بلاؤچہ کی ضد  
 لگائی ہوئی ہے انہوں نے۔“

”یہ بلاؤچہ کی ضد نہیں ہے۔“  
 شانزے کی آواز بھکی تھی۔ اس نے اپنے لب  
 بھینپے۔



”آپ کو معلوم ہے، میرے ابو کون تھے؟“ میرے ابو فیاض ذکی تھے۔ اپنے وقت کے مشہور شاعر۔ یہ انکشاف اس کے لیے نیا تھا۔ فیاض ذکی کی شاعری اس نے پڑھی تھی۔ ان کی کتاب اس کے انتخاب میں شامل تھی۔ وہ کافی جانے مانے تھے۔ اپنے عروج کے دور میں ایک حادثے میں انتقال کے باعث ان کا زیادہ کام محفوظ نہیں کیا جاسکا تھا۔

”لیکن اس بات کا مجھ سے کیا تعلق؟“ اب اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔ شانزے نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

”میرے نانا ابو کا انتقال ہوا تو ان کی پٹن، یہ گھر، دکانیں۔ نانی کی معاشی حیثیت مستحکم تھی۔ انہوں نے میری امی کو بہت لاڈ سے پالا اور پھر کالج میں امی، ابو کی ملاقات ہوئی۔ دونوں خوب صورت تھے، خواہوں میں رہتے تھے۔ ابو شاعر تھے، عارضی طور پر کالج میں پڑھا رہے تھے۔ ان کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ نانی کو بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر کچھ عزیز نہ تھا۔ شادی ہوئی۔ ابو نے نوکری چھوڑ دی۔ گھر پہلے کی طرح چل رہا تھا۔ کسی کو فرق نہیں پڑا۔ ابو مشاعروں میں جاتے، اپنی کتاب شائع کروانا ان کا مقصد تھا۔

ان ہی دنوں ایک طرف میری پیدائش ہوئی اور دوسری طرف امی کو پہلا ہارٹ ایک ہوا۔ کچھ عرصے بعد صورت حال بانی پاس کروانے تک آگئی۔ نانی نے اپنی بیٹی کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ابو کی بے توجہی انہیں کڑھنے پر مجبور کرتی۔

میں پانچ سال کی تھی جب امی کے علاج کے لیے نانی نے دکانیں بیچ دیں۔ ان دکانوں سے آنے والا پیسا ابو نے وصول کیا تھا اور اس کا ایک حصہ اپنی کتاب کی اشاعت پر لگا دیا۔ امی کا آپریشن ہوا، وہ زندگی نہیں۔ نانی کو ابو سے نفرت ہو گئی۔ لیکن وہ مجھے ان کے آسے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔

اللہ جانے ابو میری کفالت کرتے یا نہیں لیکن اس

سے پہلے ہی وہ ایک سیزن میں فوت ہو گئے۔ وہ گویا انسان نانی کے دل کا ڈراما ہی کی طرح تھا۔ شاعروں، ادیبوں سے بڑے تھے۔ وہ اب بچکیوں سے دور ہی تھی۔ شہر کا چپ کروانے کے لیے الفاظ نہیں لے رہے تھے۔ لفظوں کو قمر طاس پر منتقل کرنے کے لیے وہ اپنا ہونٹ داؤ پر لگا رہا تھا، وہ اسے دھوکا دے کر ہاتھ بندھ کر شانزے نے فون بند کر دیا۔ شہر کے سوتے کے لیے بہت سے نئے درواہ ہونے تھے۔

نرم و نازک جذبے بیان کرنے والا ادیب، سنگ دل بھی ہو سکتا ہے کہ اسے سرتی ہوئی بھٹکتے زیادہ اپنی کتاب عزیز ہو؟ ایسا ممکن ہے، انسان کے روپ ہزار۔ اللہ کی حیران کر دینے والی مہکتے۔ شاعر ہو، ادیب ہو یا کوئی تاجر، ڈاکٹر، انجینئر سب انسان ہیں۔ انسانیت یا اخلاقیات پیشوں سے نہیں آتی۔ لیکن وہ خود کیا کرتا، نانی کے خوف کی خاطر اپنے خواب قربان کر دیتا۔

ابو کے جانے کے بعد وہ بہت اکیلا ہو گیا تھا۔ ان کتابوں نے اسے سہارا دیا۔ پھر اس نے ان کتابوں سے ہی امید بانٹنے کا سوچ لیا۔ دو زعمی کے تلخ حقائق نہیں لکھتا تھا بلکہ امید کے جگنو روشن کرتا تھا۔ وہ جگنو جو بڑھنے والوں سے زیادہ خود اس کی روشنی کرتے تھے۔ تو کیا وہ ایک بار پھر تھا، اسی فخر میں چلا جائے گا۔

☆☆☆

اگلے دن شہر نانی کے پاس آیا۔ نانی بہت خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی لاڈلی شانزے کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہے اور کل شانزے نے شہر سے بات کی ہے۔ انہیں ہمدردیاں لینے کی عادت نہیں تھی۔ پوری زعمی تھا پہلے بیٹی اور پھر نواسی کو انہوں نے بہت مصلحت سے پالا تھا۔

ان کا تفتاد دیکھ کر محلے میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ کچھ کہتا مگر شانزے کی خوشی کے لیے انہیں جھکا



بھی نہ پتا تو وہ جھک جاتیں۔ لیکن وہ شانزے کو کسی  
خود غرض انسان کے حوالے کر کے اس کی زندگی برباد  
نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے لاشعور میں دبا غصہ ابھر کر  
سانے آچکا تھا۔

انہوں نے شانزے کو فون پر رونے دیا۔ شاید  
اسی طرح شہیر ان کی بات مان لے۔ وہ شانزے کی  
غوثی نہیں چھین سکتی تھیں۔

”یانی۔“ دو آکر ان کے پیروں کے پاس بیٹھ  
میا۔ انہیں کرنٹ لگا۔ ایسا اس نے پہلے کبھی نہیں کیا  
تھا۔ ان کے جھکے سے سر اٹھانے سے قطع نظر وہ سر  
جھکائے بہت اداسی سے کہہ رہا تھا۔

”آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے نا۔ آپ سب  
کو ایک ہی نظر سے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ اگر کوئی ایک  
فرد ہم کی حرمت قائم نہیں رکھ پاتا تو یہ اس کی بد نصیبی  
ہے۔ آپ مجھے تو بد نصیب نہ بتائیں۔ میں بہت بڑا  
ادیب نہیں ہوں۔ میں تو بہت معمولی سا انسان  
ہوں۔ میرے کوئی بڑے خواب نہیں، میرے بہت  
چھوٹے چھوٹے خواب ہیں شاید میرا لکھا ایک لفظ  
بھی کسی کی زندگی بدل دے۔“

”ان کہانوں سے زندگی پلتی تو آج انسان  
اس حال میں نہ رہتا۔“ انہوں نے مٹی سے کہا تھا۔  
”آپ کو پتا ہے، اب کے اقبال کے بعد میں  
بہت تنہا ہو گیا تھا۔ العام بھائی نے میرے بل پر لکھنے  
کا پابندی لگائی تو کتابیں میری دوست بن گئیں۔

کہانی کا ہیرو میں بن جاتا اور ہیرو کے ابو میرے ابو  
بن جاتے۔ وہ اسے نصیحت کرتے، کوئی شاہاں  
دے تو مجھے لکھانہ دے، اب لے مجھے نصیحت کی ہے۔  
یہ ان کے الفاظ ہیں میرے لیے۔ العام بھائی تو  
بھائی تھے، عام بھائی بن گئے تھے۔

اسی اور اسی تو روٹی نہیں لیکن میں کہنے رہتا۔  
سب کہتے تھے نہیں ان کا سہارا ملتا ہے۔ مجھے بھی تو  
سہارا دینا ہے۔ وہ لے کے لیے، چلنے کے لیے  
سہارا دیتے تھے۔ اللہ میرے دوست تھے۔ انہیں لکھنے  
والے ان تھے، کہتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم لیکن یہ

میرے دل پر مرہم رکھتے۔

میں اس لیے ہی لکھتا ہوں کہ شاید کوئی اور بھی  
ایکلا ہوا دکھی ہو۔ جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ تو میں اس کا  
دوست بن جاؤں۔ شاید میرے الفاظ کسی روتے  
ہوئے کو ہنسادیں۔ میں ادیب نہیں ہوں یانی، میں تو  
صرف ان لفظوں کا قرض اتارتا ہوں، جنہوں نے  
مجھے سہارا دیا۔“ اس کا لہجہ رندہ گیا تھا۔ اس کا یہ  
روپ یانی کے لیے اور کمرے میں بیٹھ کر توجہ سے سنتی  
شانزے کے لیے بالکل نیا تھا۔

”شانزے کے ابو نے غلطی کی۔ انہوں نے قلم  
کی تلواریں سے اپنے چاہنے والوں کے دل ہی کاٹ  
دیے۔ آپ اس کی سزا مجھے کیوں دے رہی ہیں۔“

اب وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ یانی کو  
ڈانچسٹ پڑھنے کے لیے روٹی اپنی شانزے یاد  
آئی۔ جب وہ ڈانچسٹ پڑھ سکتی ہے تو شہیر بھی لکھ  
سکتا ہے۔ ان دونوں نے اکیلے پن کا دکھ سہا  
ہے۔ شانزے کے احساسات کا خیال شہیر سے بہتر  
کوئی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے فیصلہ کیا اور سگریٹ  
نپٹ اس کے سر پر لگا گئی۔

”سارے ڈانچا لگ رہیں لٹا دیے۔ کچھ  
کہانوں کے لیے بھی بھالو، کرلو جو مرضی کرنا ہے،  
میری بات تو کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔“ ان کے مصروفی  
نظمی بھرے لہجے سے جھلکتی غوثی اور لیوں کی مسکراہٹ  
لے شہیر کو شاد کر دیا۔

”ہرا، یانی زندہ ہاد۔ بس اب جلدی سے فری  
ہائی کو فون ملانا ہوں کہ آتا ہے تو آئیں اور نہ میں یانی  
کے بدلے سے پہلے شادی کرنے لگا ہوں۔“ اس  
لے لغزہ لگا کر کہا تھا۔

یانی نے اسے طہیو سے مگھوڑا جاپا لیکن جس  
دیں اداسی کی انسا سمجھ گئی اور ہر سو غصوں کی بہار  
آگئی تھی۔





## مکمل ناول

ڈیوٹی نہیں تھی، اس کے علاوہ کیے بعد ونگ مسٹر  
نرس اور چھٹی بیٹی ڈیوٹی سر انجام دیتیں کہ یہاں بیٹہ  
کر اس مشہور اور نامور خاتون کی دیکھ بھال کا فریضہ  
انجام دیتیں، جن کے بیٹوں نے لندن کے اس  
کلیٹنگ میں ایک خطیر رقم جمع کروائی ہوئی تھی۔ وہ نہ  
بھی کرواتے تو ماں کی بے حد و حساب دولت اور بے  
شمار قیمتی جائیدادیں، ان کا منجے سے منجہ علاقہ  
کروانے پر قادر تھیں مگر یہ ناموری اور دولت موت  
کی آہٹ اور آمد نہیں روک سکتی۔

بند آنکھوں کے پیچھے ذہن، جسم کی طرح سہکت  
نہیں تھا۔ دل کی دھڑکن کی طرح دماغ بھی اپنا کام کر  
رہا تھا۔ مگر عام حالت اور عام دنوں کی طرح نہیں، بلکہ  
ان کا ذہن اس وقت کسی اور ہی عالم میں تھا۔  
اس عالم میں جو بنیادی ذرائع اور علتوں کا تعلق

سرخ و سفید چہرہ کسی کسی زمانے میں تازہ  
مکاب تھا۔ مکاب ہوا اب یہ مکاب کلاسا تھا۔ زرد پڑ  
گیا تھا چہرے کے موزوں اور مکمل نین نقش مکندرات  
میں ماضی کی پُر شکوہ اور خوب صورت عمارت، دیکھنے  
والے اب بھی دیکھ سکتے تھے۔ بے حد خوب صورت  
غنائی آنکھوں کے چوٹے بند تھے۔ بالکل بند،  
پکوں پہ سوہوم سی لرزش بھی نہیں تھی۔

”اللہ ان کے حال پہ رحم کرے۔ پتا نہیں کب  
تک یہ اس کوئے کی حالت میں رہیں گی؟“

نرس نے ہمدردی سے انہیں دیکھتے ہوئے اس  
اسکرین کی طرف دیکھا جہاں دل کی دھڑکن ایک لکیر کی  
صورت میں چل رہی تھی۔ دھڑکن کی رفتار تھوڑی کم تھی  
مگر اتنی بھی نہیں کہ خطرے کا گمان ہونے لگے۔  
نرس کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھ نوٹھنے کی

نعیمہ ناز

درختی ناول

Parasite Site





نہیں ہوتا، یہ عالم خاص خدا کا تخلیق کردہ، وضع کردہ تھا جس میں بندے کا ہوش میں ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اس کیفیت میں ہوش و حواس برقرار رہنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ زندہ رہنا بھی اتنا ضروری نہیں ہوتا۔

موت سے ذرا پہلے اور موت کے بعد خالق اپنی مخلوق کو وہ سب دکھا دیتا ہے جو اپنی زندگی میں وہ

آنکھیں کھول کر بھی نہیں دیکھ پاتا اور موت یا بے ہوشی کی حالت میں بھی دماغ وہ سب کچھ سوچ لیتا ہے جو اپنے ہوش اور اپنی زندگی میں کبھی نہیں سوچتا۔ بیگم زرتاج مہر اس وقت کچھ ایسی ہی کیفیت میں تھیں ان کی خاموش سماعتوں نے وہ سب کچھ سنا جو ان کے بیٹوں نے باری باری کہا اور اب دماغ وہ سب کچھ دہرا رہا تھا جو سب سے بڑے بیٹے سید عبدالعید خان نے کہا تھا۔

بیگم زرتاج مہر کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو چاروں بیٹوں کو اطلاع کر دی گئی۔ ویسے تو ان کا خاندان بہت بڑا تھا۔ رشتے داریوں در رشتے داریوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ تھا جو دور دور تک پھیلا ہوا تھا کئی شہروں اور کئی ممالک میں، مگر شوہر کی وفات کے بعد خونی رشتے بس یہی تھے۔

چار بیٹے، اپنے اپنے شعبوں میں کامیاب، مشہور اور دولت مند، جیسے ہی ماں کی نازک حالت کی اطلاع ملی سب نے اپنی اپنی مصروفیت کے باجماع ٹھیل میں سے بہت سی اہم اور ضروری ملاقاتیں دورے اور میٹنگز ادھر ادھر کیں تب بھی ایک کو آنے میں تین دن لگے، دوسرے کو چار اور تیسرے کو ایک ہفتہ ہی لگ گیا۔

بڑے سید عبدالعید جو اپنے حلقے میں میڈی کے نام سے معروف تھے۔ ویسے تو اپنے برلن کی وجہ سے وہ زیادہ تر سفر میں ہی رہتے تھے۔ مگر جب ان کے پاس زرتاج مہر کی بیماری کا فون آیا تو وہ مانتھرس میں ہی تھے جہاں ان کے برلن کا مرکزی آفس تھا۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کو ایک طرف کرتے کرتے انہیں مانتھرس سے لندن آنے میں چوبیس گھنٹے لگ ہی گئے۔

اسپتال پہنچے، ڈاکٹر ز سے ماں کے متعلق تفصیل

بریفنگ لے کر ان کے کمرے میں آنے کے لیے کچھ دیر کی اجازت ملی۔ بے حد وجہ اور اس سے بھی زیادہ دولت مند شخصیت، عمر نصف صدی کو تھوڑی سی تھی مگر وقت کی محبوب کی طرح مہربان، بس اس سادہ نرمی اور پیار سے چھوٹا ہوا نکل گیا تھا۔

عبدالعید خان بیڈ کے سرہانے کمرے کے باہر سے دیکھ رہے تھے اور نرس بہت مرعوب و متحیر ہو کر چوری چوری انہیں دیکھ رہی تھی۔ مشہور برلن ٹائیگن مسٹر میڈی کو، جو اچانک ہی اس کی طرف مڑے تھے۔ نرس گڑبڑا کر سیدھی ہوئی تھی۔

”مجھے ڈاکٹر سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ مسٹر میڈی کی زبان کے ساتھ ساتھ لب و لہجہ بھی برطانوی تھا، کیوں نہ ہوتا ان کی پیدائش ہندوستان تھی۔ پاکستانی نژاد برطانوی مسٹر میڈی، ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتے تھے، نرس نے کروادی۔

ان کی فرمائش یا درخواست سن کر ڈاکٹر زیادہ حیران نہیں ہوا۔ ان کے پاس مختلف مذاہب کے مریض آتے تھے اور اکثر مریضوں کے لواحقین، مریض کے سرہانے بیٹھ کر دعائیں کرنے پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ مسٹر میڈی بھی شاید یہی چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ڈاکٹر سے درخواست کی تھی کہ وہ کچھ وقت اپنی والدہ کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر کو کوئی خاص اعتراض نہیں ہوا۔

”ٹھیک ہے، آپ کچھ دیر مریض کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خوش اخلاقی سے مسکرایا مگر مسٹر میڈی کی اگلی بات پر اس کی مسکراہٹ کچھ ماند پڑ گئی۔

”بالکل اکیلے؟“

”جی، کمرے میں کوئی نہ ہو، نرس بھی نہیں۔“ ڈاکٹر نے چند لمحے سوچا پھر اس نے مسٹر میڈی کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے مگر صرف آدھ گھنٹہ۔“

”مگر یہ تو بہت کم ہے۔“ مسٹر میڈی کے



پہلے ہی تھی اب مایوسی بھی چھا گئی۔  
پھر بے پرواہی تو پہلے ہی تھی اب مایوسی بھی چھا گئی۔  
نہیں۔ ڈاکٹر صاحب فیصلہ کر کے اٹھ گئے۔

عبدالعید خان، اپنی والدہ، مشہور مصورہ  
زرتاج مہر کے پیش کے سر ہانے کرسی پر بیٹھے تھے۔  
ان کے چہرے پر غم کی لہر تھی۔ مگر بلا خراک  
کے بارے میں فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں۔ مگر بلا خراک  
ایسے بزنس مین کی طرح انہوں نے فوری فیصلہ کیا اور

ہسکون ہو کر ماں کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔  
”مئی! آپ مجھے نہیں سن سکیں گی مگر مجھے بہت  
کچھ کہنا ہے آپ سے بہت عرصے سے میں کچھ کہنا  
چاہتا تھا آپ سے مگر کبھی آپ فارغ نہیں ہوتی  
تھیں، کبھی میں مصروف ہوتا تھا۔ کئی بار دل چاہا کہ  
مجھ جا کر اللہ کے سامنے اپنا حال بیان کروں یا  
کنفیشن باکس میں فادر کے آگے اعتراف کروں مگر  
پھر ہمیشہ یہ سوچ کر رک جاتا کہ مسجد میں اللہ ہو یا  
چرچ میں فادر، دونوں کے سامنے اپنے گناہوں کا  
اعتراف کیا جاتا ہے، میں ایک عام سا انسان ہوں۔  
کچھ گناہ گار کبھی ہوں مگر پچھلے کئی سالوں سے میری  
زندگی، میرے نہیں بلکہ میرے اپنوں کے گناہوں کی  
وجہ سے جہنم بنی ہوئی ہے۔“

مسٹر میڈی دیرے دیرے بول رہے تھے،  
انہوں نے بچپن سے سے اینڈ پائپر، ہنسل اینڈ گریٹل،  
ڈاکٹر بیکل اینڈ جیکل قسم کی کہانیاں پڑھی تھیں، بڑے  
ہوئے تو دلیم ورڈز درتھ، شیکسپیر کیٹس، شیلے اور کولریج  
کو پڑھا اگر وہ پاکستان میں ہوتے اور تائی کے پاس  
ہوتے تو وہ، نواسے کو حاتم طائی کی کہانیاں، الہ دین  
کے قصوں سمیت پوری الف لیلہ سنا بھی دیتیں، پڑھا  
بھی دیتیں، میرامن کی ”باغ و بہار“ بھی جس کا نام  
بھی عبدالعید خان نے کبھی نہیں سنا تھا، حتیٰ کہ اپنی  
ماں کی زبان سے بھی نہیں جو اپنے بچپن میں بڑے  
شوق سے پڑھا کرتی تھیں کہ مسٹر میڈی کو علم ہوتا کہ  
”قصہ چار درویش“ کیا ہے۔ پھر شاید وہ اپنی آپ

جتنی سناتے ہوئے ماں سے کچھ یوں طالب ہوتے  
کہ پہلے درویش کی کہانی سنئے۔

یہ قصہ اپنی جگہ ایک الگ اور بحث طلب معاملہ  
ہے کہ 2000ء میں مغرب کے رنگ میں رگتے،  
دو جہازیں کاروبار کرنے والے کسی بزنس مین پر کیا  
درویشی کی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے؟ مسٹر  
میڈی کو ان سب باتوں سے کیا۔ وہ بس اپنے دل کا  
بوجھ ہلکا کر رہے تھے تو قصہ پہلے درویش کا۔  
عبدالعید خان، والدین کی پہلی اولاد،

والدین بھی کون..... حسن و خوب صورتی جن کی غلام  
تھی۔ شہرت جن کے آگے پیچھے پھرتی تھی اور دولت  
جن کے آگے ہاتھ باندھے ٹھہری رہتی تھی۔ تو اس  
کے والد سید مہر علی خان جو ایک کامیاب بزنس مین  
تھے اور اعلیٰ برطانوی حلقوں میں لارڈ کے خطاب  
سے مشہور تھے۔ دیسی لوگ انہیں نواب جانتے اور  
گردانتے تھے۔ زرتاج مہر، لندن اسکول آف  
آرٹ کی تعلیم یافتہ، ایک باکمال مصورہ تھیں۔ مہر علی  
کی فرسٹ کزن، سگی چچا زاد اور ان کی پسند بھی۔

جس ماحول میں عبدالعید خان نے آنکھ  
کھولی، ان پر سونے کا چھپرہ منہ میں لے کر پیدا ہونے  
کی تہمت بآسانی لگائی جا سکتی تھی۔ مگر کا ماحول اور  
والدین کے طور طریق مکمل مغربی تھے مگر تھوڑا بہت  
مذہب اور مشرقی تہذیب کا بھی دخل تھا۔ عید، بقر عید  
پہ شیر دانی پہن کر والد کے ہمراہ عید کی نماز پڑھنے  
جاتے۔ گھر میں دعوتیں ہوتیں جن میں اعلیٰ طبقہ مدعو  
ہوتا۔ 1960ء کی دہائی کا زمانہ تھا۔ ہندوستان،  
پاکستان کے کالوں نے برطانیہ خصوصاً لندن جانا،  
رہنا اور بسنا شروع کر دیا تھا۔

گورڈن کے دماغ میں برتری کا خناس اب بھی  
سہایا ہوا تھا۔ تعصب دل کھول کے تھا۔ بدیسی افراد کے  
لیے وہاں قدم جمانا آسان نہیں تھا مگر کچھ گئے پنے  
افراد اور گھرانے تھے جو اپنی بے تحاشا ثروت و شہرت  
اور ”سلطنت انگلشیہ کے وفادار“ کی حیثیت سے وہاں



مقبول عام اور منظور نظر کی حیثیت رکھتے تھے۔

مہرولی کے والد اور دادا نے اس وقت سلطنت انگلشیہ سے وفاداری بھائی جب برصغیر سمیت قریب آدھی دنیا پر ان کے اقتدار و اقبال کا سورج چمک رہا تھا۔ ابھی غروب نہیں ہوتا تھا، ہمیشہ طلوع کا سماں رہتا تھا۔

پھر غلاموں کی بے داری اور جی داری نے اور گردش ایام کے مخصوص فلسفے نے آدھی دنیا پر حکمران قوم کو اس کے اپنے شہر لندن تک محدود کر دیا۔ اقتدار و اقبال کا سورج غروب ہو گیا۔ پچھلے غلام اب برابری کی سطح پر آنے لگے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے

کہ انگریز قوم کی وفاداری اور خیر خواہی گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

مہرولی خان ایسے ہی ایک خانوادے کی تیسری نسل سے تھے اور اب چوتھی نسل عبدالعید خان، والدین سے ورثے میں ملنے والی ذہانت اور دجاہت کا نمونہ، اپنی ہی قوم کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھنے کا جذبہ، غرور کی حدوں سے بھی آگے نکل چکا تھا۔

پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد مہرولی خان نے کاؤنٹی میں نئی جائیداد خریدی تھی۔ بے شمار کمروں اور بڑے بڑے ہالوں، وسیع درجوں اور سفید و سیاہ ماربل والی عالی شان حویلی اور اس سے ملحقہ جاگیر، جہاں کے میدانوں اور چراگاہوں میں عبدالعید نے نشانے بازی اور گھڑ سواری سیکھی۔ آکسفورڈ سے فارغ التحصیل عبدالعید کو اس کے دور طالب علمی ہی میں میڈی کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔

والدین کی مصروفیات اپنی جگہ تھیں اور بے پناہ تھیں۔ زرتاج مہر کا نام اور کام ملکی سطح پر اپنی ایک مستحکم شناخت بنا چکا تھا۔

مہرولی کے ملکی وغیر ملکی کاروبار، جائیدادوں اور تقاضا پسندی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی کاروباری مصروفیات اور تفریحی مشاغل میں بھی وہ بیوی اور بچوں کے لیے وقت نکال ہی لیتے۔ عبدالعید کے بعد عبدالہادی جو ہیڈی بن گیا اور پھر دو جڑواں بیٹے

عبدالواسع اور عبدالقاریج، مہرولی خان کی جان اپنے چاروں بیٹوں میں بندھی۔

”میرا نام اور میرا کام میرے بیٹے زندہ رکھیں گے۔“ وہ فخر سے اپنے بیٹوں کو دیکھتے اور ان کی گردن میں سر یا مزید سخت ہو جاتا۔

سارہ کو کتنی اس مشہور اور بہت بڑی فرم میں ملازم تھی جس کی خدمات مہرولی خان نے اپنی حویلی کی تزئین نو کے لیے حاصل کی تھیں۔ سارہ باہر انٹیریئر ڈیکوریشن تھی۔ ساتھ ہی حسین اور جوان بھی، اس کا حسن وہی تھا جسے مشرق میں، شاعر نے چاند سے تشبیہ دی ہے اور جوانی وہی جسے شاعر نے کنول

کہا، میڈی اردو شاعری نہیں جانتا تھا نہ ہی سمجھتا تھا مگر محبت کی زبان دنیا کے ہر خطے میں ایک ہی ہے۔ وہ سارہ کے چاند جیسے حسن اور کنول سی جوانی سے ہی متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے غضب کے جمالیاتی ذوق اور نفاست و متانت نے بھی میڈی کا دل جیت لیا کہ وہ دل غزل کہنے کو چاہنے لگا۔

دیے تو وہ کب کا بالغ ہو چکا تھا۔ باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا مگر شادی کرنے کا قدم اکیلے، چپ چاپ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مشرق کی کچھ اقدار اور تہذیب گھر میں ابھی موجود تھیں۔ شادی کے معاملے میں والدین کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ جیسے ہی لیا، ایک بھونچال سا آ گیا۔

”تم پاگل ہو گئے ہو میڈی! تمہیں کوئی اور لڑکی نہیں ملی شادی لیے؟“ زرتاج مہر چلا میں۔

”تم نے اسے پروپوز کیا ہے یا اس نے تمہیں پروپوز کیا ہے؟“ باپ نے سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے لہجے میں سختی اور آنکھوں میں خشونت بھری۔

”ڈیڈ!“ میڈی نے ایسے ہی جھٹکے لہجے میں انہیں مخاطب کیا جیسے اس کے دماغی طرف آتش دان میں لکڑیاں سرخ شعلوں کے درمیان جلتے ہوئے رہی تھیں۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہارے ڈیڈ، تم اس



ہے، انہی مہذب اور آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ، تم نے اس پر بھی غور نہیں کیا؟ تم دونوں کی کتنی دلچسپیاں شوق اور مشاغل مشترکہ ہیں، میں تو اسی معاملے میں تھی کہ تم زہرہ کو منتخب کرو گے۔"

زرتاج مہراب تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں۔ بٹے کی آنکھوں میں بغاوت اور شوہر کی آنکھوں میں سختی اور سرد مہری صاف نظر آ رہی تھی۔

"میں سارہ سے محبت کرتا ہوں۔" میڈی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ وہ مزید کچھ کہنے، سننے کی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"وہ تمہارا بیچھا چھوڑ دے تو یہ محبت بھی تمہارا بیچھا چھوڑ دے گی۔"

مہرولی خان استہزائیہ انداز میں بولے۔

## ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ٹاؤلز

ملاال زیت 300/- آمنہ ریاض

بڑا آدھی 400/- نسیم سحر قریشی

فصل غم کا گوشوارہ 300/- رضیہ جمیل

دل اک بکشن 300/- رضیہ جمیل

سوچ بھر کی زانی 350/- رضیہ جمیل

حتا 550/- نادرہ خاتون

چلپن 300/- نادرہ خاتون

پندرہواں گنگوٹے کے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی، فون 32216381

اور یہ سب کچھ ہمارے اندر سے ہو رہا ہے، ہو کہ جس سے نظر نہیں آتا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔"

زرتاج نے کہا ہے۔ اپنے شوہر کو چھوڑ چکی ہے۔ سب آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔

بھڑا آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔

بھڑا آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔

بھڑا آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔ سب آئیں گے شادی میں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انسان اپنے ماضی سے بے کشتی چھٹا چھڑا لے، کتنا ہی اسے فراموش کر کے شہ پر مٹی ڈال دے، ماضی اندر ہی اندر چسپا بنا کر بندھتا ہے۔

کبھی حال اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتا ہے۔ نکتہ نمبر کا احساس ہوا کہ انہوں نے کیا کہا ہے تو یہ ماضی کی خاموشی ہو گئی۔ منظر اس کی کیفیت میں شہ پر مٹی کی بجائے گیس، پتھر پیلے ہی حیران تھا۔

نہری شہری کا خاندان اور رشتے داروں سے تعلق؟ یہ نہ اپنی معاملہ ہے۔ لوگ کیا کہیں گے اس بات کا کیا مطلب؟

میڈی کے بے حد توجہ چہرے پر ابھرنے لگی۔ غریب، بچوں میں رہے، بٹے اور بٹے والے کے لیے پناہ گزین شہری خیریت سمجھتے باہر تھا۔

تمہاری دوست ڈاکٹر گلارک اتنی خوب صورت اور طاقتور خواتین ہے اور مسٹر ہلال کریم لڑنے کی لگن اور ہمت، ماضی و ماضی اس پر ختم



”سارہ کو سن چاہے کتنی ہی بڑی فرم سے منسلک ہو، کتنی ہی ماہر انٹیریئر ڈیکور میٹر ہو، بھی تو آخر ایک ملازمہ، معاد نے کے عوض ان کے گھر کام کرنے والی ایک ملازمہ، اس عورت کو بہو کے روپ میں دیکھنا ان کے لیے تو ناقابل برداشت تھا۔

”مئی! ڈیڈ کو سمجھائیں پلیز۔“ میڈی کا چہرہ غصے اور امانت کے احساس سے سرخ پڑنے لگا تھا۔

”مجھنے کی ضرورت مجھے نہیں، تمہیں ہے۔“ وہ بدستور ہونا کے خوشبودار سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے انگارے چارے تھے۔

”ہم کن اور کھوڑا بھی خریدتے ہیں تو اعلانل کا خریدتے ہیں۔ حسب نسب دیکھ کر خریدتے ہیں تمہاری اگلی نسل کے لیے ایسی عورت نہیں چاہیے جو اپنے بیک گراؤنڈ میں ایک معمولی سا خاندان اور نہ جانے کس قماش کا شوہر رہتی ہو۔“

مہرولی خان کے لہجے میں ایسی حقارت تھی جو کسی کو کھڑے کھڑے خاک میں ملا دے۔ میڈی بھی ان ہی کا بیٹا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے باپ کے کہے پہ خاک ڈالی اور گھر سے نکل گیا۔

ایک چھوٹے سے فلیٹ میں وہ سارہ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

”مہر! اسے گھر لے کر آئیں، وہ ایسی گندی سندی جگہوں پر رہنے کا عادی نہیں ہے۔“ زرتاج مہر پریشان ہو چلی تھیں۔

”رہنے دو، دو چار دن، دماغ درست ہوگا تو خود ہی واپس آ جائے گا۔“ مہرولی خان اس وقت پیرس میں تھے، بیوی سے فون پہ بات کرتے ہوئے لاہور واپس سے ہوئے۔

”کیسے رہنے دوں، میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں، بہت نازک مزاج ہے وہ، چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی اس نے کم تر معیار پر بھی جھوٹا نہیں کیا۔ پتا نہیں اتنے لو اسٹینڈرڈ آف لائف میں وہ کیسے رہتا ہوگا۔“

”جوانی اور محبت کا نیا نیا شمار ہے، یہ ٹینک اور

ختم ہو گا تو اپنے نکل اور نکل کی ساری آرائشیں آ جائیں گی۔“

مہرولی کے یہاں فولاد کے کارخانے تھے، مزاج اور دل بھی اپنی فیکٹری کے خام مال جیسا ہو گیا تھا۔ انتہائی سخت۔ یوں بھی بیٹے کے اس معاملے میں نرمی اور لچک دکھانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

زرتاج مہر اپنے وسیع و عریض پیندرم میں بے چینی سے نکل رہی تھیں۔ انتہائی قیمتی ساگوان کی لکڑی سے بنے بھاری فرنیچر سے آراستہ وہی اس کمرے میں دیوار پہ آدھریاں مائیکل انجیلو کا بڑا وٹایا شاہکار سارہ کو سن کا منہ کر دیا تھا۔ تصویر میں حضرت بی بی مریم خنہ عیسیٰ کو گود میں لیے ہوئے تھیں، زرتاج مہر تصویر کے سامنے کھڑی اسے دیکھتے ہوئے معید کو یاد کر رہی تھیں، ان کے کانوں میں شوہر کے الفاظ گونج رہے تھے۔ پہلا نشہ اتارنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سے اگلا نشہ انتہائی اثر انگیز ہوگا۔ اس پہلو پر سوچتی رہیں، سوچتی رہیں پھر ان کی سمجھ میں ہی گیا کہ سارہ کو سن نامی نشے کا توڑ کیا ہے۔

☆☆☆

فضا میں بھاری خوشبو رچی ہوئی تھی، سبز گھاس کی نمی جو توتلے محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر دکھائی دے رہی تھی۔ یہ بہت ہی وسیع و عریض قطعہ زمین تھا۔ جا بجا پھولوں کے تختے اپنی شان دکھا رہے تھے، خوشبو مہکا رہے تھے۔ اسٹنڈرڈ اپ، ڈیزل، گی، گلاب اور بلوبلز، وائلٹ اور پرم روز نے چاروں طرف آتش بازی کا سماں باندھ رکھا تھا۔ رنگ رنگی پھولوں سے پھولوں نے فضا میں آگ کی میٹھی میٹھی آنکھیں

نظر دوں کو، دلوں کو فرحت بخش رہی تھی۔

معید کے ہمراہ چلتے ہوئے زہرہ پروین نے ایک نظر اسے دیکھا، جو جدید فیشن کے گرے سوٹ میں ملبوس انتہائی وجہہ لگ رہا تھا۔ اس نے آڈی مائیک نکال کر بال بنائے ہوئے تھے۔ زہرہ کو ہاتھ

کھینچ کر لے کر آگے بڑھ گئی۔

”مہر! اسے گھر لے کر آئیں، وہ ایسی گندی سندی جگہوں پر رہنے کا عادی نہیں ہے۔“ زرتاج مہر پریشان ہو چلی تھیں۔

”رہنے دو، دو چار دن، دماغ درست ہوگا تو خود ہی واپس آ جائے گا۔“ مہرولی خان اس وقت پیرس میں تھے، بیوی سے فون پہ بات کرتے ہوئے لاہور واپس سے ہوئے۔

”کیسے رہنے دوں، میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں، بہت نازک مزاج ہے وہ، چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی اس نے کم تر معیار پر بھی جھوٹا نہیں کیا۔ پتا نہیں اتنے لو اسٹینڈرڈ آف لائف میں وہ کیسے رہتا ہوگا۔“

”جوانی اور محبت کا نیا نیا شمار ہے، یہ ٹینک اور

کھینچ کر لے کر آگے بڑھ گئی۔

”مہر! اسے گھر لے کر آئیں، وہ ایسی گندی سندی جگہوں پر رہنے کا عادی نہیں ہے۔“ زرتاج مہر پریشان ہو چلی تھیں۔

”رہنے دو، دو چار دن، دماغ درست ہوگا تو خود ہی واپس آ جائے گا۔“ مہرولی خان اس وقت پیرس میں تھے، بیوی سے فون پہ بات کرتے ہوئے لاہور واپس سے ہوئے۔

”کیسے رہنے دوں، میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں، بہت نازک مزاج ہے وہ، چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی اس نے کم تر معیار پر بھی جھوٹا نہیں کیا۔ پتا نہیں اتنے لو اسٹینڈرڈ آف لائف میں وہ کیسے رہتا ہوگا۔“

”جوانی اور محبت کا نیا نیا شمار ہے، یہ ٹینک اور



پوری طرح اٹھانے پر ہاتھ اسے دیکھنے کے لیے۔ وہ  
 قہقہے اٹھاتے دروازے پر تڑپا ہوا بھی مگر معید کے  
 پر بھی سیدھے تک ہی آتی تھی۔  
 ”تو اس بار اپنی سالگرہ تم اکیلے ہی منا رہی ہو؟“  
 باغ کی روش پر ٹپکتے ہوئے معید نے اس بے  
 پرواہ صورت لڑکی کو مخاطب کیا جو فل اسکرٹ اور  
 گلابی رنگ کے بلاؤز میں ملبوس تھی، سلی سیزن  
 (سوم ہیر) کی رعایت سے اس نے بہت ہی  
 خوب صورت ہیٹ سر پر پہنا ہوا تھا۔ گلابی رہن اور  
 پھولوں سے آراستہ دو جامہ زیب تھی جو چوتھی اس پر  
 یوں سج جاتا جیسے اسی کے لیے بنا ہو، بوڈ اسٹریٹ کی  
 ایک ماہر مشاطہ نے اسے یوں سنوارا تھا کہ میک۔  
 اپ کہیں نظر نہیں آتا تھا، نظر آتے تھے تو اس کے بے  
 حد جاذب نظر اور دلکش نقوش۔

”اکیلے؟“ زہرہ نے اپنی بے حد خوب  
 صورت مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ ”تم ہونا  
 میرے خاص مہمان۔“

”میرا خیال تھا کہ ہر سال کی طرح بہت بڑی  
 اور شان دار تقریب ہوگی۔“

”اود، وہ جب کی بات تھی، جب میں چھوٹی  
 تھی۔ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ میں نے پاپا سے  
 کہہ دیا تھا کہ اٹھارویں سالگرہ تک آپ کی مرضی  
 چلی گی، اس کے بعد میری، سو، اب آج اپنی  
 انیسویں سالگرہ میں اپنی مرضی سے منا رہی ہوں۔“

زہرہ اس کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر ٹپکتی جا  
 رہی تھی، بولتی جا رہی تھی یاغ کے پرندوں کی چہکار بھی  
 اس کے لفظوں کے ہمراہ تھی۔

”فقط ایک مہمان کے ساتھ۔“ معید  
 مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے وہ گریگوری پیک سے  
 بہت مشابہت نظر آتا تھا مگر اس سے زیادہ وجیہ اور  
 شان دار دکھتا تھا۔

”بہت بڑا اجہوم جس سے آپ اجنبیت محسوس  
 کریں، اسے اکٹھا کر کے کیا کرتا ہے، اس سے بہتر  
 ایک دوست کا ساتھ ہے جو مانوس ہو، اپنا ہو۔ جس

کی تربیت دل کو خوشی دے۔“  
 ”تم جانتی ہو زہرہ! میں سارہ سے محبت کرتا  
 ہوں۔“ معید اچانک ہی بولا تھا۔  
 ”تم مجھے بتا رہے ہو یا خود کو؟“ زہرہ کی ہنسی  
 بڑی جان لیوا تھی۔

معید کا دل کئی دایوں میں بھگ رہا تھا، ساری  
 دایاں بڑی حسین اور دل لبھانے والی تھیں۔ زہرہ  
 نے جیسے جیسے اس کا ہاتھ تھاما۔

”میڈی! میں پہلی بار تم سے ملتی تھی تو بارہ سال کی  
 تھی اور تم سترہ سال کے، سات سال ہو گئے ہیں ہماری  
 دوستی کو اور میں صرف اپنے دوست کو اپنی خوشیوں میں  
 شریک کرنا چاہتی ہوں، اس سے، اس کی خوشیاں نہیں  
 چھیننا چاہتی۔ کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟“ زہرہ نے ذہناً  
 ہی اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ معید کے چہرے پہ  
 ندامت کا سایہ لہرایا۔

”تو پھر، کیا پروگرام ہے؟ پکا ڈلی چلیں۔ ٹریفنگر  
 اسکوائر پر کیتروں کو دانہ ڈالیں گے اور پھر دیسٹ اینڈ  
 چلتے ہیں، تھیںز دیکھتے ہوئے بہت دن ہو گئے۔“  
 ”یا پھر؟“

”پاپا پھر میں، تم، پیانو اور گیت۔“ زہرہ نے  
 دوسرا آپشن بتایا۔

معید کی آنکھوں میں ایک غیر محسوس سی چمک  
 آگئی۔

”بورنگ تھیٹر سے بہتر ہے، تمہاری سریلی  
 آواز میں مدحر گیت سن لوں۔“

زہرہ بچپن سے ہی پیانو سیکھ کر بجا رہی تھی اور اب  
 موسیقی میں پیکر کر رہی تھی، آخری سال تھا۔ وہ ایک  
 منجھی ہوئی خوش گلو آرسٹ تھی۔ معید پہلی بار اس سے ملا  
 تو وہ پیانو ہی بجا رہی تھی اور معید کی طرف اس کی پشت  
 تھی۔ معید نے اسے دیکھنے سے پہلے اس کی دلکش دھن  
 سنی تھی۔ اس سے پہلا تعارف موسیقی ہی تھی۔

”ٹھیک ہے، تو پھر آج کی شام تمہارے  
 نام۔“ زہرہ نے آنکھوں میں ستارے بھر کر اسے



چاہت کیا۔

آج کی سہ ماہی سے ہم۔ مسجد نے اس کا  
نرمہ ہرک کھنکھائی سہ ماہی تمام کر گیا۔  
تھیں پھولوں کی مہک کچھ اور نہ تھی۔

\*\*\*

یہ سارا آئینہ سولہ سہری، سوچ اور رات کی رہائی  
سے مہک رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سرخی میں آگ  
دک رہی تھی۔ اسلے مانے لائیں روشن کر کے کل  
پہنکائی، گھر بھر کے ذلے اور چاقوں میں چراغ پہلے  
تی روشن کر چکی تھیں، اب کبھی تھی ہی وہ شکر دہشتے کی  
طرف جارہی تھیں۔

مغرب کی آواز کے لیے یہ صاحب کی  
خصوصی اللہ اکبر کی صدا آنے ہی والی تھی۔ جب تک  
وہ وضو کرتیں، لہذا ان پوری ہو جانی اور وضو نہایت  
کر چکی یہ نماز کے لیے کھڑی ہو جاتیں۔ مرد  
صاحبان مغرب بندہ کروائیں آتے اور ان کے لیے  
کھانا لگتا، اس کھلے اور بندے سے صحن میں جہاں  
چھڑی چھڑی کیا یوں میں سج رنگ برنگے پھول  
پوری فضا اور ماحول کو معطر کیے ہوئے تھے۔

”خدا جانے باہر کیا حال ہے، قاسم علی آئے  
تو اس سے پوچھوں۔“ وضو کرتے ہوئے ماہرمت بی  
نے سوچا۔

نماز بندہ کر فارغ ہوئیں تو باورچی خانے سے  
کھڑ پڑ اور صحن سے مردوں کی آوازیں آرہی تھیں،  
اب خادما میں کھانا لگا میں کی، پہلے تو رحمت بی بھی  
ان کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتی تھیں مگر اب  
پچھلے دو سالوں سے ان کی بیماری اور ضعف کی وجہ سے  
ان پر کام کا بار بہت ہی ہلکا کر دیا گیا تھا۔ ان کے  
مالکان وضع دار اور مہربان تھے۔ ان کا بھی خیال  
رکھتے تھے اور ان کے بیٹے کا بھی جو اسی گھر میں ملازم  
تھا۔ باہر کے سارے کاموں کی ذمہ داری اسی کی  
تھی۔ رحمت بی کا کام اب صرف اتنا تھا کہ وہ کھانا  
پکانے کے دوران ملازماؤں کی نگرانی کرتیں۔ مریج  
مسالوں کا تمام ان ہی کی مرضی سے طے ہوتا کہ

پچھلے میں سال سے اس گھر کے مالکان ان کے  
کے ذائقے کے عادی ہو چکے تھے۔  
آج سے تین سال پہلے چالیس سال  
میں بیوہ ہو کر وہ اس گھر میں ملازمت کرتی  
تھیں، گود میں چھوٹا بچہ، جسے وہ اپنے گھر  
باندھ کر رکھتی تھیں، اس سے پہلے تو وہ اپنے  
نے دیں اور واپس لے لیں، اب ان کی  
امیدوں کا مرکز اور خوشی کا محور ہے۔  
نماز کے بعد حسب عادت بہت لمبی  
کر دو قارغ ہوئیں تو صحن میں گھر کے چالیس  
صاحب خانہ میرد جاہت حسین ان کے بیٹے  
میر شجاعت حسین و میر سجاد حسین اور میر  
میر سلامت حسین جو اس گھر میں تیسرے  
حیثیت رکھتا تھا۔ تقریباً کھانا کر فراغت پانے  
والے تھے۔

آج بیوی بیو (میرد جاہت کی والدہ)  
ہدایت پر رحمت بی نے گوشت کا قہر اور مٹی کی  
میں صحن اڑو کی دال پکائی تھی یا پکائی تھی۔ کمر  
گوشت کے کباب اور روٹیاں چپاتیاں جو فیروزہ  
عمدگی سے پکانے لگی تھی۔ کھانے کے بعد قاسم علی  
حق تازہ کر کے میرد جاہت حسین کے آگے رکھا۔  
”حالات کی کیا خبر خبر ہے؟ میرٹھ سے جو  
آئی تھیں اور پھر بجنور سے دوسرے علاقوں سے اور  
دہلی کے حالات۔“ سب ہی بہت فکرمند تھے۔

”شروعات میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی جو  
دانتوں سے کانٹے جانے والے کارتوس کے بار  
میں خبر گرم ہوئی کہ اس میں حرام جانور کی جڑبی ہے  
مسلمان سپاہیوں نے انگریز کمان افسر کے ہم  
کارتوس کانٹے سے انکار کیا اور حکم عدولی کی سزا پائی  
رسالے سے ستر سے اسی مسندوں کو جن جن کر لگا  
اور انہیں پابجولاں بازار میں پھرایا گیا، اگلے  
رسالے کے دوسرے سپاہیوں نے بغاوت کر دی،  
سب ہو کر چھاؤنی پہنچے اور فرنگیوں کے جنگوں  
آگ لگا دی، اپنے آقاؤں کو جانی مالی نقصان



آزادی کی لہر کو فرو کیا، فتح باب ہوا تو مفتوح قوم اور افراد کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی شدید اور ختم تھا۔ برصغیر پر مغلوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اور اب تخت و بخت کا ہوا انگریز کے سر پر بیٹھا تھا جس نے ساجد حکمران قوم یعنی مسلم قوم کو تباہ و برباد اور ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

زوال اک دم نہیں ہوتا، پست بہتی، نا اعلیٰ عیاشی، آپس کی ریشہ درانیوں، دور جدید کے تقاضوں اور علوم سے بے خبری و لاپرواہی، اس قسم کے بہت سے عوامل تھے جنہوں نے دیکھ کا کام کرتے ہوئے برصغیر پر مغلوں کے پایہ تخت کو کھوکھلا کیا اور دھیرے دھیرے وہ زوال کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ علامہ اقبال نے اس سارے عمل کو فقہ ایک مصرعے میں یوں بیان کیا ہے کہ

”بے جرم منشی کی سزا مرگ مفاجات۔“

جب گیسوں پستا ہے تو صحن بھی ساتھ میں پس جاتا ہے۔“

1857ء کے بعد مسلمان، انگریز کے صواب کا شکار ہو گیا، ہر مسلمان سزا بھگت رہا تھا، عام ہو یا خاص، امیر ہو غریب، سب پر قیامت ٹوٹ پڑی، سب سے پہلے تو بادشاہ اور ان کا خاندان ہی اس ظلم و ستم اور انتقام کا نشانہ بنا۔ شہزادوں کے سر کاٹ کر طشت میں سجا کر ایک باپ کے سامنے پیش کیے گئے جو بد قسمتی سے معزول بادشاہ تھا۔ مخلوں میں ناز و نعم سے ملنے والے شہزادے، شہزادیاں جو موت سے بچ گئے تو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئے۔

ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بھانسی پہ چڑھائے گئے۔ ہندوؤں کی باڑھ کے آگے گرائے گئے، جیلوں میں قید ہوئے، کالے پانی کی سزا ہوئی، جائیدادیں ضبط ہوئیں۔

جو عرش پہ تھے، فرش پہ آ گئے، جو معزز تھے عزت دار تھے، ذلیل خوار ہو گئے، بادشاہ سلامت بہادر شاہ ظفر رنگون کے قید خانے میں اسیر ہوئے اور وہیں فوت اور دفن ہوئے۔

جدوجہد والی روزہ تھا برطانیہ 10 مئی 1857ء کے روز یہ سپاہی دلی پہنچے اور انگریز کے خلاف مہم بغاوت بلند کیا۔ انگریز نے اس لڑائی کو بغیر کام دیا جو بدورتج اب سنی شہروں میں پھیل رہی تھی مگر حقیقت اس جنگ میں مسلمانوں کے پاس کوئی واضح حکمت عملی اور مضبوط منصوبہ بندی نہیں تھی، بغاوت کا بھی خدا تھا۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر بے دست و پا تھے، اختیار تھا نہیں، اقتدار نام کا تھا، خزانہ خالی تھا، جدوجہد آزادی کے سپاہیوں کو دینے کے لیے تنخواہ بھی نہ کوئی مالی مدد، بادشاہ سلامت خود انگریزوں کے دہلید خوار تھے اور ان حالات میں وہ وظیفہ بلانا بھی بند ہو گیا تھا۔ فوج کے پاس خوراک بھی نہ اسلحہ، اندرونی کشمکش اور اختلاف الگ تھا۔

جنرل بخت خان نے اپنی سی کوشش کی مگر وہ کام رہا۔ انگریز نے اپنی حکومت کو جو اس وقت کمپنی کی حکومت کہلاتی تھی۔ شکم کرنے اور رکھنے کے حکم اقدامات کیے ہوئے تھے۔

ان کے جاسوس مختلف شہروں خصوصاً دہلی شہر میں پھیلے ہوئے تھے جو پل پل کی رپورٹ سے سرکار انگلیہ کو آگاہ کر رہے تھے۔ ان جاسوسوں میں ستانی ہند بھی تھے اور مسلمان بھی، انگریزی جاسوسی کا نیٹ ورک اور انٹیلی جنس نظام منظم اور مربوط تھا جس کی پہنچ اور رسائی فوج کے اندر تک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز نے حکومت پر پڑنے والی اس آخری ضرب کو بھی با آسانی تہہ پہنچ کر دیا اور اب اگلے نوے سالوں تک کے لیے وہ اس برصغیر پر حکومت کرنے کے لیے آزاد تھا۔

1947ء تک وہ یہاں براجمان رہا تاوقتیکہ مسلمان ہند نے قائد اعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں اپنے لیے ایک علیحدہ مملکت بنام پاکستان نہ مانگ لی۔

انگریز نے اپنے خلاف اٹھنے والی جدوجہد



کہتا ہے بد نصیب قنبر کہ دفن کے لیے  
 دو گز زمین بھی نہ ملی کوہ پٹنہ یار میں  
 چشم فلک اس بھارے سے ممکن ضرور بھی مگر  
 حیران نہیں، وہ تو ہزاروں سالوں سے یہ مناظر دیکھ  
 رہی تھی اور سگری و جہاں بانی کے معاملے میں اللہ کا  
 قانون جانتی تھی کہ جب کوئی قوم زمین پر حکومت و  
 قیادت کے قابل نہیں رہتی اور زوال و تباہی کا شکار  
 ہونے لگتا ہے تو اللہ اسے ہٹا کر دوسری قوم لے آتا  
 ہے جو جانشین کی اہلی ہوتی ہے، وہ اقتدار کے  
 ستم اس پر اجماع ہو جاتی ہے۔

جو ہاتھ بڑھا کر اٹھالے، جام اسی کا ہے  
 تو 1857ء میں قلم و زوال کا شکار ہونے  
 والے مسلم معاشرے میں دہلی کے بہت سے  
 گھرانوں کے ساتھ ساتھ میر و جاہت حسین کا  
 گھرانہ بھی تھا جنہیں قلعہ والوں کے ساتھ تعلق و  
 ہمدری اور تعاون کے صلے میں لرزہ خیز نتائج کا  
 سامنا کرنا پڑا، ان کی ساری جائیداد ضبط ہو گئی اور گھر  
 کے تمام مردوں کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ گھر کی عورتیں  
 اور بچے در بدر ہو گئے۔

☆ ☆ ☆  
 چراغ کی لرزنی روشنی کا سایہ سفیدی پھری  
 دیوار پر پڑ رہا تھا، وہ پانچ بڑھیا عورتیں تھیں جو  
 دائرے کی شکل میں بیٹھی تھیں، مغموم، بے بس اور  
 آزرہ۔

”بھئی، بھال، یہ کیا ہم پر بادشاہی کریں  
 گے۔ بنیا گیری کرنے آئے تھے، کل میں کس بیٹھے،  
 قلعہ کے داروغہ بن گئے۔“

ایک بڑھیا نے جلے دل کے پھپھولے  
 پھوڑے، اس کے جھریوں بھرے چہرے پر حزن و  
 ملال کی کیفیت تھی اور دم دھننے کی بھی۔

”ارے یہ مونے فرنگی، ان کی توپوں میں  
 کیڑے پڑیں۔ مریں تو ناپاک جالور کا منہ ہو۔ کوئی  
 پانی پکانے والا نہ ہو ملک میں۔ ارے ڈھائی گھڑی کا  
 بیچہ آئے۔“ دوسری بڑھیا نے دوپٹے کی جھولی

پھینکا کر منہ بھر بھر کو سنے دیے۔

”چوٹے، لیرے میں ان کو روکی ہوئی تھی  
 لاٹ صاحب کی بھتی کھاؤں، شاہ جادو کی بھتی  
 جو روکی سب کی بھتی کھاؤں“ (کسی کے سر سے  
 کے قریبی رشتے کے گھر سے آئی روٹی، کھانا) بڑھیا  
 بڑھیا نے ہاتھ چلا چلا کر بددعا میں دیں۔

اب مصرعہ طرح پر غزل کہنے کی باری  
 بڑھیا کی تھی جس کے سفید جبک ہال چراغ کی روشنی  
 میں چمک رہے تھے، اس کی غلابی آنکھوں میں  
 ٹہرا ہوا تھا۔ اور سینہ غم کی شدت سے جل رہا تھا۔  
 نے ایک نظر اپنی ساتھیوں پر ڈالی۔

”میں اللہ کے آگے جھولی پھیلاتی ہوں  
 ولایت میں گدھے مل چلاؤں۔ الو بولیں، گیدڑ  
 کی منخوس آوازیں سدا ان فرنگیوں کے کانوں  
 رہیں۔ اونٹ پہ چڑھ کے کتا کائے انہیں، اللہ  
 نازل ہوا ان پر، اللہ کا غضب ٹوٹے۔“

وہ بھی اپنا فرض ادا کر کے خاموش ہو گئی،  
 سب خنجر نگاہوں سے پانچویں بڑھیا کو دیکھ  
 تھیں جو سر جھکائے، آنکھیں بند کیے جانے  
 گہری سوچ میں گم تھی۔

”رحمت بی! کن خیالوں میں گم ہو؟“  
 بڑھیا نے رحمت بی کو ہاتھ لگایا۔ ہاتھ لگاتے  
 کسی ٹھنڈی کی طرح آگے کو لڑھک گئی۔

”ہائے رحمت بی.....!“ چاروں بڑھیاؤں  
 بیک وقت لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔

☆☆☆

دہلی جو عالم میں انتخاب تھا، ہندوستان  
 جان اور اس کا دل تھا۔ اس شہر میں، اس دل  
 قیامت کا سماں تھا۔ انگریزی توپوں کے دھماکے  
 آتش ناک گولے قلعے کی سمت برسار رہے تھے جو  
 دہشت ناک آوازوں سے دل سہے جاتے تھے  
 مغل بادشاہت آخری سانس لے رہی تھی، تختہ  
 تاج لٹ رہا تھا، دہلی کے لال قلعے میں پانچ  
 ہر اس کا منظر تھا۔ سب اپنی اپنی جانیں بچانے۔







مخبری کس نے کی؟

☆☆☆

قلیت چھوڑا تھا، کم از کم اس محل کے مقابلے میں تو کچھ نہیں تھا جہاں سے معید آیا تھا مگر پھر بھی خوب صورت، طاقت اور عمدگی کے ساتھ ساتھ کچھ اور دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کسی سیارہ آرتھک ذہن کا کارنامہ ہے۔ زہرہ نے قریب نظروں سے درود یوار کا جائزہ لیا اور معید کی طرف متوجہ ہوئی۔

”پھر؟ تم لوگ شادی کب کر رہے ہو؟“

میڈی اپنے ہر دوست کو اس قسم کی سوالیہ اجازت بھی نہیں دے سکتا تھا مگر زہرہ اس کی بہت خاص دوست تھی وہ معید سے ہر بات کر سکتی تھی سوال کر سکتی تھی، بے تکلفی سے کوئی بھی فرمائش کر سکتی تھی، ہر بات اس سے منوا سکتی تھی۔

”بہت جلد! سارہ کے کچھ پروجیکٹ تھے ختم ہو جائیں پھر۔“ معید کا لہجہ ذرا ڈھل سا تھا۔

”کافی پیو گی؟“ وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

”ہاں، تمہارے ساتھ کافی پینا یقیناً بہت اچھا لگتا ہے مگر یہاں نہیں باہر چلتے ہیں۔“ زہرہ مسکراتی ہوئی اس سے وہاں تک روشنی ہی پھیل گئی۔

معید کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس روشنی میں خود کو گم کر لے یا شاید دریافت کر لے۔ خوش نصیب تھا بہت، کہ دنیا کی دو بے حد حسد لڑکیاں اس کی زندگی میں تھیں، ایک محبوبہ تھی اور دوسری دوست، مگر یہ خوش نصیبی اسے بے حد اچھے میں ڈال رہی تھی۔ کافی کا کھونٹ بھرتے ہوئے اس نے چور نظروں سے زہرہ کا تائناک چہرہ دیکھا۔

نہیں اسی لمحے اسے سارہ کا خیال آ گیا۔ اپنی نظروں کی چوری اور دل کی خیانت نے خود کو ملامت کر کے شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور زہرہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو اوجی لیاؤس جیل کے بارے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔ معید ڈرامے کے مقابلے میں پہلے رخصت ہند تھا۔

”وہل مسٹر میر و جاہت حسین آپ ہیں؟“ لال چندر کے سے منہ والا انگریز انسر اپنی گوراشادی اور دو سال سے غائب تھا۔

”تمہارے پاس انڈر میٹن ہے کہ آپ نے اپنی حویلی کے صحن میں پتو بانیوں کو چھپایا ہوا ہے۔“ انسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دہریہ لڑکا تھا اور میر صاحب کے چہرے کا رنگ متحیر ہو گیا، سانس رک گئی ایک لمحے کو مگر اگلے ہی لمحے انہوں نے خود کو سنبھالا۔

”آپ کی انڈر میٹن قلعہ ہے، یہاں تمہارے گھر والوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“

”انڈر میٹن جھوٹ نہیں ہے، جھوٹ آپ بولتا ہے۔“ انسر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ میر صاحب کے سینے پر سگیت کی ٹوک رکھ کر کھڑے ہو گئے، انسر دو سپاہیوں کے ساتھ سیدھا تمدن حریف بڑھ گیا۔

”رک جائیے گور صاحب! اندر زان خان ہے۔“

”تم صحن کا راستہ جانتا ہے اور وہ آپ کا لیڈر لوگ سے الگ ہے۔“ انسر کا لہجہ بدستور درست تھا۔

میر صاحب بے بسی سے اسے جاتا ہوا دیکھتے اسے دو مہر بہ لب تھے۔ مخبری آخر کس نے کی ہے اتحد کی بات، انتہائی راز دہنی کی بات جو گھر کے باقی افراد کے علم میں بھی نہیں، اس کی خبر کون دے گا؟ کون دے سکتا ہے قاسم علی پہ تو اپنے بیٹوں اور بھتیجے سے زیادہ اعتبار کیا تھا انہوں نے۔ پھر کون ہو سکتا ہے وہ، میر و جاہت حسین مسلسل سوچتے رہے۔ جب ان کے گھر سے مرزا صاحب اور ان کے اہل خانہ بھاگے ہوئے تھے۔

پتہ گزنیوں کو اور پتہ دینے والوں کو سب کو ایک ایک کر کے قرائین سے گولی مار دی گئی۔

آخری سانس لیتے ہوئے میر و جاہت حسین کے دماغ میں یہی سوال پھلکاریں مار رہا تھا۔ آخر



”چلے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر اپنی ’بو ٹھیک کرتے ہوئے آمادی ظاہر کی۔  
”کل میں اور می، تمہارے گھر گئے تھے، آنٹی کی عیادت کرنے۔“ زہرہ کا لہجہ سرسری تھا مگر معید چمک اٹھا۔

”سنا ہوا نام کو؟“ بے چینی اس کے لہجے میں غمی اور غم آنکھوں میں۔  
”نہو ہو گیا تھا۔ یونو، موسم کا کمال۔“ زہرہ نے کندھے اچکائے۔

زہرہ کے پہلو میں بیٹھا وہ نیلے دیکھ رہا تھا، کمال کی فنکارہ تھی۔ موج آب کی طرح ادھر سے ادھر بہہ رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو معید اس کمال فن کو بہت انجوائے کرتا مگر اس وقت اس کا دل اپنی مام میں اٹک گیا تھا۔ سارہ سے محبت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس نے اپنی باقی محبتوں کو فراموش کر دیا ہو۔ والدین سے خصوصاً ماں سے محبت تھی اسے، تب ہی ان کی خرابی طبیعت کا سن کر وہ بے چین سا تھا۔

”تم ٹھیک ہو میڈی؟“ زہرہ نے شاید اس کی بے چینی اور عدم دلچسپی بھانپ لی تھی۔ تب ہی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ میڈی نے سر ہلا کر اپنی توجہ اسٹیج کی طرف مرکوز کی۔

واپسی پر زہرہ کو گھر چھوڑ کر اس نے اپنی گاڑی کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا۔ وہاں پہنچا تو دربان نے کسی بھی قسم کی حیرانی اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر اسے وہی پردوں کو دل دیا جو دیتا چلا آیا تھا، جیسے وہ ایک ماہ بعد نہیں بلکہ معمول کے مطابق روزانہ کی طرح اپنے گھر واپس آیا ہو۔ میڈی کا ایک اندیشہ تو یہ حال غلط ثابت ہوا جو اسے باپ کے حوالے سے تھا کہ کبھی گھر میں اس کا داخلہ ہی بند نہ کر دیا گیا ہو۔

”ہاں میں می ٹھیک ہوں۔“ وہ سیدھا ان کے بیڈ روم گیا۔ کیم کی گلابی کا ہاتھ باندھا، اس نے کھینچ دی۔

”نہیں۔“ اندر سے زرتاج مہر کی آواز سنائی

دی۔ آواز میں واضح طور پر زکام کا اثر تھا۔ میڈی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کنگ سائز شاہانہ مسہری پر کمرل اوڑھے زرتاج مہر لیٹی ہوئی تھیں۔ بیٹے کو دیکھ کر ان کا چہرہ اور آنکھیں دفعتاً چمک اٹھیں، وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”آپ کیسی ہیں می؟“ معید ان کے سر ہانے آ کر برابر میں بیٹھ گیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا میڈی! تم واپس آ گئے ہو۔ اب جاؤ تو گئے نہیں نا۔“ زرتاج مہر بچوں کی سی معصومیت سے پوچھ رہی تھیں، انہیں لگا کہ زہرہ نے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے مگر اگلے ہی لمحے ان کے ارمانوں پر اوس گر گئی جب انہوں نے بیٹے کا جواب سنا۔

”میں آپ کو دیکھنے آیا ہوں می! ابھی چلا جاؤں گا۔“

”میڈی! اتنے سنگ دل تو نہ بنو۔ پورے ایک ماہ بعد تم نے اپنی شکل دکھائی ہے اور اب آتے ہی جانے کی باتیں کر رہے ہو۔“ زرتاج مہر کے چہرے پر مایوسی اور لہجے میں رقت آ گئی۔

”نہیں!“ معید نے ان کے شانے کے گرد بازو دراز کیا۔

”میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور ڈیڈ سے بھی، مگر ڈیڈ کا رویہ اور باتیں ناقابل برداشت ہیں۔“

”اچھا، کم از کم آج کی رات تو رک جاؤ۔“ زرتاج مہر نے التجا کی۔

معید نے بے اختیار ایک گہری سانس لی، کچھ دیر ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

”ٹھیک ہے، آپ کے کہنے سے میں آج رات رک جاتا ہوں۔“

”تم ہمیشہ سے میرے فرماں بردار ہو میڈی!“ فرط مسرت سے زرتاج مہر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔



”ایک منٹ، میں ابھی آتا ہوں۔“ معید ان کے پاس سے اٹھ کر ہال میں آیا اور اسٹینڈ پر رکھے سیاہ و سنہرے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر سارہ کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو۔“ سارہ کی مترنم آواز سنائی دی۔  
”سارہ! میں آج رات می کے پاس ہوں، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں کل آؤں گا۔“ معید نے مختصر اسے آگاہ کیا۔

”کل تو آؤ گے نا؟“ سارہ نے فقط ایک ہی سوال کیا تھا۔

”آف کورس۔“ معید نے اسے یقین دلایا۔  
”اوکے۔“ سارہ نے فون بند کر دیا۔

وہ ریسیور رکھ کر پیچھے مڑا تو ایک دم چونک اٹھا۔ دلی شاہ اس کے پیچھے غلے کھڑے تھے۔  
”میں نے تو سنا تھا کہ تم بھی نہ آنے کے لیے گھر چھوڑ گئے ہو۔“

ان کا لہجہ اور الفاظ ان ہی کی طرح سخت تھے۔  
بیٹے کی انا کو ان لفظوں سے، اس لہجے سے بڑی سخت چوٹ پہنچی تھی۔

”میں می کو دیکھنے اور ان سے ملنے آیا تھا۔“ معید نے اپنے چہرے کے تاثرات باپ سے بھی زیادہ سخت کرنے چاہے مگر زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔

”یہ بہانا بھی خوب ہے۔ میں و آرام چھوڑنا اتنا آسان نہیں۔ وہ بھی محلوں کا عیش و آرام، شہزادوں کی سی زندگی۔“ بڑی استہزاء سے مسکراہٹ تھی ان کی، معید سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”ڈیڈ! خاموش ہو جائیں۔“ معید نے منھیاں بھی نہیں۔

”اس چھوٹے سے ڈربے سے دل اکٹا کیا یا اس چھوٹی عورت سے؟“ دلی شاہ جب ہونے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہے تھے۔

معید کے ہاتھ سے صبر کی طنائیں چھوٹ

گئیں۔ برداشت کا مادہ ختم ہو گیا۔

”آپ.....“ اس نے باپ کی طرف اٹھائی اور سرخ چہرے سے ہامشکل بولا۔ ”آپ نا قابل برداشت ہیں۔“ وہ لہجے لہجے ڈگ بھرتا کر سے باہر نکل گیا۔

دلی شاہ نے اس کی اسپورٹس کار اشارت ہونے کی آواز سنی تو ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ بے حد غفلت کن مسکراہٹ، اپنی کسی متوجہ کامیابی سے لطف اندوز ہونے والی مسکراہٹ۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

”فریڈ کو آگاہ کر دو، اس کے پاس ایک گھر ہے۔“

ریسیور واپس رکھتے ہوئے ان کی مسکراہٹ نسبتاً جیسی تھی مگر چہرہ اور انداز پر سکون تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر انہوں نے سگار سلگایا۔ فضا میں خوشبودار تمباکو کی مہک پھیل گئی۔

☆☆☆

”کون؟“ کال بیل کی آواز سن کر سارہ دروازے کے قریب آئی۔

”میں ہوں۔“ آنے والے نے نام نہیں بتایا مگر سارہ اس آواز کو بخوبی پہچانتی تھی۔  
”کیوں آئے ہو؟“ دروازہ کھول کر سوال کرتے ہوئے سارہ کے لہجے میں سرد مہری اور آنکھوں میں اجنبیت تھی۔

”فارگاڈ سیک سارہ! اتنی کھورتو نہ بنو۔ ایک رشتہ ختم ہوا ہے۔ محبت کا نہ کسی مگر دوستی کا رشتہ تو ابھی جگہ موجود ہے۔“ آنے والا سراپا التجا بتا ہوا تھا۔ سارہ پکھلنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

”اس ایک رشتے کے ساتھ باقی سارے رشتے بھی ختم ہو گئے ہیں۔ اب بولو کیا بات ہے۔“ سارہ نے صاف گوئی کے ساتھ بے مروتی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ابھی تک دروازے کے پیچھے ایستادہ تھی اور اس کا ہنسنے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔



”سب کے بارے میں بات کرتی ہے، اگر تم  
 اس سے کہو: ”آ نے وہاں کچھ ہو گیا۔“  
 سارہ کچھ دیر ہنست کھینچے اسے صوفی رسی، بلی  
 کے سپرد کچھ چوٹی بھی ہو گئی تھی۔  
 ”کچھ ہے، مگر صرف دس منٹ۔“ اس نے  
 گویا جھپٹا رہے ہوئے مشروہ آلودگی ظاہر کی اور  
 دھڑلے کے سچ سے ہنسی۔  
 فریڈ لوئک، روم کے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔  
 سارہ کی پتھر اور گھوڑی نگاہوں کی اسے کوئی خاص  
 پروا نہیں تھی۔

”اتنی بد اخلاق تو تم کبھی نہ تھیں۔ اس سردی  
 میں براڈی کا گلاس تو جانی دشمن کو بھی پوچھ لیتے  
 ہیں۔“ فریڈ کے چہرے پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی  
 جس کے ذریعے چند سال پہلے اس نے سارہ کا دل  
 جیتا تھا۔

”تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو اور اپنا بھی۔“  
 سارہ نے بے حد اکتائے ہوئے انداز میں اس کے  
 سامنے براڈی رکھی تھی۔

”اچھا میزبان ہمیشہ مہمان کا ساتھ دیتا ہے۔“  
 فریڈ نے سامنے رکھے اکلوتے گلاس کو دیکھا پھر سارہ  
 کو جتایا۔

”میرا خیال تھا کہ شاید اب تم سدھر گئے  
 ہو گے، مگر تم بالکل ویسے ہی ہو جیسے تھے۔“ سارہ نے  
 بھی اسے جتایا اور گلاس لینے چلی گئی۔

براڈی کی طلب تو اسے بھی ہو رہی تھی۔ گلاس  
 لے کر وہ فوراً ہی آگئی تھی مگر فریڈ کے لیے یہ چند  
 سیکنڈ بھی بہت تھے۔ وہ اپنا کام دکھا چکا تھا۔ سارہ  
 کے لائے ہوئے گلاس میں وہ اپنے لیے براڈی  
 اٹھائے لگا اور اس کے آگے اپنا گلاس کھسکا دیا۔ جس  
 میں بڑی ہوشیاری سے نشا آور سفوف ملا تھا۔

”پرائی الفٹ اور قربت کے نام۔“  
 گلاس ہوا میں بلند کر کے فریڈ نے کہا اور  
 مشروب کی چسکیاں لینے لگا۔  
 ”تم کیٹ کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے؟“

سارہ نے اپنا گلاس تھکھانوں میں غرق کر دیا تھا۔  
 اسے ایک گھسیٹتی سی نگاہی کا احساس ہو رہا تھا۔  
 ”نکھاس نکھاس لو زیادہ الفٹ کی مار لے جاؤ گے  
 تھی۔“ ان کا دل اتنا بار ہے یہ انسان۔“ سارہ کا دل  
 اسے اب سمجھا رہا تھا۔

”میں، چننے میں وہ بار کیٹ سے ملنا چاہتا  
 ہوں۔“ فریڈ نے کن اٹھیں ستا ستہ دیکھتے ہوئے  
 اپنا مدعا بیان کیا۔ ”اور بکٹے میں ایک بار قمر سے۔“  
 چند لمحوں کے ذرا مانی وقفے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا  
 تھا۔

”تم.....؟“ سارہ کا چہرہ تھا اٹھلے۔ اسے فریڈ  
 سے، اس کی حنائی کی توقع نہیں تھی۔  
 ”دیکھو، طلحہ کی کا فیصلہ تمہارا تھا۔ میرے انہیں،  
 میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“ سارہ کو کچھ  
 کہنے کا موقع دیے بغیر وہ دوبارہ جلدی سے بول  
 اٹھا۔

”جس میں جو کہتا تھا، کہہ لیا۔ اب اٹھو اور چلے  
 پھر تے پھر آؤ۔“

سارہ اس سے کہنا چاہتی تھی مگر کہ نہ سکی، اس  
 کی حالت، کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ پہلے اسے لگا  
 جیسے اس کا سر گھوم رہا ہے اور زبان اینٹھ گئی ہے۔  
 ایسے اکثر گئی کہ اس سے بھائی بھی نہیں جاری تھی پھر  
 کچھ دیر بعد اسے یوں لگا جیسے اس کے چاروں طرف  
 ستارے دک رہے ہیں اور وہ خود بادلوں پر سوار۔  
 ہے۔ سبک بادلوں پر سوار کیف کے عالم میں۔ سارہ  
 نے سر جھٹک کر انھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔  
 دھندلائی ہوئی نظروں سے اس نے سامنے بیٹھے فریڈ  
 کو دیکھا مگر اس کا چہرہ بھی دھندلا ہوتے ہوئے  
 غائب ہو رہا تھا۔

☆☆☆

عام حالات میں وہ راستہ ڈیڑھ گھنٹے کا تھا مگر  
 معید نے شدید برہمی کے عالم میں وہ راستہ ایک گھنٹے  
 پانچ منٹ میں طے کیا۔ غم و غصے سے اس کا رواں  
 رواں سلگ رہا تھا۔



ماں سے ملنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ شاید باپ کا رویہ بھی کچھ تبدیل ہو گیا ہو۔ ان کی سختی اور رعونت کی جگہ نرمی نے لے لی ہو کہ ان کا لاڈلا بیٹا ایک ماہ سے، ان کی نظروں سے ادھل گیا، گھر سے دور تھا۔ مگر نہیں، وہ غلط تھا۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے، چٹان اپنے مقام سے سرک سکتی ہے، پتھر میں چونک لگ سکتی ہے مگر ولی شاہ کے دل میں نرمی اور مروت کا گزر ہونا ناممکن۔ اپنے خیالات میں کم وہ سارہ کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ فلیٹ کی ایک چابی سارہ نے اسے دی ہوئی تھی۔

دروازے کے باہر چند سیکنڈز کے لیے کھڑے رہ کر اس نے اپنے کھولتے ہوئے دماغ پر قابو پانے اور خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی پھر کی ہول میں چابی ڈال کر گھمائی۔

دروازہ کھلتے ہی وہ اپنی جھونک میں دو قدم آگے بڑھا۔ لوگ روم میں سامنے نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، وہ حقیقت ہے یا خواب، سچ ہے یا جھوٹ۔

اس نے اپنی آنکھیں ملیں، یہ دیکھنے کے لیے کہ سامنے سونے پر برائے نام لباس میں بیٹھی جو لڑکی جموم رہی ہے، وہ سارہ ہی ہے یا کوئی اور، جسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ انتہائی نشے میں تھی۔ اس کے پہاڑ میں بیٹاؤنڈم سا سرداک دم ہی اچھل کر کھڑا ہوا تو سارہ جو اس کے سہارے سے نیچی گئی، باپ اور سونے پر لاٹھک گئی۔

”اے، کون، تم؟“ فریڈ ڈالتے قدموں سے لڑکی کے قریب آیا اور اس کی طرف الٹی بڑھا کر دیکھا۔ ”اب نہ بولی، یہ میرا بیوی نام کی۔“

”اے، کون، تم؟“ فریڈ ڈالتے قدموں سے لڑکی کے قریب آیا اور اس کی طرف الٹی بڑھا کر دیکھا۔ ”اب نہ بولی، یہ میرا بیوی نام کی۔“

لہرانے لگا، اسے دیکھ کر معید کو ہلکا کر کے جانے کتنی بوتلیں چڑھائی ہوئی ہیں مگر معید یہ بھی جانتا تھا کہ فریڈ ایک بہت اچھا ایکٹر تھا۔

”کون ہو تم؟ کیا چوری کرنے آئے ہو؟“ فریڈ کے سوالات ختم نہیں ہو رہے تھے، اس کی ہلکی مستقل پتھر کا مجسمہ بنے معید کی طرف تھی۔ فریڈ پیچھے دیکھنے ہی سے نہیں بلکہ کبھی کبھی سامنے دیکھنے سے بھی پتھر بن جاتا ہے، جیسے معید بن گیا تھا۔

”اگر تم چور ہو تو میری بیوی سے زیادہ قیمتی یہاں کچھ نہیں ہے اور اپنی بیوی کو میں لے جاتے نہیں دوں گا۔ کوئی مار دوں گا اگر ایسی کوشش بھی کی تو.....“

فریڈ نے اپنی جھونک میں بولتے ہوئے اچانک ہی اس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ معید اکڑ کر لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ دروازے سے نکلا تو بے اختیار اس نے اس کا پٹ تھام لیا۔ وہ کھلا ہوا تھا، اسے سر سے ہی نہیں ملا تھا دروازہ بند کرنے کا۔ اندر قدم رکھتے ہی جیسے اس کی روح سلب ہو گئی تھی۔

”سنا تم نے، میں نے کیا کہا۔ بھاگ جا یہاں سے، میں اپنی بیوی کے آس پاس کسی برداشت نہیں کرتا۔ سوائے اپنے آپ کے۔“

فریڈ کی آواز، غراہٹ میں بدل گئی، اس نے دوبارہ معید کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھایا اسے دھکیلتے کے لیے مگر اس سے پہلے ہی معید بے اختیار خود ہی دو قدم پیچھے ہوا تو وہ دروازے سے باہر نکلا۔ ”ہی ہی ہی.....“ فریڈ نے مجنونا نہی کی گئی کے ساتھ دروازہ اس کے منہ پر زور سے بند کیا تھا۔

معید کو کچھ علم نہیں کہ وہ کیسے بیڑھیاں اڑ کر نیچے آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ اس کا پورا جسم نشہ رہا تھا، ایک ایک روٹھیلوں کھڑا تھا جیسے وہ کوئی بہت عارف پاک بھوت دیکھ کر آیا ہو۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا، وہ انوں کی طرح اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر زور سے مارے اور دھواڑیں مار مار کر روئے۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر وہ سیدھا گھر پہنچا۔



تھی، وہ ایک چھوٹی موٹی ریاست کے برابر ہی تھی۔  
اس کے ساتھ ساتھ خان بہادر کا خطاب بھی مرحمت  
کیا گیا۔

لینے والے نے مسکرا کر انعام وصول کیا اور  
واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا مگر اب چہرے کی چمک  
میں کچھ کمی آگئی تھی۔ دل کی ترنگ بھی کچھ بجھ سی گئی  
تھی۔ وہ کسی حد تک مایوس اور دل شکستہ سا ہو گیا تھا۔  
جتنے انعام و اکرام اور اعزاز کی امید تھی اس سے  
بہت کم تھا یہ جو اس وقت اسے ملا تھا۔ ایسے ایسے  
اٹلے میلے لوگ جن کی خدمات معمولی اور کارنامے  
کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، انہیں کسے کسے اعزاز و  
اکرام اور انعامات سے نوازا گیا۔ میوٹی میڈل جس  
پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر تھی۔ اشار آف انڈیا (ستارہ  
ہند) جیسے اعزازات دیے گئے اور میرے جیسا  
فحش، جس کی مخبری اور جاسوسی نے انگریز کا اقبال  
بلند کرنے میں اتنی مدد کی اسے فقط خان بہادر اور  
ایک جاگیر دے کر بھلا دیا۔

”اتنے کم پر اور اتنی آسانی سے بھلنے والا نہیں  
ہوں میں، مجھے وہی صلہ چاہیے جیسی میری خدمات  
تھیں۔ میں اور پر تک اپنی عرض داشت پیش کروں  
گا۔ اپنے حق کے لیے لڑوں گا۔“  
اپنے خیالات میں کم قاسم علی کو پتا بھی نہیں چلا  
کہ دربار برخواست ہو گیا تھا اور لوگ اپنی کرسیوں پر  
سے اٹھ رہے تھے۔

☆☆☆

اس خوب صورت چہرے پر کیا تھا، بچ یا  
جھوٹ۔ ان سبز قاتل آنکھوں میں کس کی تحریر تھی،  
دھوکے کی پابجبت کی؟  
معید کو اب کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں  
تھی۔ بے وفا کی کے زہر نے محبت کے نشے کو شتم  
کر دیا تھا۔ وہ سارہ سے بات کرنا تو کیا اس کی شکل  
بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی معذرتوں سے،  
وضاحتوں سے معید کو اب کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر سارہ  
اس کا رستہ روک کر کھڑی تھی۔

اور خالی خالی نظروں سے سامنے بھلے اندھیرے کو  
جتنے لگا۔ ایسا ہی اندھیرا اس کی آنکھوں میں بھی  
پھیل گیا تھا۔ اس کے دل میں بھی۔ اس کے جسم کے  
اندہ۔ خون کے ہر قطرے کے ساتھ وہ اندھیرا  
پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

ان وفاداروں، جانثاروں کو، جنہوں نے سرکار  
انگلینڈ کو قائم اور دائم رکھنے کے لیے 1857ء کے  
معرکے میں کارنامے انجام دیے اور اپنی خدمات بجا  
لائے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے انہیں انعام و  
اکرام دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔  
صاحب کشن بہادر کی طرف سے دربار منعقد  
کیا گیا۔ شامیانے تلے کرسیاں رکھی تھیں، جن پر  
مختلف مذاہب اور قومیتوں کے افراد بیٹھے تھے۔  
خلعت فاخرہ میں ملبوس ان تمام افراد میں ایک ہی  
بات مشترک تھی کہ ان سب نے داسے درے، شے  
آزادی کے اس معرکے میں انگریز اور انگریز حکومت  
کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔

ایک ایک کر کے چوہدار نام پکار رہا تھا اور  
مطلوبہ فرد اپنی کرسی سے اٹھ کر کشن تک جاتا جہاں  
اس کی وفاداری اور خدمات کا صلہ، اعزاز، زمین  
جاگیر اور مالی وظائف نسل در نسل تک کی صورت ادا  
کیا جا رہا تھا۔

ساتویں نمبر پر نام پکارا گیا، اپنا نام سن کر مذکورہ  
فحش کے چہرے پر مزید چمک آگئی۔ اس کی عمر تو  
اتنی نہیں تھی مگر اس کی عقل عیار تھی اور سو جھ بوجھ اور  
ہوشیاری نے چالاکی کو بھی کہیں پیچھے چھوڑا ہوا تھا۔  
آنکھوں میں فاتحانہ چمک اور چال میں فخر لیے وہ  
کشن کے در پر پہنچا۔

کشن کی آنکھ کے اشارے پر چوہدار نے میز  
پر کھڑی ایک نقری کشتی اٹھا کر آنے والے کے ہاتھوں  
میں دی۔ چاندی کی اس کشتی میں انتہائی نفاست  
سے کاغذات ایک روشنی ڈور سے بندھے تھے۔ ان  
کاغذات کی رو سے مذکورہ وفادار کو جو زمین دی گئی



”تمہیں میری بات سنی ہوگی میڈی۔“ وہ چٹان کی طرح اس کی راہ میں حائل تھی، معید کو مجبوراً رکنا پڑا۔

”میرا وقت اتنا فالتو نہیں ہے۔“ معید کے لہجے میں، آنکھوں میں، آواز میں اجنبیت تھی، نفرت تھی۔ ایک لمحے کو سارہ کی سانسیں رکنے لگیں۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالا اور بولنے لگی۔

”تم نے جو کچھ دیکھا، وہ سچ نہیں تھا۔ وہ سب ایک پلان تھا، تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لیے۔ ہمیں الگ کرنے کے لیے پلاننگ کی گئی تھی، مجھے فریڈ نے نشہ آور برائڈی پلائی تھی۔ میں اپنے حواسوں میں نہیں تھی وہ سب جھوٹ تھا میڈی! پلیز میرا یقین کرو۔“

بڑی آن بان شان والی سارہ اس کے آگے تقریباً گزر گئی تھی، مگر معید پر اس کی وضاحتوں کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

”بے سرو پا کہانیاں سنا کر اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔“ سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

”تم جانتے ہو، میں ہیریگنٹ ہوں۔“ سارہ نے اب بھی ہار نہیں مانی تھی۔

”تمہارے کسی معاملے سے میرا کوئی لینا دینا نہیں، جو جی چاہے کرو۔ تمہارے سارے سچ اور سارے جھوٹ تم خود ہی جانتی ہو۔ مجھے اب تمہارا کوئی اعتبار نہیں۔“ معید نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اس کے برابر سے ٹکٹا چلا گیا۔

”میڈی! تم مجھے ایسے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“ دور جاتے معید کو سارہ نے مڑ کر دیکھا اور حلق کے بل پکائی۔

”بھارت میں جاؤ تم۔“ معید زیر لب بڑبڑایا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔

”اور حقیقت بھی دراصل یہی تھی کہ اب اسے آگے بڑھنا تھا، سب کچھ بھول کر، اپنے ماضی کو

فراموش کر کے۔ وہ ماضی جس میں سارہ کو لگتا تھا اس کے لیے محبت تھی۔

اب ایک نئی زندگی، نئی محبت اور نیا سفر اپنی بائیں واکیے اس کے خنجر تھے۔ وہ واپس لوٹ کر والدین کے ساتھ ساتھ زہرہ پروین نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ اپنے جو بن پر آئی بہاری وہ لڑکی، الفت اور وفا کے ڈھیروں پھول لیے اس کی ماہ میں کھڑی تھی۔ معید کے لیے جائے فرار اب مشکل بنی نہیں ناممکن تھی کہ اب وہ گریز چاہتا ہی نہیں تھا۔ اس پر بھی اور خود اپنے آپ پر بھی۔

معید نے اپنا ہاتھ، ان ہاتھوں میں دے دیا۔ گلابی نرم و نازک ہاتھ، خوابوں کی، محبت کی جس وادی میں اسے لے جائیں، معید کو سب منظور تھا۔ زہرہ پروین نے محبت کی ابتدا کی تھی اور معید نے اجازت کر دی۔ یوں ٹوٹ کر چاہا اسے کہ باقی سب کچھ فراموش کر دیا۔ یوں اس کے عشق میں ڈوبا کہ سوائے زہرہ کے کچھ دکھائی دیا نہ بھائی دیا۔ وہ تو بہت سالوں بعد اسے ایک خط ملا تو۔

☆☆☆

سنہری مائل بھورے بالوں کو بار بار انگلیوں سے ستواتے ہوئے جب وہ انہیں منہ پر آنے سے نہ روک سکی تو جھلا کر اٹھی۔

”اگلی بار میرا سیم اسٹائل ایسا ہوگا کہ ایک بال کی بھی جرات نہیں ہوگی، چہرے پر آنے کی اور ڈسٹرب کرنے کی۔“ ہنسی کھپ کھپ کر اسے لگاتے ہوئے نور قاطر نے اعلان کیا۔

”تو کیا تم میری نقل کرو گی؟“ گریڈ پائے شرارت سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا جو آدمے سے زیادہ بالوں سے محروم تھا۔ بس چند بال کے آس پاس ایک جھار سی بچی تھی، جو بڑی بے ضرر تھی، تنگ تو بالکل بھی نہ کرتی تھی۔

”آئیڈیل برا نہیں ہے۔ شیمو، ہیرا اسٹائل یہ بلو ڈرائی کا خرچا بھی بنے گا۔“ نور قاطر نے ہنسا



انہماک اور عجبیگی سے گویا اس آئینہ بے پر سوچ بچار کر رہی تھی۔  
 ”نہا ہے گرینڈ پا! آپ کی جو والدہ تھیں، ان کے بال بہت خوب صورت تھے؟“

”بہت نہیں، بے حد۔۔۔ بے حد خوب صورت بے اور مجھے بال تھے۔ ایک بہت اونچا تخت خاص طور پر بنوایا گیا تھا، جس پر لٹا کر ان کے بال دھوئے جاتے تھے۔ ٹائٹن آتی تھی بال دھونے کے لیے، اس کے پاس بڑے اچھل قسم کے نسخے اور جڑی بوٹیاں آئی تھیں ہر بلز وغیرہ ہوتے تھے۔ ہماری والدہ کو یہ بال وراثت میں ملے تھے۔ میرے نانا نے ایک بچائی خاتون سے شادی کی تھی، پسند کی یا اپنی مرضی کی شادی جسے آج کل ”لو میرج“ کہا جاتا ہے۔“

گرینڈ پا حسب معمول شروع ہو گئے۔  
 ”میرے وقتوں اور لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک اور احساس ہوتا تھا۔ یاسیت اور ادا سی بھی، جوش اور خوشی بھی۔“

”اور اس وقت کی یہ شادی جو لکھنؤ کے ایک امیر زلوعے اور بنگال کی ایک طرح دار فیوڈل طبقے کی فدا خیر خاتون سے ہوئی، اس وقت ایک بغاوت یا انتخاب بھی گئی ہے۔“

نور قاطمہ نے گرینڈ پا سے کئی بار یہ کہانی سن رکھی تھی، اس لیے انہیں گویا یاد دلایا۔

”ہاں، ہاں۔ بالکل ایسا ہی تھا۔“ انہوں نے تائید میں سر ہلایا۔

”یہ سب حیرت انگیز معاملات تھے اور آج بھی ہمیں مثلاً یہ کیا منظر تھی کہ بھنگی کی بیوی بھنگن، نائی کی بیوی نائ، بھنگی کی بیوی بھنگن، دھولی کی بیوی دھولی“ نور قاطمہ نے دادا کے زیر سایہ رو کر جو کچھ سنا تھا اس میں جیس، تحقیق اور جستجو سرفہرست تھی۔

”آج سے سو سال پہلے بلکہ قیام پاکستان سے لے کر برصغیر کی ایک معاشرتی روایت تھی، جو پیشہ و فدا خاتون بن گیا تھا اور ہر پیشے سے منسلک کردہ،

ایک قوم، ایک برادری بن کر اپنے کسب سے جڑا رہتا تھا۔ تو مرد، عورت اسی ذات یا پیشے کے حوالے سے جانے اور پہچانے جاتے تھے اور ویسے یہ تو آج کل بھی ہوتا ہے مثلاً بادشاہ کی بیوی ملکہ، شہزادے کی بیوی شہزادی، صدر یا وزیر اعظم کی بیگم خاتون اول کہلاتی ہیں۔“

گرینڈ پا اس کے تجسس، جستجو اور سوالات کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تو تھے۔

”مگر اب ایسا نہیں ہوتا کہ اگر مثلاً ایک شخص ہیرا شاکسٹ ہو تو اس کی بیوی لیڈی ہیرا شاکسٹ کہلائے۔ بیوی کی شناخت تو اس کے اپنے کام سے ہوگی، وہ ڈاکٹر ہو، انجینئر ہو یا کوئی ڈریس ڈیزائنر، وہ وہی کہلائے گی جو ہے۔“ نور قاطمہ نے پھر سوال اٹھایا۔

”ہاں، کیونکہ اب یعنی آج کی دنیا میں پیشوں سے وابستہ ذات، قوم اور برادری کا رواج اور تصور کہیں تو بالکل ہی ختم ہو چکا ہے اور کہیں آخری سانس لے رہا ہے۔ آج کوئی بھی انسان کوئی بھی پیشہ اختیار کر کے اس میں کامیابی اور ترقی حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں اچھائی اور برائی کے دونوں پہلو ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ نور قاطمہ بہت انہماک سے انہیں سن رہی تھی۔

”اچھائی یہ ہے کہ بہت سے پیشے اور کام جو نچلے درجے میں شمار کیے جاتے تھے اور ان سے وابستہ افراد سماجی اعتبار سے کم تر سمجھے جاتے تھے۔ اب یہ رجحان نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص جو اعلا پانے پر کوئی ہیرا سیلون کھول لے یا منرل واٹر کی پمپنگ کا مالک ہو۔ وہ نائی یا بھنگی کہلانے کے بجائے بزنس من کہلاتا ہے۔ گانے والے میراثی نہیں، گھوکار اور اداکاری کرنے والے بھاٹے کے بجائے فنکار کہلاتے ہیں۔“

گرینڈ پانے ایک لمحے کو رک کر سانس لی پھر



دوبارہ پوئلگے۔

”مگر ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اب خاندانی نہایت اور شرافت وجہ معیار نہیں رہی۔ اعلا کردار پیچھے چلا گیا۔ دولت کے ڈھیر پر کھڑا نہیں، دوسروں کی نظروں میں سر بلند ہے۔ دنیا کی ہر معاشرت میں کم و بیش یہی صورت حال ہے، کہیں کم کہیں زیادہ۔“

”ہوں۔“ نور فاطمہ کا ذوق سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔  
”کافی پیو کی؟“ گرینڈ پا اٹھ کر بچن کاؤنٹر کی طرف بڑھے جہاں سامنے ہی کافی میکر رکھا ہوا تھا۔  
”کافی میں دودھ، بہت ساری چینی اور چاکلیٹ باؤڈر ڈال کر بنا میں تو پی لوں گی۔“  
دراصل گرینڈ پا بالکل اسکی کافی پیتے تھے۔  
”تجہ کڑوی جسے نور فاطمہ اگر ایک کمونٹ بھی پی لے تو فوراً آخ تم کو روئے اور گرینڈ پا اس کی کافی کا مذاق اڑاتے تھے۔“

اس سے بہتر ہے کہ تم دودھ میں اوٹین مائکر پی لیا کرو۔ کافی ڈالنے کا تکلف کیوں کرتی ہو؟“  
”آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔“ نور فاطمہ بڑے سونے انداز میں جواب دیتی تھی۔  
”تم نے فوٹس تیار کر لیے میرے؟“ کافی بناتے ہوئے گرینڈ پانے سوال کیا۔  
”بس تمہارا سا کام رہ گیا ہے۔“

نور فاطمہ کی گہری سیاد آنکھیں اب بھی اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ گرینڈ پا ایک کتاب لکھ رہے تھے جس میں مدد کے لیے وہ ان کی معاون یا اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی۔ کام نور فاطمہ کی پسند کا تھا اس لیے بہت شوق اور جہان فشانی سے کر رہی تھی۔ ایک سوال کب سے اس کے دماغ میں کلبار رہا تھا۔ وہ کافی کا انتہار کر رہی تھی تاکہ کافی کے ساتھ ساتھ گرینڈ پا کے جواب سے لطف اندوز ہو۔

۶۶۶۶۶

میرے پیارے میلے!

لاکھ چاہئے پر بھی تم سے نفرت نہیں کر سکی۔  
محبت کا اور تمہارا وہ مختصر سا ساتھ، ایک خوب صورت یاد بن کر ہمیشہ میرے دل میں رہا۔ اب کڑے اٹھارہ برسوں میں پلوں کے نیچے بہت پانی بہہ چکا ہے۔ تمہارے لیے اب یہ الفاظ میر ضروری اور بے معنی ہوں گے کہ تم نے جو کچھ دیکھا، وہ جھوٹ اور ایک ہٹا گیا منظر تھا۔ میں بے گناہ تھی۔

”میں اب تو میرا یقین کر لیتا چاہیے، کینسر کی آخری اسٹیج سے اور ایک مرتا ہوا انسان بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بول ہی نہیں سکتا اور تمہیں اس بات کا بھی یقین کرنا چاہیے کہ میں نے تمہاری ایک بیٹی کو جنم دیا ہے۔ دو ماہ پہلے اس کی سترہویں سالگرہ تھی۔ میں نے اس کا نام ماریہ رکھا تھا۔ میرے بعد وہ اس دنیا میں بالکل اکیلی ہو جائے گی اور ایک باپ کے ہوتے ہوئے اس کی اولاد اکیلی نہیں ہونی چاہیے۔ جب تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے تو میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی۔ خط لکھ کر میں نے اپنی فرس کے حوالے کر دیا کہ میرے بعد وہ اس خط کو پوسٹ کر دے۔“

فقط وہ جس نے تمہیں بے تحاشا چاہا اور جواب میں وہ چاہے جانے کے بجائے دھکاری کئی۔

عبدالعزیز نے خط سے منسلک ایک اور پرچا دیکھا جس پر ماریہ کا ایڈریس اور تصویر چسپاں تھی۔ آندھیوں کی زد میں آئے پتے کی طرح خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے معید نے اس تصویر پر اپنی نظریں جمائیں۔

”ہٹا ہار دیکھا جانے والا ایک اجنبی چہرہ“ مانوسیت کی جھلک لیے ہوئے تھا۔ اس چہرے پر ناک اور ٹھوڑی کی بناوٹ بالکل وہی تھی جو ولی شاہ کے خاندان کی امتیازی خصوصیت تھی۔ سبز آنکھیں اس نے ماں سے لی تھیں، وہ تصویر کی نظریں بھائے کم صم بیٹھا تھا۔ اس کا وجود اپنے آگس میں تھا اور



دل دوہا کر کہیں اور بھگ رہے تھے۔ ہر جگہ بھگ رہے تھے۔ کبھی زرتاج میر کا خیال آتا، کبھی زہرہ بدین کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا تو کبھی دھیان کی ہوا اس کے دو پیارے پیارے لائق فائق بچوں کی طرف اڑ جاتی جو دنیا میں اسے سب سے زیادہ عزیز تھے۔

”اس دنیا میں کون ہے جو جوانی میں محبت نہیں کرے؟ مگر محبت کی سزا اتنی خوف ناک تو نہیں ہوتی۔ اتنی خوف ناک ہونی تو نہیں چاہیے۔“

ساری چیزیں لفافے میں ڈال کر اس نے لفافہ دراز میں ڈالا اور انٹرکام کا ریسور اٹھایا۔

”مس میٹلین! اگلے دو گھنٹے کی ساری میٹنگز اور پروگرام کینسل کر دیں۔“

اپنی سیکریٹری کو ہدایت دینے کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ اسے جس خطرناک طوفان کا سامنا ہے، اس سے نمٹنے کے لیے دو گھنٹے کافی ہیں؟ یا دو دن؟ یا دو ہفتے؟ دو مہینے؟ دو سال؟ یا دو صدیاں؟

☆☆☆

بخدمت حضور سر فریڈرک ہملٹن صاحب! بہادر کشن دہلی۔

دام اقبال ہم

جناب مع القاب

دریائے علم را گوہر نایاب، مرجع علم و فضلاء، حکماء و ورثین۔ لا آفتاب جہاں تاب۔

خدمت عالی میں گزارش ہے کہ اگرچہ مجھ میں کوئی لیاقت و قابلیت خاص نہیں پھر بھی مجھے ناکارہ نہ بنائیں کی سرکوبی کے سلسلے میں جو خدمات سر انجام دیں، وہ حضور کے علم میں آنا ضروری ہیں۔ میں نے شہر دہلی کے کئی گھرانوں، خاندانوں اور افراد کے خیالات، رجحانات اور معاملات سرکار تک بڑی ہوشیاری سے پہنچائے، جو وہ سرکار انگلشیہ سے بغض و عناد کے حوالے سے رکھتے تھے اور باغیان دہلی سمیت جہاں تمام مصلحتی سے ہمدردیاں رکھتے تھے۔

میں نے ایک ایک تفصیل براہ راست ہائی

کمانڈ کو بھیجی۔ میں نے سرکار کی خیر خواہی اور ملکہ مقدسہ انگلستان غلہ اللہ ملکہ و سلطانیہ کا اقبال مزید و مزید بلند کرنے کی خاطر کئی بار اپنی جان جو گھوٹوں میں ڈالی۔ کسی خطرے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سرکار برطانیہ کے لیے کاربائے نمایاں انجام دیے۔ میری کوششوں کی بدولت مختل شاہی خاندانوں کے ایک پورا گھرانہ اور انہیں پناہ دینے والوں کی سرکوبی ہوئی۔

اس کے علاوہ سینکڑوں نہیں بلکہ یہ تعداد ہزار کو پہنچتی ہے جنہیں میرے بے مثال و لا جواب نظام چاسوسی نے بے نقاب کیا اور دہلی فیلڈ فورس کے ہاتھوں وہ اپنے انجام کو پہنچے۔

شب و روز انتہائی راز داری اور کامیابی کے ساتھ سرکار کی خدمت میں مصروف رہنے کے باوجود مجھے جو صلہ دیا گیا، وہ آپ کے شایان شان نہیں کہ آپ جو دو سقا اور داد و بخش کے بادشاہ ہیں۔

میں یہاں میں یہ ذکر کرنا انتہائی ضروری سمجھتا ہوں، میر پر تاب گزرا چیت، جن کی خدمات کا دائرہ میرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ انہیں مجھ سے زیادہ بڑی جاگیر اور اعزاز دیے گئے ہیں، آپ ان سب کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

میں عاجزانہ واثق امید کا اظہار کرتا ہوں کہ سرکار انگلشیہ جو اپنے حامیوں اور وفاداروں پر ہمیشہ سے مہربان اور نسی رہی ہے۔ میری درخواست پر غور فرما کر میری جدوجہد، کوششوں اور قربانیوں کا شایان شان صلہ دے گی۔

خدائے بزرگ و برتر ہماری سرکار کو روز بروز ترقی بخشنے اور آپ کا اقبال بلند کرے۔

سید قاسم علی  
برقماد دہلی

☆☆☆

پردہ سرکار انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا، نیچے سڑک اور اس پر بھاگتا ٹریک، آس پاس کی وکٹوریہ عہد کی پرانی عمارتیں، سب کچھ دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر وہی کھنٹی دھند، اس واہیات موسم میں تو



باہر لکنا بھی عذاب سے کم نہیں۔

گریڈ پانے مایوسی کے عالم میں پردہ برابر کیا اور اپنی لکھنے کی میز پر آن بیٹھے۔ ان کا شروع سے خیال رہا تھا کہ اگر لندن کا موسم اتنا دایمیت نہ ہوتا تو یہ دنیا کا سب سے بہترین شہر تھا۔ مگر خراب موسم نے اس شہر کے کچھ نمبر کاٹ لیے تھے۔ نور فاطمہ کے خیالات بھی کم و بیش ان ہی جیسے تھے۔

”ہاں نہیں، یہ لڑکی کب آئے گی۔“ اکیلے تو یہ کمر جیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ گریڈ پانے ایک نظر کمرے کے اطراف میں دوڑائی اور ایک گہری سانس لے کر لکھنے بیٹھ گئے۔ اپنی کتاب کے لیے انہیں کچھ معلومات درکار تھیں جس کے لیے انڈیا آفس لائبریری جانا تھا اور بھی کئی لائبریریاں کنکال کر وہ کتاب کے لیے نوٹس بنا چکے تھے۔

نور فاطمہ نے اس سلسلے میں ان کی بہت مدد کی تھی۔ ایک دن مذاق میں نہیں بلکہ خاصی سنجیدگی سے انہوں نے نور سے کہا تھا کہ.....

”میں سوچ رہا ہوں اس کتاب کے ٹائٹل پر میرے ساتھ تمہارا نام بھی آنا چاہیے۔ ریسرچ کا کام تو آدمے سے زیادہ تم نے کیا ہے۔“  
”بالکل ٹھیک، جب اس کتاب کو ”نوٹس پرائز“ یا کم از کم ”جبر پرائز“ ملے گا تو آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی مشہور ہو جاؤں گی۔“ نور فاطمہ بہت اکیسا بخند ہو گئی تھی۔

گریڈ پانے لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیا تھا مگر وہ لکھنے کے بجائے نور فاطمہ کے بارے میں سوچ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ داؤد امین کے بارے میں بھی۔

نور فاطمہ اسے ملانے لائی تھی۔ گریڈ پانے ایک بار جنس، تمن بار اس سے ملے تھے۔ دودھ گھٹنے طویل نشست رہی تھی ان کی۔ بظاہر وہ ہر اعتبار سے ایک اچھا لڑکا تھا، وکالت پڑھ کر ایک مشہور فرم سے وابستہ تھا، ذہین تھا۔ اس کی گفتگو میں اکثر جو باتیں اور حوالے ہوتے تھے وہ اس کے وسیع مطالعے کے

ظہار تھے۔ اتنا مہذب، شائستہ مزاج اور تعلیم یافتہ نوجوان انہیں بطور داماد پسند آ جانا چاہیے تھا اور وہ یہی کوشش کر رہے تھے مگر پھر بھی بار بار انہیں کنگا لگ رہا تھا کہ نور فاطمہ کو ابھی کچھ عرصہ غم خیز کر کے اور سوچ بچار کر کے پھر فیصلہ کرنا چاہیے اور انہوں نے اپنا رائے کا اظہار بھی نور سے کر دیا تھا۔

☆☆☆

بیش تر لڑکیوں کی طرح سردی میں ٹھہرتے ہوئے ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم کھانا نور فاطمہ کو بھی بے حد پسند تھا اور وہ اس وقت اپنا یہی شوق پورا کر رہی تھی۔ لیڈر جنکٹ اور جنز کے ساتھ اس نے گلے میں چیک کا مظکر مل دے کر ڈالا تھا۔ تراشیدہ بال شانوں سے ذرا نیچے تک تھوڑی لا پرواہی اور ذرا زیادہ خوب صورتی کے ساتھ بکھرے ہوئے تھے۔ آئس کریم کھاتے ہوئے اس کے گلابی ہونٹ سرخ ہو رہے تھے اور آنکھیں اور چہرہ ہمیشہ کی طرح چمک رہا تھا۔

”میرا بس چلے نا تو کھانا وانا کچھ بھی نہ کھاؤں۔ صبح، دوپہر، شام بس آئس کریم کھا کھا کر پیٹ بھر لیا کروں۔“ نور فاطمہ نے بڑے جوش سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”پھر تو تمہیں کسی آئس کریم پارلر کے اونر سے شادی کرنی چاہیے۔ چوبیس گھنٹے ڈلیوری اور فری سروس کی سہولت رہے گی۔“

داؤد امین نے ایک معصومانہ سی آرزو کے جواب میں نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔ وہ نور فاطمہ سے بالکل ناراض تو نہیں ہوا تھا لیکن بہر حال تھوڑی سی برہمی اس کے چہرے پر اور لہجے میں آئی تھی اور یہ اس کے خیال میں محبت کرنے والے کا حق ہے اور رہے گا۔

”تم کچھ خفا خفا سے لگ رہے ہو؟“ آئس کریم میں کھو نور فاطمہ نے ذرا چوہک کر داؤد کے وجہ پر مگر خفا چہرے کو غور سے دیکھا۔  
”تو کیا یہ خوش ہونے والی بات ہے۔ گریڈ پانے



نہیں خرید سونے بھنے کا مشورہ دیا اور تم فوراً  
 باقی ہو گئیں۔ دنیا کی سب سے فرماں بردار پونی! "  
 "داؤد اچھے میں تم سے محبت کرتی ہوں، ایسے  
 فی گریڈ پا سے بھی کرتی ہوں۔ ان کی بات کو یا  
 شوبہ کو میں انکار نہیں کر سکتی۔" نور فاطمہ آئس کریم  
 کماٹے کھاتے ذرا سنجیدہ ہو چلی۔

"کیا وہ مجھے پسند نہیں کرتے؟" داؤد کے  
 لبے میں کچھ بے چینی سی تھی۔

"آخری اطلاعات آنے تک تو ایسی کوئی بات  
 نہیں تھی۔" نور نے کندھے اچکائے۔

"پھر کیا بات ہے؟ تین میسنگز کر چکا ہوں میں  
 اب تک ان سے۔ اب بھی "میں" ان کی سمجھ میں  
 نہیں آیا؟" داؤد اب وکیل بن گیا، جرح کرنے

"گریڈ پا کو میں اچھی طرح جانتی اور سمجھتی  
 ہوں، سوچ سمجھ کر بلکہ بہت زیادہ سوچ بچار کر کے  
 کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے یہی  
 حکایا تھا مگر نہ جانے تمہارے معاملے میں مجھ سے  
 بے چوک ہوئی۔" نور فاطمہ اس کی برہمی اب  
 ڈھائے کر رہی تھی۔

"میں جس فرم میں جاب کرتا ہوں، وہ انگلینڈ  
 کا مشہور فرم ہے۔ انہوں نے میرے پہلے انٹرویو  
 کے بعد ہی مجھے منتخب کر لیا تھا۔" داؤد یہ بات پہلے  
 کی تانچا تھا مگر اب جتنا رہا تھا۔

"اگر تم جاب کے لیے گریڈ پا کے پاس جاؤ تو  
 پہلے انٹرویو کے ابتدائی دو چار سوالات کے  
 جوابات میں سلیکٹ کر لیں گے مگر جاب دینے میں  
 دیر لگے گی زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔"  
 "نور فاطمہ کی آئس کریم ختم ہو گئی تھی لہذا اب اس کے  
 لالچ شروع ہو گئے۔

"کیا فرق ہے؟ دونوں معاملات میں  
 سلیکٹ کی قابلیت اور ذہانت دیکھی جاتی ہے۔"  
 "نور نے آئس کریم کا کپ میز پر رکھا اور نکتہ

"ہوں، تمہاری بات ٹھیک ہے مگر میرا خیال  
 ہے کہ جاب دیتے وقت امیدوار کا دماغ اور لڑکی  
 دیتے وقت دل دیکھا جاتا ہے۔"

"گریڈ پا کو کیا لگتا ہے، کیا میں تمہارے  
 ساتھ ان فیئر ہوں؟ میرے دل میں کوئی جھوٹ، کوئی  
 کھوٹ وغیرہ ہے؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے داؤد! ان کو مجھ سے حد سے  
 زیادہ محبت ہے بس، جو وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ  
 کرنے میں ہچکچا رہے ہیں۔ تم پریشان مت ہو، میں  
 انہیں راضی کر لوں گی۔"

نور فاطمہ مسکرا دی۔ داؤد کی فکر اور پریشانی  
 اسے اچھی لگ رہی تھی اور اس نے اس کا اظہار بھی  
 کر دیا۔

"عجیب لڑکی ہو تم، میں پریشان ہو کر اچھا لگ  
 رہا ہوں تمہیں۔" داؤد نے تاسف سے گردن ہلائی۔  
 "کیونکہ یہ فکر اور پریشانی میری محبت میں  
 ہے، میرے لیے ہے۔" نور فاطمہ نے اپنے ہاتھوں  
 کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں جکڑا۔  
 "مام ڈیڈ کا پروگرام تھا، اگلے اتوار کو گریڈ پا  
 سے ملنے کا۔" داؤد نے اپنا موبائل اٹھایا۔

"ہاں تو مل لیں۔"  
 "انہیں بھی یہی جواب ملے گا مزید سوچ بچار  
 اور انتظار کا۔" داؤد اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کہا تو ہے، میں انہیں راضی کر لوں  
 گی۔" نور فاطمہ اس کی ہم قدم ہوئی۔  
 "تم بھی ان سے ملی ہوئی لگتی ہو۔" داؤد کی خفا  
 خفا سی نکاہوں نے اس کے چہرے کو اپنی گرفت میں  
 لیا۔

"کردی نا وکیلوں والی بات، مجھ پر بھی  
 شک؟" نور فاطمہ کی ہنسی بے ساختہ اور جان دار تھی۔

☆☆☆  
 لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس خط کو نظر  
 انداز نہیں کر سکا اور دو دن بعد اس نے خود کو اس  
 بلڈنک کے باہر کھڑا پایا جس کے قہر ڈھکور پر ماریہ کی



رہائش تھی۔ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ کر وہ مطالبہ فلیٹ کی بیل بجار ہاتھا۔

”یس۔“ دروازہ اسی نے کھولا تھا۔

عبدالمعید اسے فوراً پہچان گیا تھا۔ وہ اپنی تصویر جیسی ہی تھی اور اپنی بڑی بڑی سبز آنکھوں سے عبد المعید کا جائزہ لے رہی تھی۔ جس کا قیمتی لباس، مہنگے جوتے، بیش قیمت گھڑی، اس کا پورا سراپا، پوری شخصیت اس عمارت اور اس کے تھمڑے کلاس فلیٹ سے بالکل بھی میچ نہیں کر رہی تھی جس کے سامنے وہ کھڑا تھا اور پھر چند لمحوں میں وہ سمجھ گئی۔

”آپ مسٹر میڈی ہیں؟“

”تم کیسے جانتی ہو؟“ وہ چونکا۔

”مئی نے مرنے سے پہلے بتایا تھا۔“ ماریہ کا

چہرہ اور لہجہ سپاٹ تھا۔

وہ دروازہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ عبدالمعید اندر آ گیا۔ وہ صوفے پر چپ چاپ بیٹھا تھا اور یاریہ کی خاموش نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں یا گھور رہی تھیں۔ عبدالمعید کو اس کے اس انداز پر ابھن ہو رہی تھی۔

”کیا بتایا تھا سارہ نے میرے بارے میں؟“ عبدالمعید نے بہت محتاط ہو کر سوال کیا تھا۔

”نہی کہ آپ میرے باپ تو بن گئے مگر ان کے شوہر نہ بن سکے۔ آدھے رستے میں ہی انہیں چھوڑ کر بھاگ لیے، جیسے ہیری مجھے چھوڑ گیا ہے۔ جیسے ہی میرے ہسپتال گنٹ ہونے کی خبر سنی، فرار ہو گیا۔ سیم می جیسی پجوشن۔“

ماریہ نے کندھے اچکائے۔ اس کے لہجے میں عجیب سی بے نیازی اور لاپرواہی تھی جیسے جو ہوا ہے یا ہو رہا ہے، وہ تو ہونا ہی تھا۔

عبدالمعید کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ اپنی اب تک کی زندگی میں اس نے کبھی خود کو اتنا مجبور اور بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ ایک ایسے موز پر کھڑا تھا جہاں رستہ ہونے کے باوجود بھی وہ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ ایک قدم بھی آگے بڑھانا دشوار تھا اور کھڑے رہنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔

☆☆☆

کونھڑی میں ایک دیے کی روشنی تھی جو ٹنڈاری تھی۔ رفعت آرا اسی بورے پر نیچے لیٹی تھی جو کونھڑی کے کچے مگر لیے پتے فرش پر بچھا ہوا تھا۔ لاکھ فیلڈ کرنے پر بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے منہ سے آہ نکل ہی جاتی۔ مکے اور سسرال دونوں جگہ ناز و نعم میں عمر گزاری تھی۔ نرم گدیلوں، تکیوں پر لیٹنے، ہونے کی عادت تھی۔

عرش سے فرش پر آنے کے بعد بہت کچھ سہا مگر اس وقت کی تکلیف سب سے بڑھ کر تھی۔ وہ پورے دنوں سے تھی، اس وقت اور ایسی حالت میں نیچے لیٹنا ایک قیامت تھی، کمر تختہ ہو رہی تھی۔ پورے بدن میں درد کی لہریں ایک کے بعد ایک آ رہی تھیں۔

”ہائے اللہ میاں جی! ہم کیا کریں بوا جی۔“ تکلیف سے بے چین ہو کر اس نے پہلے اللہ کو پھر انہیں پکارا جنہوں نے ہر ہر قدم اس کا ساتھ دیا تھا۔ ”صبر سے کام لو بھنو! جب سارے مشکل وقت گزر گئے تو یہ وقت بھی گزر ہی جائے گا۔“ بوا نے تسلی دی۔

”وقت تو گزر گیا مگر ہم سب کو خاک کر گیا۔“ طیبہ بیگم نے خاک کے فرش پر بیٹھے بیٹھے ایک آہ بھری۔ ”سات ماہ ہونے کو آئے مگر اب تک دل کو صبر آیا نہ قرائن سکون۔ لوگوں سے رشتوں سے، بیش و آرام اور ساز و سامان سے بھری پری حویلی۔ آدھہ زندگی، ہوا کا جو بھی جھونکا آتا، خیر کا، خوشیوں کا پیغام لاتا۔ پھر ایک ایسی آندھی چلی کہ سب کچھ بکھر گیا۔ لوگ بھی، رشتے بھی، گھر اور گھر کا عیش و آرام ساز و سامان، سب کچھ چشم زدن میں تباہ و برباد ہو گیا۔ ختم ہو گیا۔“

میر و جاہت حسین اور اس کنبے کے سارے مردوں کی موت کی خبر حویلی پہنچی تو بڑی ماں کھڑے سے ہی گر پڑیں پھر بھی نہ انھیں۔ خوف و ہراس کا ماحول، افراتفری کا عالم، پھر قاسم علی نے خبر دی کہ



برطانیہ کے نو آبادیاتی ہیروں میں ایک ہیرا ہندوستان نام کا بھی شامل ہو گیا تھا۔ جو مطلقاً ٹھہرے، انہیں سزا میں دی جا چکی تھیں اور دی جا رہی تھیں اور وفاداری کی سند پانے والوں کو انعام و اکرام سے نوازا جا رہا تھا۔

کھن میں میاں کے چھوٹے سے گھر کی نیم تاریک کوٹھڑی میں۔ سزا یافتہ خاندان کی بہو رفعت آرا بورے پر لیٹی تڑپ رہی تھی۔

”کاش! میں موت آجائے۔“ درد کی شدت سے وہ تڑپی۔

”نہ بھنوا اللہ سے اس کی رحمت مانگو، موت نہیں۔“ بوانے ان کا سر سہلایا۔

”ہم کیوں نہ مر گئے ان سب کے ساتھ۔“ رفعت آرا کو صرف جسمانی نہیں ذہنی تکلیف بھی بہت تھی۔ زندگی کی وقت کی، حالات کی، بہت ساری حقیقتوں کو اس نے اب تک قبول ہی نہیں کیا تھا۔ جب ہی ہر آنے والے دن نے اس کی ذہنی تکلیف میں اضافہ ہی کیا تھا۔

رات کا تیسرا پہر گزر رہا تھا، اب تک کا سارا وقت آنکھوں میں کٹا تھا۔ پوچھی اور سحر کے پہلے اجالے کے ساتھ ہی فضا میں ایک ننھی منی سی چیخ بلند ہوئی۔ اس رونے کی آواز نے کوٹھڑی میں موجود نفوس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

”ماشاء اللہ چاند کا گلزار ہے۔“ بواجی نے دلائی میں لپٹی بچی کو پیار سے دیکھا۔

”یہ تو بالکل بڑی ماں کا عکس لگ رہی ہے۔“ طیبہ بیگم جچی کود کھیتے ہی بے ساختہ بولیں۔

”ہاں بھنوا میری آنکھوں نے بھی یہی دیکھا کہ یہ تو بالکل اپنی دادی حضور کی شبیہ ہے۔ اس لیے اس کا نام اپنی دادی کے نام پر ہی ہو گا نور فاطمہ۔“ بواجی نے بولتے ہوئے بچی کو طیبہ بیگم کی گود میں دے دیا۔

☆☆☆

خالی ڈھنڈا حویلی میں دیوانوں کی طرح ادھر

گردی فوج کے سپاہی حویلی پر حملہ کرنے والے سران کی لوٹ مار کریں گے پھر آگ لگا دیں گے۔ جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں سے نکل جائیں۔

دونوں ہمیشہ، دیوہرائی جھٹانی طیبہ اور رفعت ایک دوسرے سے لپٹ کر بے طرح رو دیں، ویسے ہی سوائے دن رات انہیں رونے کے سوا اور کام ہی نہ تھا۔ زندگی سراپا آنسو بن گئی تھی، دونوں بہنوں کا بے گھر ہونا، گودلی سے بہت زیادہ فاصلہ نہیں

فراق حالات ایسے تھے کہ پڑوس کی خبر لینا بھی مشکل تھا۔ بیک اپنی خبر کیسے پہنچاتیں کہ ان پر کیا حالت گزر رہی۔ قدرت کو ہی رحم آیا کہ جامع مسجد دی کے قریب بوا کے ایک خالہ زاد بھائی رہتے تھے۔ بوا دونوں بہنوں کو وہیں لے گئیں، بڑی مشکل سے جیتے چھپاتے وہاں پہنچے، چھوٹا سا گھر، غریبانہ بادل، مگر خرم لحاظ والے تھے۔ گھر کی ایک کوٹھڑی انہیں دے دی۔

”اب تو بوا! بادشاہ ہے، بادشاہ کے کنبے یہ برا وقت آیا ہوا ہے تو حویلیوں اور جاگیروں والے کس کس میں ہیں۔“

”ہاں بھئی اٹھیک کہتے ہو۔“ بوانے ایک آہ بھری۔

”یہ بچے اپنے ساتھ خدا جانے کون سی زہریلی ہولائے ہیں جو بھی سانس لیوے، مر جاوے۔ میں کہوں کھن میاں! یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور کب؟“ بوا لگی بیٹھی کھن میاں سے حال احوال کٹا چکی رہی تھیں، بتا بھی رہی تھیں۔

”کونٹ اس کروٹ بیٹھے یا اس کروٹ۔ ہمیں تو ہنسی پتا ہے۔“

کھن میاں نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔

بواجی نے جواب دیا۔ بوا چپ ہو گئیں۔



”کفر کے گئے منہ سے نہ لال قاسم علی اپیلے

اسنے خاص کارندے مہابت خان کے ساتھ  
دو عویلی کے مختلف گوشوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ کس  
کچھ روہ تو نہیں گیا حالانکہ مہابت خان نے یقین دلایا  
تھا کہ اب سوائے کنگر پتھر کے یہاں کچھ نہیں رہا مگر  
پھر بھی قاسم علی نے خود کھوم پھر کر اپنی تسلی کی۔ پوری  
عویلی خالی و حصار بڑی تھی، شاگرد پیشہ کی طرف بھی  
بے روستی اور دیرانی تھی۔ سوائے ان بڑھیوں کے جو  
بہت پرانی ملازما میں تھیں، اپنی عمریں انہوں نے  
اپنے مالگوں کی خدمت میں گزار دی تھیں، جب کام



خانہ کے قائل نہ رہیں تو بھی مالکوں نے ان کا اکرام کر دیا۔ ان کی سمیت ان کی تمام تر ضروریات بدستور پوری ہوئی رہیں اور اب ان کو تمام تر بددعائیں اور لمٹنے لگنے والی حکومت کے لیے وقف ہو گئے تھے جس کے جوہر ہم نے ان کے مالکوں پر اتنا بڑا قہر ڈھایا اور ساتھ ساتھ خود انہیں بھی بے آسرا کر دیا۔ شاگرد پٹے کے محکم میں وہ چاروں بڑھیا میں سرسبز ڈائے بیٹھی تھیں۔ نہ انہوں نے قاسم علی کو نظر اٹھا کر دیکھا نہ مہابت خان کو، دونوں باتیں کرتے ان سے ذرا فاصلے سے گزر گئے۔

”ان بی بیوں کا کیا کرنا ہے؟ باقی سب تو جاں جہاں سینک سائے چلے گئے۔ یہی چاروں رہ گئی ہیں۔“ مہابت خان نے چلتے چلتے سوال کیا۔

”گائے بوڑھی ہو جائے اور دودھ دینے کے قائل نہ رہے تو اسے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ اپنے پاس رکھ کر کوئی نہیں پالتا۔“

قاسم علی نے وہی جواب دیا جو اس کی بے رحم مرثیہ اور خود غرض فطرت کے عین مطابق تھا۔ چلتے چلتے دونوں حویلی کے پچھلے برآمدے میں آ گئے تھے، یہاں زمان خانہ ہوا کرتا تھا۔ برآمدے سے ملحقہ لائن سے کمرے تھے جو گھر کی خواتین کے استعمال میں تھے۔

قاسم علی برآمدے کے گول ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور مہابت خان سے بولا۔

”مہابت خان! پانی تو لے کر آؤ، پیاس نموس ہو رہی ہے۔“

”جی حضور۔“ وہ لپک کر گیا اور منکے سے پانی نکال کر کٹوا بھر کر لے آیا۔

”حضور کی عرضی کا جواب آیا سرکار کی طرف سے؟“ خالی کٹورا واپس لیتے ہوئے مہابت خان نے سوال کیا۔

”آجائے گا جواب بھی۔ سرکار کوئی فارغ تو نہیں ہوئی ہے، سوئیں ہزار جھیلے ہیں جان کو۔ دے دے گا تھک، جب جاگیر دے دی، خطاب دے

دیا، اعزاز بھی دیا۔ انعام و اکرام بھی تو جواب بھی دے دیں گے۔“

قاسم علی کو اندر سے مضطرب تھا مگر مہابت خان کو متانت سے جواب دیا۔

”حضور نے تو جاں نثاری اور خیر خواہی کی حد کر دی مگر سرکار نے وہی دلداری نہیں دکھائی جیسی دکھائی چاہی تھی۔ کیا نہیں کیا آپ نے ان کے لیے، کتنے گھرانوں کی، لوگوں کی تفصیلات فراہم کیں۔ وہ فساد کی جو اپنے تئیں جہادی بنے ہوئے تھے، ان کی معلومات اکٹھی کیں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر در نہ کسی کو ذرا بھٹک بھی پڑ جانی تو سہارا کر چوک پر لٹکا دیتے آپ کا۔ پھر میر صاحب کے گھر سے جس طرح آپ نے پورا کا پورا بادشاہی کنپہ پکڑا کر وفاداری کی۔ ٹھیک سے قدر دان سرکار ہوئی تو جتنے کیا سے کیا انعام و اکرام دیتی۔ سر آنکھوں پر ہنسنی، مگر یہاں تو سرکار نے گدھے گھوڑے سب برابر کر دیے۔“

مہابت خان بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا۔

مہابت خان جیسے خوشامدی آس پاس نہ ہوں تو قاسم علی جیسے نفس پرست، گھمنڈی سانس بھی مشکل سے لیں۔ مہابت خان نے قاسم علی کی دکھتی رگ پر ہاتھ ڈالا تھا، وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔

”امید تو بہت تھی سرکار سے مگر خیر اب عرضی ڈالی ہے کچھ تو جواب آئے گا ہی۔“ قاسم علی نے سر اٹھا کر آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھا جو بے فکری سے پرواز کر رہے تھے۔

”ہماری بھی پرواز کا وقت آ گیا مہابت خان۔ اب دولت کے، عزت کے آسمان پر اڑان بھرتے نظر آئیں گے ہم۔“

”کیوں نہیں سرکار! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے، آپ کی اڑان اونچی سے اونچی کرے۔“

”آمین۔“ قاسم خان آگے بڑھ گیا۔

مہابت خان پیچھے پیچھے چلا۔

ان دونوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ ان برابر برابر



طیش آرہا تھا مگر زبردستی تو کرنے سے رہا، نہ ہمارے  
واپس چلا آیا۔

رات میں حسب معمول بڑھیاؤں کی منطقی  
جی، سب نے روز کی طرح بد عاؤں اور کنسوں کا  
سلسلہ شروع کیا۔ رحمت بی کی باری آئی تو بیٹے کو  
دعا دینے سے پہلے ان کی روح پر دروازہ کر گئی۔  
☆☆☆

شب خوالی کا لبادہ پہن کر بستر پر لیٹ تو کیا  
آنکھیں بھی بند کر لیں مگر نیند تو اختیار سے باہر تھی۔  
دماغ میں ہزار اندیشوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ سوچ سوچ  
کر سر بھٹنے کے قریب تھا مگر کوئی راہ نظر نہ آئی کوئی  
حل بھانگی نہ دیتا تھا۔ باپ کے سامنے اپنی مشکل کا  
تذکرہ کرنا یا مدد چاہنا، ایک اور قیامت کو دعوت دیتا  
تھا۔

زرتاج مہر کی سوشل لائف اتنی معروف تھی کہ  
وہ کچھ وقت اگر بیٹے کی بات سننے کے لیے نکال بھی  
لیتیں تو بات سن کر یقیناً غش کھا جاتیں۔ وہ صرف  
مشہور ہی نہیں بلکہ بہت معزز اور عزت دار، خاندانی  
گھرانے کی حیثیت سے جانے مانے جاتے تھے۔  
گورو کہ اس معاشرے میں اس طرح کی  
اولادیں ایک عام سی بات تھی، انہیں نیچرل چائلڈ کا  
نام دیا گیا تھا مگر یہ رعایت عمومی لوگوں کے لیے تھی۔  
اشرافیہ کی تو دیے بھی عام سے عام بات بھی خبر کی  
سرخ بن کر اخبار میں لگ جاتی تھی۔ ولی شاہ اور  
زرتاج مہر بھی برداشت نہ کرتے کہ ان کا نام اس  
طرح اخباروں میں اچھالا جائے اور لوگوں کی مپ  
شب کا نشانہ بنے۔

پھر عبدالمعید کی ازدواجی زندگی اور خوشیاں دلوں  
پر لگ گئی تھیں۔ ابھی تک تو زہرہ بے خبر تھی مگر اس خبر  
پر اس کا رد عمل کیا ہوتا تھا۔ عبدالمعید کو بنوئی انداز میں  
پھر اس کے بچے، جو اتنے بڑے تو تھے کہ معاملات پر  
اپنے رد عمل کا اظہار کر سکیں۔ ان کے ذہن پر اس خبر کا  
بہت بڑا اثر پڑتا تھا۔  
”کیا بات ہے میڈی اتم اتنے پریشان کیوں

بنے کروں میں سارے کمرے خالی نہیں تھے۔ ایک  
کمرے میں وہ وقادار بڑھیا بیٹھی تھی جسے اپنے  
بالکون کی برابری کا غم کھائے جا رہا تھا، جو حویلی کے  
ہر ہر کمرے، گوشے، کونے کھدوے اور چپے چپے پر  
اپنے چاکیس بیالیس سالوں کو بکھرا ہوا دیکھ رہی تھی۔  
یہاں گئے کینوں کے حسن سلوک کے بوجھ تلے دبی  
ہوئی۔ یہاں سے جانے کے لیے اس کے قدم ہی  
نہیں اٹھ رہے تھے۔

اس نمک حلال عورت نے مہابت خان اور  
قاسم علی کی زبانی اتنی بڑی نمک حرامی کی مختصر داستان  
سنی تو سکتے میں آ گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا اپنے  
کانوں پر اور اپنے آپ پر۔ وہ خود سے سوال کر رہی  
تھی۔ کیا یہ سانپ میں نے جتا جس نے میرے  
محسنوں کو ڈس لیا؟“

رحمت بی کا دم کھٹنے لگا، سانس اٹکنے لگی تھی۔  
جہاں چاروں بڑھیاں بدستور سر نہوڑائے بیٹھی  
تھیں۔ رحمت بی بھی ان میں شامل ہو گئیں، اتنے  
میں قاسم خان تیز تیز چلتا ہوا وہاں آیا۔  
”حد ہوئی اماں جان! آپ سے ہم نے کہا تھا  
کہ جا کر سواری میں بیٹھیے، ہم ابھی آتے ہیں اور  
آپ یہاں موجود ہیں۔“ وہ بہت جھٹایا ہوا لگ رہا  
تھا۔

”ہم کل جائیں گے۔“ رحمت بی نے بیٹے کی  
طرف دیکھا بھی نہیں۔  
”کل تک آپ کیا کریں گی یہاں، نہ سازو  
سامان ہے نہ کھانا پینا۔ روٹی کا بھی کوئی خاص  
بندوبست نہیں رہا۔“

قاسم علی کچھ دیر جواب کا منتظر کھڑا رہا مگر رحمت  
بی کچھ نہ بولیں، غلاموش رہیں۔  
”آپ بھی کبھی بچوں کی طرح ضد پکڑ لیتی  
ہیں، ٹھیک ہے۔ آپ رک جائیں آج رات یہاں،  
کیونکہ کل آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔ میں ابھی ایک  
ملازم کے ہاتھ کچھ سامان اور کھانے پینے کی اشیاء  
بجھواتا ہوں۔“ قاسم علی کو ماں کے پیٹے رویتے پر



”دفع کرو اس لڑکی کو، بھاڑ میں جائے میری بڑا ہے۔“

مگر شاید اخلاقیات کی کچھ رمت اس میں ابھی موجود تھی۔ جب بھی وہ ماریہ سے پیچھا چھڑانے کا ارادہ کرتا، اندر سے کوئی اس کو ملامت کرتا۔ عبد المعید کے سوا ماریہ کا کوئی اور رشتہ دنیا میں موجود نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو شاید ہی کوئی اسے قبول کرتا۔

عبد المعید نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کر کے اپنی ازدواجی زندگی کو بھی داؤ پر لگایا تھا۔ مگر گزرتا ہر ہر لمحہ اس کے لیے کڑا امتحان تھا۔ اس کا وجود سچ اور جھوٹ کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ زہرہ کے سوالات کا جوابات دیتے دیتے وہ تھک جاتا تھا، اسے مطمئن کرنے کی کوششوں میں کبھی بے زار بھی ہو جاتا۔

گلے میں چھپھوندرا تک گئی تھی، نکل سکتا تھا نہ اگل سکتا تھا۔

☆☆☆

قاسم علی کے ہاتھوں میں گورنر جنرل کا فرمان محررہ بمطابق 22 جنوری 1858 تھا، تین بار وہ اسے پڑھ چکا تھا۔ ہر بار خوشی کے مارے اس کا برا حال ہو جاتا، اب وہ اس فرمان کو چوتھی بار پڑھ رہا تھا۔

”یہ دیکھتے ہوئے کہ فساد شروع ہونے سے قبل کیپٹن براؤن کی طلبی پر تم دہلی ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوئے اور بعد ازاں کیپٹن موصوف کے ماتحت کمانڈر انچیف کے میرٹھی مقرر ہوئے اور تم نے خفیہ اطلاعات کی فراہمی میں اپنے فرائض نہایت شان دار اور بہترین طریقے سے ادا کیے اور یہ کہ محاصرہ دہلی کے دوران تم نے مستند خبروں کی فراہمی میں مؤثر کارگزاری دکھائی۔“

اور یہ کہ تمہیں ایک خاص مہم سونپی گئی اور تم علاقہ کے زمین داروں کو اپنے مقاصد میں شریک کر کے، ان کے جاسوسوں کے ذریعے باغیوں کی نقل و حرکت کی اطلاعات فراہم کرتے رہے۔

جس کی زبردستی میں زہرہ، شوہر کو بغور دیکھ رہی تھی۔ میڈی کی طرح وہ بھی نہیں سوئی تھی۔

”میڈی کی طرح بات نہیں، بس بزنس کے کچھ رہنمائی۔“

”میڈی کے لیے تم بھی بزنس پر پہنچ کر تھک جاؤ گے۔“ اس سے پہلے تو تم بھی بزنس پر پہنچ کر تھک جاؤ گے۔ ہمیشہ آفس میں ہی چھوڑ کر آتے تھے۔

”ہاں بار بار پہنچ ہی کچھ ایسی ہیں کہ میرے ساتھ چلی آئیں۔“

”میڈی! مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“ زہرہ نے عبد المعید کے رخسار پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”توئی، ہم دونوں میں ایک ہی پریشان کافی ہے اگر تم بھی غم مند ہو گئیں تو مجھے تسلی کون دے گا؟ میری دل جوئی کون کرے گا؟“

عبد المعید نے زہرہ کی زلفوں میں منہ چھپایا جسے خطرے کو دیکھ کر ریت میں اپنا منہ چھپالے یا گیتروں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لے لیکن منہ چھپانے یا آنکھیں بند کرنے سے فقط خود فراموشی اور غلط فہمی کی کیفیت طاری ہوتی ہے، خطرہ نہیں ٹل جاتا۔

بہت سوچ بچار کے بعد عبد المعید نے اس مسئلے کا حل نکال ہی لیا۔ ایک بہتر جگہ نئے فلیٹ میں ماریہ کو منتقل کیا، اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرائی۔ پہلے تو اس نے ہاسٹل میں رہائش کے لیے ماریہ کو ٹھکانہ دیا مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

”مجھ سے کہنے کی عادت ہے۔“

اس کا دونوں انکار سن کر عبد المعید کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ماریہ خود سر کی طبیعت کی مالک۔ دل چاہتا تو اس سے بات کرنا، دیکھنا تو منہ میں گھٹکتھنیاں ڈالے بیٹھی رہتی۔ عبد المعید نے کئی بار سوچا، بہت سوچا اور اپنے دل کو پہنچانے کی ایک سخت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے



اور یہ کہ تم نے شاہ دہلی کے خاص ملازموں سے ساز باز کر کے قلعے کے اندرونی حالات سے آگاہی حاصل کی اور یہ کہ تمہاری قابل قدر کوششوں سے سابق شاہ کا قریبی ایک اہم گھرانہ گرفتار ہوا۔ اور یہ کہ تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر شہر دہلی میں دوسروں کو انعام میں لینے والے جعلی خطوط لکھے اور اس طرح وہاں بے اطمینانی اور نا امانی کے بیج بوائے۔

اور یہ کہ تمہارے اندر جاسوسی کی اعلا درجے کی لیاقتیں ہیں، تم ہمیشہ قابل اعتبار رہے اور ہمارے لیے سودمند رہے اور یہ کہ تم نے متحدہ انہم اور امتیازی خدمات انجام دی ہیں۔ لہذا صوبہ پنجاب ضلع میں تمہیں ہزار ایکڑ زمین کی جاگیر بخشی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ 2280 روپے تمہارے نام تاحیات پانچ سو روپے برائے نسلاناً بعد نسل، ہماری کمال عنایت کے سبب یہ عمر بھر جاری رہے گی اور چودہ سو روپے کی جاگیر نسلاناً بعد نسل تمہارے ان بیٹوں کے لیے ہوگی جو تمہارے اپنے خونی رشتے کے وارث ہوں۔

چیف کسٹرن پنجاب کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ تمہیں اس فرمان عام کے ساتھ ایک خلعت مانگی پانچ ہزار روپے پیش کی جائے۔ تم بلاشبہ اس اعلا انعام کو اپنی آسائش اور بہبودی کا ذریعہ سمجھو گے جو بعض تمہاری خدمات کے تمہیں عطا کیا گیا ہے اور اس فرمان کو اپنے دوستوں اور ہمسروں کے درمیان ذلتی فخر اور عزت کا باعث خیال کرو گے۔

☆☆☆☆

لجی کا وفد تھا، داؤد امین ابھی تک اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ کمپیوٹر کے آگے بیٹھے اس کے ہاتھ مستقل حرکت میں تھے۔ آنکھیں اسکرین پر، ڈیٹ کو لا کا ایک کہین میز پر رکھا تھا جس میں سے وہ وقفے وقفے سے نمونہ بھر لیتا، اتنے میں دور از دیکھا اور لارا جونز اندر داخل ہوئی۔

”یہ ہا تمہارا لجی۔“ اس نے شاہ سے ڈا بالال

کر جیجی کے کھانے کی مہک آفس میں بچھا تھا۔  
”تھیک یو ڈی اے تم نے ہی سب سے جاننا دوست ہو۔“ داؤد امین نے اسکرین سے غور سے بٹائیں اور لارا کی دیکھ کر۔

”کل سے بہت معروف ہے، لجی کے لیے بھی وقت نہیں مل رہا۔“ لارا نے لپٹائی کاٹا کھانے ہوئے تبصرہ کیا۔ داؤد مسکرا دیا۔ کمپیوٹر بند کر کے اپنے لجی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں اتنا ایکساٹنڈ ہوں کہ مجھے بیک بھی نہیں لگ رہی۔“ داؤد نے زمینوں کا کھراٹھا کر حوض میں رکھا۔

”تو مسٹر داؤد! اس ایکساٹنڈ کی وجہ کا اعلان کب کریں گے۔“

لارا کے ٹھنڈے پرسکون لہجے اور تفصیل میں ایک میٹھا سا طنز چھپا تھا جسے بھانپ کر داؤد نے قہقہہ لگایا۔ لارا کو لگ بھگ، بڑی اچھی دوست تھی۔ آفس میں سب سے زیادہ وہی داؤد کے قریب تھی، اپنے پیشہ دارانہ معاملات ایک دوسرے سے ڈسکس بھی کر لیتے تھے اور مشاورت بھی مگر اس بار داؤد نے دو چار روز سے اپنے ارد گرد ایک خاموشی پر اسرار تھا قائم کی ہوئی تھی۔ لارا کا اشارہ اسی طرف تھا اور وہ فوراً سمجھ گیا تھا۔

”میں تمہاری طرف سے اسی بات کا انتظار کر رہا تھا۔“ لارا کا فقرہ سن کر وہ بہت محفوظ ہوا تھا۔ بڑے اطمینان سے بیڑا کا ایک ٹکڑا ختم کر کے داؤد نے بتایا۔

”جنٹری تھامس کا کیس میرے پاس آیا ہے، میں نے یہ کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ساری دنیا کو معلوم ہے کہ وہ مجرم ہے۔“ لارا بھی بہت اطمینان سے اپنا لجی ختم کر رہی تھی۔

”کیس کا فیصلہ دنیا نہیں، عدالت کرے گی۔“

”جوتوں پر، گواہوں پر اور بیانات پر چلتی ہے۔“

”سارے ثبوت اور گواہی جیڑی کے خلاف ہیں۔“



”مگر میں اسے بے گناہ ثابت کروں گا۔“  
داؤد کے چہرے پر، لہجے میں وہی اعتماد تھا جو اس کی  
فطرت کا خاصا تھا۔

”جو دھوپیں منزل پر بیٹھنے کا یہ مطلب نہیں ہے  
کہ دھوپیں اتنے ہی بلند کیے جائیں۔“  
لارا مسکرائی۔ یہ طنز نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی۔  
اس کیس کے بارے میں وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی  
کہ جو ثبوت اور گواہ موجود ہیں وہ جیفری کا موقف  
کمزور ثابت کرنے اور اسے سزا دلوانے کے لیے  
کافی ہیں۔

”جانتی ہو ایڈم نے یہ کیس لینے سے انکار  
کیوں کیا؟“

”شاید اس کے ضمیر نے اجازت نہیں دی، کوئی  
بھی اچھاکیل جیفری جیسے کرمشل کو رہا کروا کر خود کو  
اور اپنے کیریئر کو داغ دار نہیں کرے گا۔“ لارا ذرا  
حفاظت ہو کر بولی۔

”کم آن لارا! بچوں جیسی باتیں مت کرو۔“  
داؤد نے باقی ماندہ چیز ختم کرتے ہوئے مسکرا کر  
اسے دیکھا۔

”اگر ہم ہر کیس اخلاقیات کے پیمانے پر  
تولنے بیٹھ جائیں تو دنیا کا ہر وکیل اپنے پورے کیریئر  
کے آدمے سے زیادہ کیسز لڑنے کے بجائے چھوڑ  
دے مگر تم جانتی ہو ایسا نہیں ہوتا۔ میں اس فیلڈ میں  
آیا ہوں تو مجھے پسہ بھی کمانا ہے اور آگے تک جانا  
ہے اور یہی بات ایڈم کی تو نوے فیصد وکلاء کی طرح  
اس نے یہ سوچ کر یہ کیس چھوڑ دیا کہ جو توں اور  
گواہوں کی موجودگی میں جیفری کو سزا دینی ہے۔ یہ  
وہ مقدمہ ہے جس میں جیفری کی طرف سے لڑنے  
والے ہر وکیل کو اپنی ہار دینی نظر آرہی ہے۔“ نج بستہ  
بیکز کا کھونٹ بھرتے ہوئے داؤد نے اپنا تجزیہ پیش  
کیا۔

”اور تمہیں یہ ہار نظر نہیں آرہی؟“ لارا نے  
ایک کوری سانس لی۔  
داؤد میز پر کہنیاں یک کر آگے کو جھکا اور اس

نے لارا کی آنکھوں میں جھانکا۔

”لارا ڈیر! مجھے اس کیس میں فقط ایک ہی شے  
نظر آتی ہے، وہ ہے بھاری فیس جو جیت کی صورت  
میں دینی ہو کر ملے گی۔ اتنی بڑی رقم کے لیے میں کسی  
بھی ہار کو جیت میں بدل سکتا ہوں اور تم سے زیادہ  
میری صلاحیتوں کو کون جانتا ہے۔“

”اتفاق سے میں اس مافیائے بھی تھوڑی بہت  
باخبر ہوں جو جیفری کے پیچھے ہے اور اسے سپورٹ  
کر رہا ہے۔ بے شک جیت کی صورت میں وہ  
تمہاری فیس ڈبل کر کے دے سکتے ہیں مگر یہ بھی  
دھیان رہے کہ حکمت کا جواب ایک گولی بھی ہو سکتا  
ہے۔ جو ان لوگوں کے لیے ایک عام سی بات ہے۔“  
لارا بے حد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”بڑی کامیابی کے لیے رسک بھی بڑا ہی لیا  
جاتا ہے۔“ داؤد امین لارا سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو چلا  
تھا۔

☆☆☆

”قسمت کے پھیر ہیں یا تقدیر کی گردش یا  
گناہوں کی سزا یا خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے  
کوئی آزمائش۔ کیا ہے یہ سب؟ لاکھ سے خاک پر  
اور آسمان سے زمین پر آگئے؟“

رفعت میں اپنی بہن کی نسبت برداشت کا مادہ  
کم تھا پھر وہ بھی بے حد کم سن۔ چودھواں برس لگا  
تھا کہ بیاہ ہو گیا اور بیاہ کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ  
پورے گھرانے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ طیبہ بیگم کون  
سا عمر اور تجربے کی بجائی سے گزری ہوئی تھیں۔ دو  
سال کا ہی تو فرق تھا دونوں میں، مگر مزاج میں ٹھہراؤ،  
بردباری اور صبر و تحمل کے اوصاف چھوٹی بہن کی  
نسبت زیادہ تھے پھر بھی زندگی میں یہ جو انقلاب  
آپا۔ مشکل ہی تھا کہ جھیل پاتیں اگر جو بوا ساتھ نہ  
ہوئیں۔

خدیجہ بوا ان دونوں بہنوں کی آپا تھیں، بچپن  
سے ہی دونوں بہنیں ان سے بہت مانوس تھیں۔  
شادی ہوئی تو ڈھیروں ڈھیر ساز و سامان کے



علاوہ ایک ایک ذاتی ملازمہ اور بوا بھی جنہ میں ساتھ  
آئی تھیں اور جہاں تک ممکن تھا وہ حق تک ادا کر رہی  
تھیں۔ اس وقت بھی وہ ٹیپھی لور فاطمہ کے ”لوئی“  
کر رہی تھیں بلکہ تقریباً کر رہی چکی تھیں۔ بچی کا جانہ  
سلا جلا چہرہ اور فراخ پیشانی دیکھ کر کیا کیا کچھ سوچ کر  
رہ گئیں۔

”سب نصیب کے کھیل ہیں۔ اگر جو ہوتی یہ  
بچی اپنے باپ دادا کی جو ملی میں، وہاں پیدا ہوتی تو  
کیا کیا نہ خوشی منائی جاتی۔ کیسے کیسے عیش و آرام اور  
نازوں میں بچتی، وہ لاڈ اٹھائے جاتے کہ شہزادیوں  
کے بھی کیا اٹھے ہوں گے۔ میر صاحب کی نفی  
خواہش بھی گھر میں اللہ کی رحمت آئے۔ اپنی بیٹی نہیں  
تھی مگر بیٹی کا ارمان اور جاؤ بہت تھا۔ ہائے.....“  
بوانے ایک سرد آہ بھری۔ ”سب کچھ ختم  
ہو گیا۔ لوگ بھی، ان کی شان و شوکت اور مال و  
دولت بھی اور ان کی خواہشیں اور ارمان بھی۔“ بوا کی  
بوڑھی آنکھیں بات بے بات بھگ جاتی تھیں۔  
رفعت اپنی آبا سے چکے چکے شکوے کر رہی تھی  
یا اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

”جب وہ دن نہیں رہے تو یہ بھی نہیں رہیں  
گے۔“ طیبہ نے ہولے سے بہن کو تسلی دی اور نور  
فاطمہ کو گود میں لیا۔

”ہمیں ڈر لگتا ہے، کہیں ہماری بیٹی کا نصیب  
بھی ہماری طرح نہ ہو۔“

”نہ میری رانی نہ، ایسی باتیں نہ کرو۔ خیر کا کلمہ  
ٹکا لو منہ سے۔ اس بچی کی تو ماشاء اللہ جیسی روشن  
پیشانی ہے، ویسا ہی روشن نصیب بھی ہوگا ان شاء اللہ  
اور اللہ میری ان دونوں شہزادیوں کا بھی اقبال پھر  
سے بلند کرے۔ چاندی کے چمچر کھٹ پر سوئیں،  
سونے کے برتنوں سے کھلیں۔ چاند کی پریاں آ کر  
جھولا جھلائیں، سب مل کر اللہ کے گیت گائیں۔“  
بوا اپنے آہل کی جمولی پھیلا کر کے حضور  
دعا کر رہی تھیں، وہی دعا جو ان دونوں کو بچپن میں  
رات سونے سے پہلے لوری کی شکل میں سناتی تھیں۔

”کیا بچا، اب حضور اور بھائی صاحب ہمیں  
ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں۔“ طیبہ کی امید لب لب  
نہیں لونی تھی۔

”آمین، آمین، آمین، آمین۔ یا رب العالمین۔“  
بوا صدق دل سے آمین کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

کسی نے کہا تھا کہ برطانیہ کی سلطنت پر  
آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔ ارنسٹ جینز نے ایک  
طویل پامعنی نظم بعنوان ”ہندوستان یا نئی دنیا کی  
بغات“ لکھی۔ اس کے دیباچے میں ارنسٹ جینز  
نے اس مشہور شہنشاہی نعرے یا مقولے کو یوں لکھا  
کہ ”برطانیہ کی نور آبادیوں پر سورج کبھی غروب نہیں  
ہوتا، لیکن خون بھی کبھی خشک نہیں ہوتا۔“

برصغیر جو ایک سونے کی کان تھا اور اب بھی  
ہے۔ اس کان سے سونا نکالنے کی آرزو میں برٹش  
بھی یہاں آئے، فراہسی بھی، مگر فتح انگریز کو گئی جو  
سولہویں صدی میں تاجربن کر اس خطے میں داخل ہوا  
اور آہستہ آہستہ اس نے یہاں کے حکمرانوں کی  
مختلف کمزوریوں اور نا اتفاقیوں سے فائدہ اٹھایا۔  
ڈیو ایڈ اینڈ رول کا کلیہ یہاں چسپاں کیا اور پہلے  
1757ء میں لارڈ کلایو کی معیت میں بنگال کے  
حکمران سراج الدولہ کو شکست دے کر ایسٹ انڈیا  
کمپنی کے اقتدار کی راہ مزید ہموار کی گئی۔ 4 مئی  
1799ء کو ریاست میسور، قلعہ سرنگا پٹم میں، شیو  
سلطان شہید نے انتہائی بہادری سے لڑتے ہوئے  
اپنی جان دی تو دو گھنٹے تک انگریز فوج کا کوئی سپاہی  
ڈر کے مارے سلطان کے قریب نہ آیا کہ کہیں زخمہ  
نہو۔

بنگال اور دکن کے ان دونوں عالی ہمت اور  
بہادر حکمرانوں کو شکست دینے کے لیے باہر سے حملہ  
کیا گیا اور اندر سے لقب لگائی گئی۔ دونوں کی شکست  
میں ان کے قریبی وزراء کی غداری نے اہم کردار ادا  
کیا۔ تاریخ کے اس تاریک اور شرمناک باب کو  
اقبال نے یوں رقم کیا۔



جفر از بچل، صادق از دکن  
نک دین، نک ملت، نک وطن

اور پھر 1857ء میں مسلمانوں کے رہے  
ہے اقتدار کی بجائی بھی سانس بھی چھین لی گئیں  
زور پڑا حکومت کو کرانے کے لیے فقط ایک دھکے  
کی ضرورت تھی، جسے دے کر اگلے نوے سالوں تک  
انگریز اس خطے کا فرماں روا تھا۔ اس کے اقتدار کی  
بنیادوں میں لاتعداد باشندگان برصغیر کا خون  
ہے جس میں کثیر اور نمایاں تعداد ایک ہی قوم کی تھی  
”نئے مسلمان۔ اس کی واضح اور بڑی وجہ یہی تھی کہ  
یہ اس خطے کے حکمران تھے جس پر تسلط کا عزم اور  
لڑوے کر انگریز یہاں وارد ہوا تھا اور یہی وہ قوم تھی  
جس کی ناک میں بھی اگر کوئی معمولی سا چنگاری باقی  
رہ جاتی ہے تو اسے شعلہ بن کر بجھنے کا فن آتا ہے۔  
اس قوم کو مرنے کے بعد سنبھلنا آتا ہے۔

1857ء کی آخری ضرب میں یہ اس مسلمان  
کو ناک کرنے کی کوشش کی گئی، سچلنے کی کوشش کی گئی  
جو جہانپانی و جہاں گیری کی چنگاری اپنے اندر رکھتا  
تھا۔“

نور قاطب، گرینڈ پا کا لکھا تازہ ترین باب پڑھ  
دی تھی اور اس کے ذہن میں کئی سوالات ابھر رہے  
تھے۔

☆☆☆

سر جھکائے بڑے انہماک سے ایک ضروری  
فائل کا مطالعہ کر دیا تھا۔ اچانک اس کے آفس کا  
دروازہ کھلا، عبدالعید نے چونک کر سر اٹھایا اور اپنی  
جگہ ٹھہر گیا۔ اس کے سامنے ماریہ کھڑی تھی اور  
بچے بچے اس کی بیک میٹری کی تھیں۔

”کراہیہ زبردستی اندر کس آئیں، میں نے  
لوگت کی کوشش کی تو بد تمیزی کرنے لگیں۔“ کی تھیں  
نے عبدالعید کو مخاطب کرتے ہوئے ماریہ کو گھورا۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے، بہت  
مہم۔“ ماریہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے  
گئی۔

”کیٹ اتم جاؤ اور تھوڑی دیر تک کسی کو اندر  
نہیں بھیجنا۔“ عبدالعید نے اپنے غصے اور خوف کو  
قابو کرتے ہوئے کی تھیں کو حکم دیا۔

”اوکے۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں  
کندھے اچکائے اور چلی گئی۔

”تمہیں یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟“  
انتہائی غصیلے لہجے میں وہ ماریہ سے مخاطب ہوا۔

”آپ نے اپنا کوئی رابطہ نمبر نہیں دیا، پچھلے  
ایک ہفتے سے آپ آئے نہیں۔“

”میں مصروف تھا، تمہیں ایسی کیا ایرجنسی آن  
پڑی جو تم یہاں تک چلی آئیں اور.....“ وہ ایک  
لمحے کو رکھا۔ ”تمہیں یہاں کا ایڈریس کس نے دیا؟“

عبدالعید کا رویہ انتہائی درشت تھا۔ ماریہ کو  
اپنے سامنے، اپنے آفس میں دیکھ کر ایک لمحے کو تو  
اس کی سانس ہی رگ گئی تھی۔

”آپ گھر آ رہے ہیں، آج یا کل؟“ ماریہ  
نے اس کے اکٹھے لہجے اور سوال کو نظر انداز کیا۔

”تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟“ عبدالعید نے  
الفاظ بدل کر پھر وہی سوال دہرایا۔

”آپ آئیں گے تو اس سوال کا جواب مل  
جائے گا۔“ ماریہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں، فوراً باہر  
نکل گئی۔

☆☆☆

طیبہ، گرجے کا کپڑا گھٹنوں پر پھیلائے بڑی  
احتیاط اور عرق ریزی سے ٹانگے بھر رہی تھی۔ باہر صحن  
میں بیٹھے شبنم بھائی اور بوا کی آوازیں، بخوبی سنائی  
دے رہی تھیں۔ رشیدہ بھابھی ہنڈیا کے لیے مسالا  
پیس رہی تھیں۔ سل نے کی مخصوص کھٹ کھٹ بھی  
ان آوازوں میں شامل ہو گئی تھی۔

”جو پتا اور نشانیاں آپ نے بتائیں، وہاں گیا  
تھا اس رجواڑے میں تو کوئی مہندر راجپوت اپنے  
کنبے کے ساتھ ہے۔ سنا ہے کہ انگریز کی طرف سے  
انعام میں حویلی اراضی اور زمین داری ملی ہے۔ کھلم  
کھلا کسی سے پوچھ نہیں سکتا، کیا خبر کون جتاور لاٹ



”یہ سل ہی کچھ چکنی ہوگئی ہے۔ عرصہ ہوا مٹا نہیں گئی۔“ رشیدہ بھابھی نے مسئلے کی ایک اور پہلو بیان کی۔

”لاؤ، میں ابھی شہین میاں سے کرواتی ہوں۔ تم فارغ ہو جاؤ اپنے کام سے۔ دیے آج کیا ہلکا رہندہ رہی ہو؟“

”آلو گوشت؟“

”لاؤ تو پھر کو کھیر چن دوں۔“ ہوا ہوا دھڑ توڑنے کے لیے کیاری کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

صوفیہ برعین یاریہ کے مقابل بیٹھے عبدالعید کے چہرے پر ناگواری تھی۔

”آئندہ تم نہ میرے آفس آؤ گی، نہ مجھ سے ملنے کہیں اور، میں خود ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ سمجھیں تم؟“

”سمجھ گئی۔“ ماریہ نے سرد مہر انداز میں جواب دیا۔

”اب بتاؤ تم.....“ عبدالعید کا سوال ادھر ہی رہ گیا۔ بیڈ روم کے کھلے دروازے سے ایک لڑکا باہر آیا اور ماریہ کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔

”ہیلو۔“ عبدالعید کو اس نے مسکرا کر ہیلو کیا تھا۔ وہ بامشکل بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ جینز شرٹ میں ملبوس، سرسئی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی۔ ٹھوڑی پر جیسے کسی زخم کا چھوٹا سا نشان تھا۔ گے میں چین اور ہاتھوں میں بریسلٹ اور کڑے بجوی طور پر اس کی شخصیت کا تاثر نچلے طبقے کے کسی نیم خواندہ اور لا اہالی لڑکے کا تھا۔

”یہ ہیری ہے۔ ہیری آئزک۔ میرا بوائے فرینڈ۔ ہم شادی کرنے والے ہیں۔“

ہاتی آئندہ ماہ ان شادی

صاحب کا جاسوس ہے، کون نہیں۔ دہلی بی زبان میں ایک دو سے پوچھا، کسی نے سلی بخش جواب نہیں دیا یا تو واقعتاً لاعلم ہیں یا پھر ڈر کے مارے منہ میں گھٹنیاں ڈالے ہیں۔“ شہین میاں نے بولتے بولتے ایک گہری سانس لی۔

”دو سردار حسین سقہ، غلام مصطفیٰ درزی اور تارا چند بزاز، کوئی ملا؟“

”تینوں میں سے کسی کا کچھ پتا نہیں۔ مالکوں کے ساتھ نوکر بھی سب غائب ہیں۔ ہاں غلام مصطفیٰ کا کوئی بھائی بھتیجا تھا، اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے پیغام دے آیا ہوں کہ بڑی حویلی والے خان صاحب کے خاندان کا کوئی بھی فرد آئے یا ملے تو پیغام دے دیتا۔ ان کی دو مستورات اپنی کھلائی (بوا) کے ساتھ میرے ہاں ہیں۔ اپنا پتا دے آیا ہوں۔“

شہین میاں نے اپنی طویل بات کا اختتام کیا، ہوائے اطمینان کی سانس لی۔

”چلو یہ بھی بہت ہے، کیا خبر کوئی ڈھونڈتا ڈھانڈتا آئی جائے۔“

یہ گفتگو سننے ہوئے اندر بیٹھی طیبہ کی انگلی میں کئی بار سوئی گچ سے کھینچی مگر اسے اس معمولی تکلیف کی چنداں پروا نہ تھی۔ اس کا رواں رواں دعا کر رہا تھا کہ میکے سے کوئی نہ کوئی انہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آ جائے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ باہر بوا اب رشیدہ بھابھی کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

”اے بیوی! مسالا نہیں رہی ہو یا پتھر کوٹ رہی ہو۔ ایسی دھنا دھن؟ بے کا شور تو مولا کانوں میں گھسا جا رہا ہے۔“

”اماں! ہمدی کی کانٹھ بڑی سخت ہے، اسے ہی کوٹ رہی تھی۔“

رشیدہ بھابھی کا ہاتھ بولنے کے دوران بھی نہیں رکھا تھا۔ ہمدی کی کانٹھ پر مستقل مار رہی تھیں۔ جھککڑے ٹکڑے ٹکڑے تو ہوا خرواہی گئی تھی۔

”ایسی سخت شے کو تو پہلے ہاون دستے میں کوٹ لیا کرو۔“ ہوائے گے ہاتھوں مشورہ دے لالا۔



عنبرین ولی

# دوست کی مشعل

اس کا نام مشعل تھا۔ بڑی بڑی روشن چمکتی  
ان کے اندر لائین فٹ کر رکھی ہو۔ اتنی روشنی۔ اللہ۔  
آئیں۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر یوں لگتا جیسے کسی نے  
یہ آنکھیں تو اندھیرے میں بھی چمکتی تھیں۔ اس کی





چمک دیکھ کر اکثر ہی روشن مہرہ ہو کر رہ جاتا لیکن اسے چڑانے کو کہتا۔

”کچھ بتا دو۔ تمہارے اندر کسی جانور کی روح تو نہیں کھس گئی؟ کیونکہ اندھیرے میں صرف ان کی ہی آنکھیں چمکتی ہیں۔“ وہ چڑ جاتی۔ جس چیز کی تعریف ساری دنیا کرتی تھی۔ وہ ان کی برائی کرتا۔ اسی لیے اس کی اپنے چچا زاد روشن سے بھی نہ بنی۔ کبے بنتی بھلا۔ وہ سدا کا شرارتی اور وہ نازک دل کی۔ اس کی شرارتوں سے وہ ہمیشہ خائف رہتی۔ بھی ان کے پیچھے چھپی نبت وہ محسوس ہی نہ کر پائی۔

اور ویسے بھی اس قسم کی باتیں محسوس کرنے کے لیے تھوڑی بہت عقل تو چاہیے ہی ہوتی ہے اور وہ تو کوری تھی۔ بالآخر بھی۔

بھی کسی ہم عمر تو کیا چھوٹی بڑی عمر کی لڑکی سے بھی دوستی نہ ہوگی۔ شاید وہی اسے دنیا داری کی کچھ عقل دے سکتی۔ یا کم از کم اس سبکی کے گھر آنے اور روشن کی خوب روئی پر مر مٹنے سے ہی مشعال کو اپنے ننھے سے دل میں دبی محبت دریافت کرنے میں آسانی ہوتی۔ یہ خوش فہمیوں بھرا خیال روشن کا تھا۔ اور وہ خوش فہم کیوں نہ ہوتا؟ وہ مشعال سے دو سال پہلے پیدا ہوا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی غیر معمولی تھی۔ دادا ابائے اسے یہ نہ دیا کہ یہی بچے گا۔

دو سال بعد وہ پیدا ہوئی۔ اس کے پیدا ہونے کے چند گھنٹوں بعد رات پھیل گئی۔ اچانک ہی ان کے کمرے کا بلب فیل ہو گیا۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ دادی نے سوچا کہ وہ اٹھ کر موسم کرتیاں روشن کر دیں، اس سے پہلے کہ وہ اپنی سوچ پر عمل پیرا ہوتیں، بہو بیگم کی کاہلی آواز ان کی سماعتوں میں اترتی۔

”اماں۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ بچی کو دیکھیں کیا ہو گیا ہے۔“ اور انہوں نے دیکھا۔ لمبے بھر کو وہ بھی گھبرا گئیں۔ لیکن فرار ہی خود پر قابو پایا۔ مشعال اپنی گہری سیاہ بے حاشا آنکھیں کھول کر یہاں وہاں دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا تھا اور اس

اندھیرے میں دو ستاروں سے چمکتے نین نے انکی چند لمحوں کے لیے خوفزدہ ہی کر دیا تھا۔ بھلا آئی سے پہلے بھی ایسا ہوا ہوتا تو ان کے دل کو بھی ڈھارس ہوتی۔ روشن میں بھی یہ خاصیت تھی لیکن اتنی نکلیا۔

خیر دادی نے اسی وقت اس کا نام مشعال رکھا۔ روشن کی روشنی مشعال کے آتے ہی چھس ہو گئی۔ اب وہ ہر جگہ لائٹن جیسی آنکھیں لے کر گھومتی۔ لوگ رک رک کر ان غیر معمولی حسین آنکھوں کو دیکھتے۔ حیران ہوتے۔ کچھ ماشاء اللہ کہتے، کچھ نہ کہتے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں درد ہو جاتا، کبھی اچانک ہی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ دادی جب تک زندہ رہیں بلا ناغہ اس کی نظر اتارتی رہیں۔

ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کی آنکھوں نے بھی چمکنا کم کر دیا۔ اب نظر بھی کم کم ہی تھی۔ مگر بہر حال وہ آج بھی روشن کی آنکھوں سے کئی گنا حسین آنکھیں لے کر گھوما کرتی۔

شروع شروع میں تو روشن جل بھن کر کباب بن جاتا لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا۔ ان کے سر میں ڈوبتا گیا۔ وہ اسے دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔ مشعال کو دیکھنا اس کا حق بھی تھا۔ وہ اس کے اٹھتے چاچو کی اٹھوتی بیٹی تھی۔ پہلا حق روشن کا تھا۔ آخر گھر کا بچہ تھا۔ گھر کا بچہ ایسے حقوق کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی تیز تھا۔ دل ہی دل میں سب طے کر لیا۔ حساب کتاب بھی کر لیا۔ اتنی عمر میں منگنی ہوگی، پھر نکاح، پھر شادی۔ شادی میں فلاں فلاں مہمان آئیں گے۔ وہ اپنا کمرہ ایسے سجائے گا، ویسے سجائے گا۔ یہ کرے گا، وہ کرے گا۔ ہاں سب کچھ کرے گا۔ بس مشعال سے نہیں پوچھے گا کہ آیا وہ بھی اس ساری پلاننگ میں شامل ہونے کی خواہشمند ہے یا نہیں۔

مشعال اس کے چاچا جی کی بیٹی سی لیکن اس کی شخصیت کا ایک رعب تھا جو روشن کو ڈائریکٹ کچھ بھی کہنے سے روکتا۔ کئی بار اس نے دانستہ ایسی حرکت کی کہ وہ سب کچھ نہ سکی تھوڑا بہت ہی اس کے جذبات سمجھ جائے۔ لیکن اس



دیکھا، پھر اس کی ہانکوں کو اور پھر جو ہنسا شروع ہوئی۔ وہ محبت پر بھاگ گیا لیکن اس کے تکتے روشن کے کانوں کے پردے پھاڑتے رہے۔

وہ بے حد افسردہ تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ مشعال پورے گھر کی لڑلی تھی۔ لڑائی تو وہ بھی تھا لیکن جو اہمیت مشعال کی تھی وہ کسی کی نہیں تھی۔ اسے مشعال کی اہمیت نہیں پوری کی پوری مشعال چاہیے تھی۔ اس کے دل میں دوست آنے لگے۔ وہ دوڑ کر ماں کے پاس گیا۔

”کیا چاہنے سے کام کرنے کی اجازت دے دی؟“ وہ جواب جانتا تھا پھر بھی سوال کر بیٹھا۔ امینہ نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔

”کیا اسے اجازت نہیں دینا چاہیے تھی؟“ وہ تہہ کیے ہوئے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی۔ بیٹے کی بے قراری نے انہیں سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ آخر اسے مشعال کے آفس جانے سے کیا مسئلہ؟

”نہیں۔“ اس نے طبیعت سے کہا۔

”کیوں؟“ ان کے بھی ابرو تن گئے۔

”کیا چچا چچی یہ بات نہیں جانتے کہ وہ سکتی

حسین ہے اور اس کی آنکھیں۔ کوئی اس پر عاشق ہو گیا تو؟“ وہ بے اختیار میں بول اٹھا پھر فوراً ہی

ٹکا ہوا جھکا لیں۔ امینہ نے حیران ہو کر اپنے بیٹے کو

دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑا بڑا ”میں عاشق آوارہ“

لکھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس یادیدہ رقیب سے جلن

کی سرخی بھی گالوں پر تیر رہی تھی۔ ان کا دل چاہا وہ

اپنے اس معصوم سے بیٹے کا منہ چوم لیں۔ لیکن وہ بھی

اسی کی اماں تھیں اور مشعال کی چچی۔ دل پر قابو پایا۔

”کوئی اس پر عاشق ہو کر جاؤ چوچلوں سے

اسے بیاہ کر لے جائے۔ اس سے اچھی بات اور کیا

ہوگی بھلا؟ ویسے بھی وہ اس قابل ہے کہ.....“ اس

سے زیادہ وہ سن نہ سکا۔ تیزی سے کمرے سے نکل

گیا۔ امینہ مسکرائی رہ گئیں۔

☆☆☆

دن بھی شام بھی۔ دو کوگی بہری اندھی نہیں تھی لیکن برون کو لگنے لگا تھا کہ یہ تینوں خصوصیات اس میں اس وقت پیدا ہو جاتی ہیں جب وہ جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں میں محبت بھر کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ اب بے کتبوز تھا کہ وہ دانستہ ایسا کرتی ہے یا غیر دانستہ۔ ہر مال جو بھی تھا۔ اسے اس بات کا پکا یقین تھا کہ مشعال صرف روشن کی ہے اور یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں میں مشعال کی آنکھوں سے بھی زیادہ چمک بھر جاتی۔ آسمان کے مارے ستارے جلنے بجھنے لگتے اور وہ محبت کے پانیوں میں چھپی چھپا چھپی کرنا ہنسا رہتا۔

☆☆☆

اس کے چنے کے دن بھی شاید گئے چنے ہی تھے۔ ایک دن مشعال نے کھانے کی میز پر اس کی ہاتھوں میں ہم پھوڑا۔

”ابا۔ میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔“ روشن کے

منہ میں نوالہ پھنس گیا۔ روشن کی اماں امینہ نے اس کی

کمر سہلانے کے بہانے زور زور سے دو چار دھمکو کے

چڑ دیے۔ سب یہی سمجھے کہ نوالہ پھنس گیا ہے، امینہ سمجھ

گئیں کہ اسے نوالہ نہیں مشعال کی بات پھنسی ہے۔

”ارے واہ۔ بڑی جلدی خیال آ گیا میری بیٹی

کو۔“ میں نے تو سوچا تھا کہ رزلٹ والے دن ہی تم

مجھ سے یہ فرمائش کرو گی لیکن تم نے تو پورا ہفتہ گزار

لیا۔“ دوشیرات سے بولے۔

روشن کی روشنی بجھ گئی۔ یہ کیا؟ ایک اس کا ہی

گھر ساری دنیا سے نرالا ہونا تھا؟ کیا چچا جان جانتے

تھیں کہ یہ دنیا کتنی بڑی ہے اور آفس کے لوگ تو سب

سے بڑے۔ اسے اب کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دونوں

باپ بیٹی کی بات درمیان میں ہی رو گئی۔ امینہ زبردستی

منکراتے ہوئے بے دھیانی میں اس کی گردن سہلانا

آواز آئی۔ کرسی چھو کر گی۔ وہ پیچھے ہٹا اور پھر ڈھنک

اس کوگی بہری اندھی کی ساری حیات یکے بعد

دوسرے ہانکا شروع ہو گئیں۔ اس نے پہلے روشن کو



مج بی بی حسین تھی۔ جیسے روشن کا سوڈ سخت  
آف تھا۔ مشعل نے جس آفس کو جوائن کیا تھا وہ  
روشن کے راستے میں ہی پڑا تھا تو اس کے باحضور  
نے ایک ایضہ ڈربا کی ذمہ داری اس کے محکمے  
ہوئے محکمہ ہوں پر ڈال دی۔ مشعل خوش تھی کہ وہ  
آسانی سے نہ صرف آجائے کی بلکہ بس میں ستر کرنے  
سے جدت پر باہر ہوتا ہے وہ بھی کافی جائے گا۔

مشعل چار سو روپے کی پنچل پر آئی۔ یہ یاد رکھ کر  
کرن اس کی گنتی رحمت پر خوب فخر رہا تھا۔ بھی سی سرخی،  
سکا اور گالوں پر پچھ رنگ کا پیش۔ دو مٹی جان سے جل  
میکہ مشعل اسے اپنے ہاتھوں سے تو کیا نہ مٹی سے بھی  
دور جاتی دکھائی دی۔ اس نے ناشتے سے ہاتھ منی لیا۔  
”تم بشت کر کے آ جاؤ۔ میں باہر انتظار کر رہا  
ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”ایف میں محسوس کر رہی ہوں کہ روشن پچھلے  
کچھ دن سے زیادہ سی خاموش رہنے لگا ہے؟“ یہ  
سرت تھیں۔ اس کی کھانے میں عدم دلچسپی کو تو وہ  
پچھلے مٹی دن سے محسوس کر رہی تھیں۔ اب بات بھی  
تپ کرتا جب بولنا پنا گزیر ہو جاتا۔ مشعل کی موجودگی  
کی وجہ سے وہ خاموش ہو گئیں۔

وہ بھی بیٹے کی بے سکونی محسوس کر رہی تھیں لیکن  
خاطر ہے وہ اس کے خدشے کے پیش ٹھہرا ہوا مشعل کو  
گھر میں بند رہنے کا تو نہیں کہہ سکتی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا  
کہ وہ سرت سے اس مسئلے کو ڈھکس کریں گی لیکن پھر  
کچھ سوچ کر خاموش ہو گئیں۔ کیا خبر وہ اس کی ضرورت  
سے زیادہ حساسیت کو شکی ظہرت نہ سمجھتی تھیں۔

وہ سوچی سمجھی تھیں کہ اب جلد ہی وہ ان سے مشعل  
احسان کے رشتے کی بات کریں گی۔ یہی بہترین حل تھا۔  
☆☆☆☆

”تمہیں پتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے  
باس بالکل بچک ہیں۔ ان کی عمر یا مشکل سی انیس تیس  
سال ہوگی۔ آفس کی ساری لڑکیاں ان کی وجاہت کے  
قیمے ستانی رہتی ہیں۔“ وہ آفس کریم کھاتے ہوئے  
انتہائی سے تپانے لگی۔ وہ جو اس بات پر خوش تھا کہ وہ

اور مشعل کچھ دیر سکون سے ایک دوسرے کے  
بیٹھے رہیں گے تو یہ اس کی تھک چکی تھی۔ وہ اس کے  
زیر دستی کی تروی کوئی رکھ چکی تھی اور اب اس کے  
اپنے اندر اپنا رہا تھا۔ آفس جاتے ہی اسے ہر جگہ  
وجاہت دکھائی دینے لگی تھی، ستانی بھی دے رہی تھی  
ایک ہی سامنے کی چیز تھا جو نہ کھتا نہ مٹی نہ رہتا۔

”تو اس میں اتنی حیرت کی کیا بات  
میرے پاس کی عمر یا مشکل چھپیس سال ہے۔“ یہ  
کر بولا۔ مشعل نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔  
”یہ تمہارے ستر سالہ پاس کہ سے عجیب  
کے ہو گئے؟“ ایک تو یہ بلا لگو لوگ مشعل  
ہمیشہ ہی یاد رکھتے ہیں۔ روشن نے آفس کریم کا  
بھر کر منہ میں ڈالا۔

”وہی مجھے نہیں علم تھا کہ تم اسے جلد  
ہو سکتے ہو۔ مگر جوان پاس کی اتنی سی خواہش  
میرا آفس جوائن کر لو، لیکن جھوٹ تو نہ بولو۔“ وہ  
برامنے بنا کر جوان پاس یوں کہنے لگی جیسے وہ جوان  
پاس نہیں بیوی کی خواہش رکھتا ہو۔ ویسے اس کا آفس  
بہ انہیں تھا۔ روشن کے دماغ میں ایک دم کلک ہوا۔  
”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ وہاں تو انہیں زیادہ

اور جوان لوگ بڑے آرام سے غنی چیزیں قبول کر لیتے  
ہیں جبکہ یہ بڑھے ٹھڈے تو توبہ توبہ۔“ سفید چہرہ  
بالوں اور چہرے حراج والے پاس کی شکل یاد آئی  
تھی اس کا منہ بین گیا۔ اس نے دل ہی دل میں  
دعائیں کی تھیں کہ کاش۔ کاش مشعل کے آفس سے  
موجود سارا اٹل انتہائی بد صورت ہو یا کم از کم پاس ہی  
ہو کہ وہ ہفتے بھر میں آفس سے بھاگ جائے۔ اس کی  
دعائیں الٹ گئی تھیں۔ ایک سے ایک پشیم لڑکا ایک  
سے ایک حسین لڑکی وہاں موجود تھی۔ اس کا دل نہ ڈھکا  
تو وہ غریب خود ہی ڈوب جاتا۔

”ٹھیک ہے تم مجھے سی دی دے دینا۔ ویسے  
آج کل کچھ سٹش خالی ہیں۔ امید ہے تمہیں وہاں  
جابل جائے گی۔“ وہ مسکرا کر خوش دلی سے کہہ رہی  
تھی۔ وہ ان آنکھوں میں ڈوب سا گیا۔ لیکن اس کے



مشعال نے مشکل سے گھومتے سر کو اٹھایا۔

سامنے ایک لمبا ترنگ سفید شرٹ میں لمبوس کوئی آسمانی دیوتا کھڑا تھا۔ لیکن مشعال کو وہ کیونکہ کر دیوتا دکھائی دے سکتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اس سے ٹکرائی تھی اور وہ پتھر کی چیز کچھ اور نہیں وہ خود تھا۔ اس کا منہ اور اس کی ناک۔ دونوں ہی اس کی شرٹ پر لگے عجیب وہ غریب جسم کے پٹروں سے گمراہ تھے۔ چونکہ وہ تیزی سے باہر نکل رہی تھی اس لیے ٹکر بھی زوردار ہوئی۔ ناک پر لگنے والی ضرب سے اس کی نکسیر پھر سے پھوٹ گئی۔ وہ ناک پر ہاتھ رکھے نیچے جھکی تھی۔ اس کی کولیک دوڑ کر اس کے پاس آئی۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ جب کہ وہ اس نووارد کو دیکھ رہی تھی۔

”دکھائی نہیں دیتا آپ کو؟ مانا کہ قد کاٹھ اور جتنے سے آپ ساڑھ لگتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر آتے جاتے کو ٹکرس مارتے پھریں۔“ وہ غصے سے دھاڑی۔ پھلتے پانی نے ان سیاہ آنکھوں کی چمک میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ وہ ہکا بکا سا کھڑا اس کی زبان کے جوہر سے آشنا ہو رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ نہیں پائی کہ آیا سب ایک دم خاموش کیوں ہو گئے ہیں اور کوئی اس ساڑھ کو کچھ سنا کیوں نہیں رہا۔ وہ غصے سے روشن کو دیکھتی خون آلود ناک پر نشور مکتی باہر نکل گئی۔

وہ اس بات پر غصہ بھی کہ روشن کیوں اس کی مدد کو نہ آیا۔ وہ کیا تا تا کہ وہ خود اس وقت حاجت مند تھا۔

☆☆☆

اس کے تمام شکوک درست ثابت ہونے لگے۔ وہ زعیم حیدر۔ وہ بھی مشعال کی آنکھوں کا دیوانہ ہو گیا۔ پورے آفس میں چہ گویاں ہونے لگیں۔

اس شام تو وہ غصے میں گھر چلی گئی۔ اس نے روشن کے آنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ لیکن رات ہوتے ہی وہ چھت پر آئی اور اسے خوب باتیں سنائیں۔

”کیسے مزن ہو تم؟ ایک آدمی نے ٹکر مار کر میری ناک توڑ دی، میرا اتنا خون بہا اور تم بت بنے کھڑے رہے؟ کل کو کوئی اور مسئلہ ہوا تب بھی تم

پھٹنے کے لیے۔ کیا کام کا آئیڈیا تھا۔ وہ اس کا آفس نہ صرف جانتی کر چکا تھا بلکہ اب خوش بھی رہنے لگا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی ہوتی۔ اپنے کام میں مصروف۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ۔ وہ خوش اتفاق تھی لیکن سب کو ایک حد میں رکھتی تھی۔ اس کے سارے خدشات دم توڑنے لگے۔ لیکن یہ تو ابھی صرف شروعات تھی۔

ان دونوں کا مشترکہ پاس، جس کی وجاہت کے چہرے دو بھی سن چکا تھا لیکن دونوں ہی اس کے دیدار سے غروب تھے۔ اس وجاہت کے نمونے کی آمد ہونے ہی والی تھی۔

☆☆☆

وہ سب کے سب مینٹگ روم میں تھے۔ مینٹگ ختم ہونے کے بعد وہ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ روشن نے دیکھا، مشعال اسے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ فوراً اس کے پاس آیا۔

”کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ تشویش سے پوچھنے لگا۔

”ہاں۔ آج گرمی بہت زیادہ ہے تا تو صبح میری نکسیر پھوٹ گئی۔ اور جلدی جلدی کے چکر میں ہاتھ روم کے دروازے سے بھی ٹکرائی۔ اب سر میں پھر سے درد شروع ہو گیا ہے۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔“ وہ اس کا اترنا چہرہ دیکھ کر فکر مند ہو چکا تھا۔ دونوں کا آنا جانا بھی ساتھ تھا۔ مشعال نے اس کی بات کے جواب میں لپٹا ہوا اٹھایا۔ بھی اُحد نے روشن کو آواز دے دی۔

”تم باہر جاؤ میں آتا ہوں۔“ وہ اس کی بات سن کر اٹھی اور ابھی اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اسے بھی اُحد نے پکارا۔ وہ اسے کوئی لطیفہ سن رہا تھا۔

”جتنے ہوئے دروازے کی طرف دیکھے بغیر باہر نکلنے کی کسات لگا کہ وہ کسی پتھر کی چیز سے ٹکرائی ہے۔“

سہ ماہی حجبی اس کے منہ سے نکلی۔ سب ہی اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔



شاید یہی سب کرو گے۔“ مشعال شدید بدگمان تھی۔  
 وہ چپ رہا۔ وہ سوچتی یہ جاوے جا سکتی ہے وہ نکرانی  
 اگلے دن اسے علم ہوا کہ جس شخص سے وہ نکرانی  
 تھی، وہ کوئی اور نہیں بلکہ زیم حیدر تھا۔  
 اسے زیم نے اپنے آفس میں طلب کیا۔ لیکن  
 بالکل نہ ڈانٹا نہ ہی اسے گزشتہ شام کی کوئی بات یاد  
 دلائی۔ بس اس کی آنکھوں میں دیکھا رہا۔  
 مشعال کی روشن آنکھوں کی چمک ماند سی پڑ  
 گئی۔ وہاں ہر اس جھل گیا۔

پھر اکثر ہی وہ اسے یہاں یہاں سے آفس  
 بلاتا۔ وہ روشن کی جانب عجیب سی نظروں سے  
 دیکھتی۔ وہ تو یوں مین گرا تھا جیسے اندھا ہو۔ جیسے وہاں  
 مشعال کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوئے وہ جانتا بھی نہ ہو۔  
 مشعال اس کے رویے سے الجھنے لگی تھی۔  
 اب وہ بھلا اس کا دماغ بڑھ سکتی تو اسے علم ہوتا  
 کہ اس میں اتنا بھوسا بھرا ہے کہ بڑے آرام سے  
 اس میں آگ لگائی جاسکتی ہے۔ اس کا دماغ خود ہی  
 کہتا تھا کہ مگر یہ ہے اور خود ہی انجام بھی بنتا ہے۔  
 اس کے گمان کے مطابق مشعال کو بھی اپنے  
 لیے کوئی ایسا ہی حسین، وجہہ اور شان دار مرد ہی  
 درکار ہوگا۔ اب جب کہ وہ مرد پردے سے باہر آچکا  
 تھا اور بے دھڑک اپنی آنکھوں سے سارے جذبات  
 کہنے بھی لگا تھا تو اسے اپنی محبت کو چھپا کر مزید ذلت  
 سے بچتا ہی بہتر راستہ لگا۔  
 جبکہ مشعال۔ وہ کیا سوچتی تھی۔

ہیہ ہیہ

زیم بالکل ویسا ہی تو تھا جس کے سبب وہ کبھی  
 خوابوں میں اذان بھرا کرتی تھی۔ لیکن نجانے کیوں  
 اسے دیکھ کر بھی اس کے دل کی گلی نہ کھل سکی۔  
 وہ جب غصے میں اس سے لڑ جھڑکرائے  
 کمرے میں آئی اور بستر پر لیٹی تب چمن سے زیم گئی  
 تصور اس کی آنکھوں میں آئی۔  
 وہ ان آنکھوں میں ابھرتی حیرت، پھر شدید  
 پسندیدگی کو لے کر بھر میں محسوس کر چکی تھی۔ اسے

نکرانے پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا اس کے کہنے  
 آیا۔ وہ اس کی آنکھوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے ابھی  
 چھین کر ساتھ ہی لے جائے گا۔  
 اگلے روز اسے علم ہوا کہ وہ اس کا پاس ہے  
 چلو جی۔ ایک خوبصورت ٹل کلاس لڑکی لہو لہو  
 وجہہ امیر کبیر لڑکا۔ زبردست قسم کا بکرا اور پسندیدگی  
 کا سفر شروع۔ سب کچھ کتنا مکمل تھا نا۔ لیکن پھر بھی  
 کچھ سنگ تھا۔  
 وہ آئے دن سوچتی۔  
 ”زیم کتنا خوب صورت ہے۔“

”یہ روشن کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ زیادتی  
 خاموش رہنے لگا ہے۔ میں نے شاید زیادتی  
 بدتمیزی کر دی۔ صبح ہوتے ہی اس سے سوری کر لیں  
 گی۔“ وہ پرسکون ہوئی۔ سوری بھی کہہ دیا لیکن  
 دیسے کا دیسا رہا۔ جسے چلتے دیسے کو کوئی پھونک مار کر  
 دے۔ لیکن دھواں تو نکس نکس تھا۔ ہاں شاید اس دے  
 تیل ختم ہو گیا ہو گا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔ بھی زیم کی  
 نگاہ بھی اس پر پڑی۔ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ  
 لگا۔ مشعال کی مسکراہٹ سٹ گئی۔  
 ”دیکھتا تو روشن بھی ہے لیکن۔ لیکن کچھ  
 میری مسکراہٹ اسے دیکھ کر کشتی کیوں نکس؟ بلکہ اس  
 وقت تو ہونٹ مزید جھل جھل جاتے تھے۔ تھی مشکل  
 سے خود کو کنٹرول کرتی تھی۔“ وہ پھر سے  
 جانی۔ مسکرا دیتی۔ وہ سمجھتا کہ زیم کا دیکھنا اس کے  
 لیے سکون آور دوامین رہا ہے۔ وہ نکس جانتا تھا کہ اس  
 کی دوا تو روشن تھا۔ چمکتے ستارے جیسا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایمنہ اسے رخصت  
 کہیں کہ وہ ہاں کرے اور وہ اس کا رشتہ لے کر  
 جائیں لیکن وہ ہر بار ٹل دیتا۔ اس کے کانوں میں  
 یہ اب یہ آواز گونجنے لگی تھی کہ عتریب زیم مٹے گا  
 پرویز کر دے گا۔ یہ خبر سن کر اسے اپنے وجود سے  
 جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔  
 جبکہ دوسری طرف مشعال کے لیے آفس میں  
 رہنا مشکل ہونے لگا۔ اسے روزہ کرنا پڑا تھا۔



تھا وہ عجیب سا ہو چکا تھا، کم صبر رہتا۔ مشعال اسے دکھاتی تو خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا۔ وہ سمجھنے کے بجائے جھنجھلا جاتی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ زعمیم کے بڑھتے التفات سے پریشان روشن کے کسی رد عمل کے انتظار میں تھی لیکن وہ دیکھ کر بھی ان دیکھا کر رہا تھا۔ کیوں؟ کیا اس کی غیرت سوچکی ہے یا پھر وہ بے حس ہو چکا ہے؟ مشعال کی سوچیں الجھتی چلی جا رہی تھیں۔

ایک روز زعمیم نے اسے اپنے آفس میں بلایا اور بے حد خوب صورت لفظوں میں اس سے اظہار محبت کرنے لگا۔ مشعال کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ وہ بے قراری سے ہاتھ میں پہنی سونے کی انگوٹھی کو گھماتے، جواب سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھول کر ایک بے حد حسین لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی زعمیم ایک دم ہی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مشعال بھی کھڑی ہو گئی۔

اب وہ دونوں گال سے گال رگڑ کر مل رہے تھے۔ مشعال کی نظریں جھک گئیں۔ اس لڑکی نے ایک اور بے باق حرکت کی۔ شاید ہی وہ اندر کہیں اس کے حسن سے خائف ہو گئی تھی۔ اسی لیے جتائے بغیر بے رحمی سے مشعال کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ ڈال رہی تھی، زعمیم جل سا ہو گیا۔

وہ ان سے اجازت لے کر باہر آئی تو سامنے ہی روشن موجود تھا۔ آنکھوں میں غصہ اور تھوڑا تھوڑا سا تسخیر لے۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ وہ حیران سی اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”مجھے تو نہیں البتہ تمہیں ضرور گہرا صدمہ ہوا ہوگا، ان کی کرل فریڈ کو دیکھ کر۔“ وہ بولا تو لہجہ میں جلن تھی۔

”مجھے کیوں ہوگا صدمہ؟ میں انہیں پسند نہیں کرتی۔“ اس نے سادگی سے کہا۔ زعمیم کے اظہار کو وہ سمجھا نہ تھی۔

”انکو رکھتے ہیں۔“ اس نے پھر چوٹ کی۔

”بکو اس مت کرو۔“ وہ یک دم پھر کر بولی۔ اس قدر شدید رد عمل دیکھ کر وہ ذرا پشیمان ہوا۔

”میں نے بہت بڑی غلطی کر دی۔ مجھے ان سے یہ انگوٹھی نہیں لینی چاہیے تھی۔“ مشعال رو ہانسی ہو کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ روشن نے حیران ہو کر اس کی انگلی کی طرف دیکھا جہاں اس کی امی کی دی گئی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ مشعال کو گزشتہ رات کی بات یاد آئی۔ جب امینہ بیگم اس کے پاس آئی تھیں۔ اپنے بیٹے کے دل کا حال سناتے ہوئے وہ مشعال کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتی رہیں۔ جس پر پہلے تو حیرت پھیلی اور پھر وہ پرسکون ہو گئی۔ حقیقتاً وہ اس سے اجازت مانگنے آئی تھیں۔ پس پردہ اس بات کی تصدیق کہ وہ بھی ان کے بیٹے سے محبت کرتی ہے۔

اس نے بنا سوچے سمجھے انہیں ہاں کہہ دی۔ وہ اتنی خوش ہوئیں کہ اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر اسے پہنا دی۔ مشعال کا وجود ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔

”یہ سب کیا تھا مشعال؟“ وہ حیران تھا۔ اتنا حیران کہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”یہ میری بے وقوفی تھی۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔ وہ اس کی ”بے وقوفی“ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا تو تیزی سے باہر نکلی۔ روشن اس کے پیچھے بھاگا اور راہ میں ہی روک لیا۔

مشعال کی آنکھ سے گرنا آنسو اس نے سرعت سے صاف کیا اور ایک دم ہی اس کی انگلی سے انگوٹھی نکالی۔

”میں چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر تم یہ بے وقوفی

کرو اور مجھے اپنا محبوب اور ہونے والا شوہر قبول کرو۔“ روشن نے مسکراتے ہوئے اس کی نازک انگلی میں انگوٹھی پہنائی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دی۔

روشن کے چہرے کے سارے رنگ واپس لوٹ آئے تھے۔ وہ سر اٹھائے سامنے دیکھتے ہوئے

اس کا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ مسکرا دی۔

ان دونوں کو ایک ساتھ چمکنا تھا۔



# میرا دلیر سہارا

”حمزہ۔۔۔ اے او حمزہ!“

شاہانہ خاتون کی پاٹ دار آواز نچلے پورشن کے درود پوار سے مگرانی، گھومتی، پکرائی، اور پروالے پورشن میں موتیوں سے فریم پر لگا کپڑا سجائی نور کے کانوں سے مگرانی۔

اس نے ایک سہرا سوتی سوتی میں پرو کر کپڑے کے اندر اتار دیا، بالکل ویسے ہی جیسے شاہانہ ٹائی کی کڑوی کسلی باتیں اپنے دل کے اندر اتار لیتی تھی۔  
”کیا ہوا دادی؟“

وہ آواز سنائی دی جس کو سننے کے لیے کان سارا دن منظر رہتے۔ دل ان قدموں کی چاپ کے ساتھ دھڑکتا تھا۔

”اے یہ شیمو کی ایک بوتل کم ہے۔ میں نے غور کن کر چار بوتلیں رکھی ہیں۔ نیلی والی ایک بوتل کم ہے۔“  
”لو جی، آگنی تانا کی شامت۔“ نور نے دل میں سوچتے ایک اور سوتی سوتی میں پرو دیا۔

”دیکھیں دادی! جب جب آپ میری ڈیوٹی لگاتی ہیں، چیزوں پر ہمدہ دینے کی، میں پوری دیانت داری، فرض شناسی اور..... اور.....“  
زور ڈالا گیا۔ ”ہاں، اور تن دہی سے اپنے فرائض کی انجام دہی کی کوشش کرتا ہوں۔“

نور کے چہرے پر مسکراہٹ رہی۔  
”تو یہ بوتل کم سے کم میری موجودگی میں غائب نہیں ہوتی۔“





”ہاں جب، جب میں گھر پر نہیں ہوتا، تب جب کی ذمہ داری میری نہیں ہے۔“

”ارے بھیا! یہ بڑھا تو کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ادھر میں نہیں آگے پیچھے ہوئی نہیں اور اس نے چور بازاری، لوٹ مار کا بازار گرم کیا نہیں۔ اب کیا نہانا، دھونا بھی چھوڑ دے انسان.....؟ ارے باہر کے چور، اچکے ہوں تو انسان رپٹ (رپورٹ) درج کر دے تھانے میں۔ اب گھر کے اندر ہی ڈکیت موجود ہوں تو شریف انسان کیا کرے؟“

حزہ نے ان کی بات پر کندھے اُچکائے

مطلب مجھے کیا پتا کیا کرے۔

”ساری زندگی گزر گئی میری چوروں، ڈاکوؤں، غاصبوں سے نمٹتے۔ مگر زندگی میں سکون نصیب نہ ہوا۔ یہ بڑھا اور اس کے ہوتے سوتے (اب کے اور والوں کو بھی درمیان میں رگڑا گیا)۔ سب کچھ کھا گئے۔ ارے بھیا، نصیب والے ہوتے ہیں جو جوانی میں عیش کرتے ہیں۔ ہماری تو جوانی بھی جہاد کرتے گزری، بڑھا پابھی۔“

ابھی الفاظ ان کے منہ میں ہی تھے کہ حزہ کے لبوں سے ایسی کا نوارہ چھوٹا۔

”دادی جہاد؟ اد میرے اللہ..... جہاد.....“

وہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہونے لگا۔

نور کا سوز خواہ مخواہ ہی اچھا ہو گیا۔ موتی، کپڑا فریم، جیسے ہر چیز سے روشنی ہی پھونٹنے لگی۔

”دادی..... اس کا یہ مطلب ہوا آپ جب فوت ہوں گی تو آپ کو شہید کا رتبہ ملے گا؟ اودہ میرے خدا! واقعی جہاد.....“ حزہ کی آنکھیں تھمنے میں نہیں آ رہی تھیں۔

”بس کر جا، اس پر بہت برداشت کر رہی ہوں تجھے میں۔“ وہ کشمکش لگا ہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

”سوری دادی..... سوری۔“ بڑی مشکلوں سے اس نے اپنی آنکھیں کنٹرول کی۔

”اچھا، بات سن۔“ محینہ کا فون آیا تھا وہ بھی آ رہی ہے پاکستان۔“

نور کے مونی ہاتھ لگے ہاتھ لگے بھر کور کے۔

”میکھی.....“ زیر لب دہرایا۔ پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔

”کہہ رہی تھی حزہ کی پڑھائی بھی اب مکمل ہونے ہی والی ہے۔ بس کوئی دن، تاریخ طے کر کے اس قصے کو بھی منشا دیں۔“

نور کی سوئی کپڑے کی جگہ انگلی میں اتر گئی۔

سی کی آواز کے ساتھ اس نے انگلی پر ابھرنی تھنی سی سرخ بووند کو دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے دبایا۔

”بھئی، آخر جلدی کس بات کی ہے پھوپھو کو؟ میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔“ حزہ کی جھنجھلاہٹ بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”ہوتی ہے جلدی لڑکی کی ماں کو۔ تجھے کیا خبر۔ تو بس ذہنی طور پر خود کو تیار رکھ۔ میکھی کے آنے کے کوئی دس پندرہ دن بعد محینہ خود بھی آ جائے گی۔ جو کام دقت سے ہو جائے وہی اچھا۔“ وہ دونوں گھٹنوں پر دباؤ ڈالتی اٹھیں۔

نیچے سے آوازیں آتا بند ہو گئی تھیں۔ یہ نور کے اندر کا شور تھا جو بڑھ رہا تھا۔

اس نے زور سے اپنی زخمی انگلی دبائی۔ تکلیف کس چیز کی زیادہ تھی، یہ وہ خود بھی سمجھ نہیں پاتی تھی۔

سہ پہر، کوئی چار، ساڑھے چار کے قریب قریب کا وقت ہوگا۔ سڑکوں پر رش بھی ذرا کم کی تھا، لوگوں کا بھی، گاڑیوں کا بھی۔

یہ وقت ہوتا تھا حاکم حسین کی مصروفیت کا۔

”آؤ، آؤ بزرگوا آؤ بیٹھو۔“

حاکم حسین جیسے ہی رشید میر ڈائریکٹر کے حرم میں داخل ہوئے۔ کرسی پر آؤاڑا پھاؤ کر ان کے رشید اہلادی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سلامی دینے والے انداز میں ان کا غیر مقدم کیا۔



ہاتھ میں تھمالی۔ "اولیٰ جی شہو ہے۔ ذرا احتیاط سے  
استعمال کرو۔" ماسا جی ہے۔

"بڑی صوبائی جہاز" شہو سے کی ہا میں  
کھل گئیں شہو کی بوتل دیکھ کر۔ واحد گاہک تھا جو  
چند سو کے کام کی لکیر بڑھیا اجرت دے کر جاتا تھا۔  
شہو سے کی دکان سے نکل کر انہوں نے گاسے  
کے ہوٹل کا رخ کیا۔ سہ ماہ آہستہ آہستہ شام کی  
طرف بڑھ رہی تھی۔

گاسے کے ہوٹل پر اکاؤنٹ کا گاہک بیٹھے تھے۔ گاہر  
چائے کے بلا سے چائے میں ڈنو گھراتا چائے  
پینٹ رہا تھا۔ ایک طرف چھوڑ بیٹا لوگھ رہا تھا۔  
حاکم حسین کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر چھوڑ ایک  
دم اثر ہوا۔ جلدی سے کدھر سے پر پڑا کپڑا اچھاڑتا  
اس سمت بڑھا جہاں حاکم حسین بیٹھنے کے لیے پر توں  
رہے تھے۔

فرق کپڑا لہ کر کرسی صاف کی۔  
حاکم حسین بے نیازی سے بیٹھ گئے۔ گاسے  
سے نظری تو اس نے ایک خیر مقدمی مسکراہٹ ان کی  
جانب اچھالی۔ جو انہوں نے سر ہلا کر وصول کی۔  
"لے بھی چھوٹے لہاؤ جی کو کڑک چائے کی  
پیا پیٹ کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

ہاتھ میں تھمالی۔ "اولیٰ جی شہو ہے۔ ذرا احتیاط سے  
استعمال کرو۔" ماسا جی ہے۔  
"بڑی صوبائی جہاز" شہو سے کی ہا میں  
کھل گئیں شہو کی بوتل دیکھ کر۔ واحد گاہک تھا جو  
چند سو کے کام کی لکیر بڑھیا اجرت دے کر جاتا تھا۔  
شہو سے کی دکان سے نکل کر انہوں نے گاسے  
کے ہوٹل کا رخ کیا۔ سہ ماہ آہستہ آہستہ شام کی  
طرف بڑھ رہی تھی۔

فرق کپڑا لہ کر کرسی صاف کی۔  
حاکم حسین بے نیازی سے بیٹھ گئے۔ گاسے  
سے نظری تو اس نے ایک خیر مقدمی مسکراہٹ ان کی  
جانب اچھالی۔ جو انہوں نے سر ہلا کر وصول کی۔  
"لے بھی چھوٹے لہاؤ جی کو کڑک چائے کی  
پیا پیٹ کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"

چھوٹے نے فوراً سے سلمے احم کی قہیل کی۔  
"بھئی۔ کوئی ڈھنگ کا چھٹل لگاؤ۔" انہوں نے  
چائے کا سڑ پالگاتے نگاہی دی اسکرین پر جہانی۔  
"اوائے چھوٹے، باؤ جی کی پسند کا ٹیشن لگا،  
جلدی کر۔"



”یہ لو بھئی، یہ رکھ لو۔ کبھی کبھی کاکوں کو ادا  
چائے بھی پادیا کرتا۔“

گاسے نے پتی کا ادا پکڑا، سپدھا ہاتھ ماتھے  
تک لے جا کر سیوٹ والے انداز میں شکر یہ ادا کیا۔  
باہر نکلنے لگے تو چھوٹا کچھ مٹکری لگاؤں سے  
دیکھ محسوس ہوا۔

انہوں نے ایک بار پھر قبیلے کے اندر ہاتھ  
دے دیا۔ اب کے ایک چھوٹا میوے کا پیکٹ برآمد کیا  
اور اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ لو بھئی، کچھ جان شان ہٹاؤ، کمزور دکھ رہے ہو۔“  
چھوٹے نے دانت نکالتے ہوئے ایکٹ  
وصول کیا۔

باہر نکل کر حاکم حسین نے اپنا سواری تھیلا  
بھاڑ کر کیا اور تھیس کی دائیں ہاتھ کی بیب میں  
ڈال لیا۔

ابھی تو موچی کے پاس جانا باقی تھا، پر تھیلا  
خالی ہو چکا تھا سو ارادہ ملتوی کر کے گھر کی راہ لی۔  
”نہنی واقعی نقصان میں جا رہی تھی، ہا۔۔۔۔۔“  
ایک ٹھنڈی سانس ان کے حلق سے خارج ہوئی۔

”نچہ اشی شی۔۔۔۔۔ چہ۔۔۔۔۔ اودا او۔۔۔۔۔“

کئی دیر سے وہ منہ سے مختلف قسم کی آوازیں  
نکال رہا تھا مگر جواب نہ دارو۔ دو تین کنکر بھی مارے  
جو گرل سے نکل کر تک تک کی آواز پیدا کرتے اور ک  
کیلری میں کہیں کم ہو گئے۔

یہ ان کے بڑے سے وسیع دھریض گھر کا پھیلا  
حصہ تھا۔ چوڑا سا کیلری نما حصہ جو کسی عام سے  
چھوٹے گھر کے بڑے سے صحن جیسا تھا۔ یہ حصہ  
گھلوں کی موجودگی سے باغ کہا جاتا تھا ورنہ اس میں  
باغ والی اور کوئی خاصیت موجود نہ تھی۔

اس کے اوپر، اوپر والوں کی آگنی تھی۔ جو قدرے  
گہرائی میں کس باغ کا آدھا حصہ کھلا ہوا تھا۔  
یہ جگہ مزہ اور نچہ کی غنیہ میں ایک ایم یا تھی، اوپر

کے تمام غنیہ معاملات کی خبریں پھیلنے لگی تھیں۔  
پانچا پیا کرتا تھا۔ پٹیلن دینہ کر وہ ہر قسم کا لالچ لالٹ  
کرتے تھے۔

اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لانے کے بعد  
مزہ اب مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔

گھراں تک پہنچنے کا راستہ بگن سے ہو کر گزرتا  
تھا۔ وہ بگن اور باغ کے درمیانی دروازے تک پہنچ  
نہی تھا کہ تک کی آواز سنائی دی۔

اس نے پاٹ کر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا حجر  
سے نکل کر پیچ کر اٹھا۔ ساتھ ہی آواز سنائی دی۔  
”مزہ بھائی!“ پندرہ سالہ نچہ کیلری سے آواز  
دھڑ باہر کو نکالنے باغ میں بھاٹک رہا تھا۔  
مزہ واپس آ گیا۔

”مزہ بھائی کے بچے، کب سے تجھے آواز  
لگا رہا ہوں۔ کنکر بھی پھینکے، کدھر تھا؟“ سخت ناراض  
لہجہ میں استفسار کیا۔

”بس مزہ بھائی اکھانا ایسا مزے دار تھا  
کھا کر ایسے کدھے کھوڑے پیچ کر سویا کہ کچھ ہوش  
رہا۔“ آواز میں ابھی بھی خند کا غلبہ تھا۔

”تو کھوڑے کدھے بلکہ میرا تو خیال ہے  
اصل بل پیچ کر سویا تھا۔“ نچہ کھی کھی کرنے لگا۔  
”دو پہر میں کیا کھایا آپ نے؟“ کچھ خیال  
آیا تو پوچھا۔

”دو کھجوریں اور دادی کے کایچہ چھائی کر دیے  
والے ملنے۔“

نچہ نے دوبارہ ہنسا شروع کر دیا۔ ”مطلب  
ہیٹ تو خوب اچھی طرح بھر گیا ہوگا۔“  
”اے ہیٹ میں کب سے چوہوں نے گھر  
چھایا ہوا ہے۔ کچھ کھانے کو ہے تو دے۔“

”بڑا کچھ ہے۔ آپ میٹر میں ہا آئیں، میں  
لے کر آتا ہوں۔“  
اوپر نیچے کے دونوں پر رشتہ کا جھرونی میں  
مشترک تھا جہاں سے اندر داخل ہوتے ہی رشتہ



”تو پھر کیسی بات ہے۔ ہاں۔“ حمزہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”اگر جو میں اتنا بھوکا نہ ہوتا ناں جتنا کہ اس وقت ہوں تو یہ کھانا تیرے منہ پر واپس مارتا۔“

انتہائی جلال کے عالم میں حمزہ نے ٹرانزل کھانا شروع کیا۔ ”اور تو میرے جعفر کے جانشین! اب بتا رہا ہے مجھے بات پکی ہونے کے بعد۔“

”نہیں نہیں حمزہ بھائی! پلیز ناراض نہ ہوں۔“

مجھے تو خود آج پتا چلا ہے جب بیلا آئی نے آیا کے ہاتھ پر پانچ ہزار کا نوٹ رکھ کر انہیں اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا، تب۔“

”تب.....“ حمزہ نے منہ بکاؤ کر اس کی نقل اتاری۔ ”اگر وہ تیرے ہاتھ پر پانچ ہزار رکھ کر، تجھے پیار کرتیں تو مطلب تیرا رشتہ پکا ہو جاتا؟“ سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑتے اور چمچہ منہ میں ڈالتے سوال کیا۔

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

”اوہ..... حمزہ بھائی! آپ بھی نا۔ بھئی انہوں

**خواتین ڈائجسٹ**  
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

**حلمین**

جلد اول

قیمت - 300 روپے

نادرہ خاتون

مکتبہ اقبال

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 • 111/112، کراچی۔ فون نمبر: 33730031

حمزہ آخری سیڑھی پر بیٹھ کر بریانی کے ساتھ

انصاف کرنے لگا۔

ٹیو نے کانچ کا ایک باؤل اس کے سامنے کیا

جس میں جلی اور کیک سے سجائے ٹرانزل موجود تھا۔

”ہاں، اب بتا۔ یہ اتنا اہتمام کس سلسلے میں؟“

اس نے چاول اور بوٹی سے بھر ایک چمچہ منہ میں منتقل

کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ آپا کے سرال والے آئے ہوئے ہیں۔

بات پکی ہوگئی ہے ان کی، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے

یہ“ اطلاع فراہم کی۔

بوٹی اور چاول حمزہ کے حلق میں پھنس گئے۔

آنکھیں اٹل کر باہر کو نکلتی آئیں۔

”اوسے گو لے، تو مجھے اپنی آپا کا رشتہ پکا

ہونے کی ٹریٹ دے رہا ہے۔“ ہاں مشکل چاول حلق

سے پھنسا ہوا ہے۔

”نہیں نہیں حمزہ بھائی! ایسی بات نہیں ہے۔“



نے آپ کو یہ سارا کرنے کے بعد، اوروں سے کہا تھا۔ ”مہاراجہ  
 بھائی! آج سے آپ کی نور میری ہوئی اور چوہدری  
 محمد ابرار آپ کا ہوا۔“  
 ”چوہدری محمد ابرار۔“ دانت میں کرنام لیا۔  
 یوں لگ رہا تھا جیسے بونی کے ساتھ چوہدری کی گردن  
 پیار ہا ہو۔  
 ”کھانا کھا کر برتن سائیڈ پر رکھے اور ٹیپو کی  
 طرف متوجہ ہوا۔  
 ”اچھا تو مجھے یہ بتا دیجئے میں کیا لگتا ہے یہ  
 چوہدری محمد ابرار۔“ حلق تک کڑوا ہو گیا، رقیب  
 روسیہ کا نام لیتے ہوئے۔  
 ”ویسے ہی لگتے ہیں جیسے ہیں۔“  
 ”چہ۔۔۔۔۔“ حنزہ کے منہ کا ذائقہ خراب ہوا۔  
 ”بھئی، وہی تو پوچھ رہا ہوں کیسے ہیں؟“  
 ”خوب مونے تازے۔“ ٹیپو نے دونوں  
 ہاتھ پھیلا کر ختم ظاہر کیا۔  
 ”ہوں۔۔۔۔۔ مطلب گینڈے جیسا دکھتا ہوگا۔“  
 ”نہیں، بھینسے جیسے دکتے ہیں۔ اصل میں  
 کالے بھی ہیں نا۔“  
 ”دیری گڈ۔“ حنزہ کی تھوڑی بہت تسلی ہوئی۔  
 ”تعلیم؟“  
 ”واجبی۔“ ٹیپو نے فوراً جواب دیا۔  
 ”ادو۔۔۔۔۔ دیری دیری گڈ۔“ حنزہ کے سینے  
 سے سکون کی سانس خارج ہوئی۔  
 ”دکرتا کیا ہے؟“  
 ”خوب کھاتے ہیں اور ڈکار مارتے ہیں۔“  
 ”اچھا۔ یہ خوبی تو میرے اندر بھی موجود ہے۔“  
 ”لیکن آپ نے رشتہ نہیں بھجوا یا۔“ ٹیپو نے یاد دلایا۔  
 ”رشتہ کیسے بھجواؤں۔ ایک تو ڈگری مکمل نہیں  
 ہے پھر وہ میکانیکی تلواریں لگ رہی ہے سر پر۔“ حنزہ  
 نے انسو سے سر پر ہاتھ پھیرا۔  
 ”اور میری مائی اور اپنی دادی کو بھول گئے؟“  
 ”ٹیپو نے ایک اور اہم نکتہ یاد دلایا۔  
 ”انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ اچھا پھوڑ ساری

ہائیں۔ یہ بتا کام دھندلا کر دیتا ہے یہ چوہدری۔“  
 ”کام دام، کچھ نہیں کرتے۔ زمین اور پھر  
 گاؤں جا کر سدھر منہ کرو، ان ہی کی زمینیں پھر  
 بھینسوں کا ہاڑہ بھی اڑنا ہے۔“  
 ”اچھا۔۔۔۔۔ تو بھینسوں کا ہاڑہ اپنا ہے، جس  
 بھینسے کا۔ ٹھیک ہے پھر تیار ہوں میں۔“ دونوں نے  
 خنسنے کے لیے۔ تو بھی ذرا اہناد مارا چالو کر لے۔  
 ”دونوں۔۔۔۔۔ مطلب میری مائی اور اپنی دادی؟“  
 ”نہیں۔“  
 ”چوہدری محمد ابرار اور محترمہ آنرہ مک چو  
 عرف میکی۔“

ہو ہو ہو  
 آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ اپنے کمرے  
 سے باہر نکلے۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا، سارے  
 کمروں کے دروازے بند تھے۔  
 پھر بھی احتیاطاً انہوں نے محکم پھر کر ہر طرف  
 جائزہ لیا۔ ہاتھ روم خالی تھا۔ برآمدے میں بھی کوئی  
 نہیں تھا، مطلب میدان صاف ہے۔ ذرا آگے  
 بڑھ کر مٹن کا جائزہ لیا، آدھے مٹن میں دھوپ چمک  
 ہوئی تھی۔ آدھے میں سایہ آچکا تھا۔  
 کٹری میں وقت دیکھا۔ آدھا گھنٹہ ہے نہ  
 سے زیادہ۔ آگے بڑھے، رخ باورچی خانے  
 جانب تھا۔  
 باورچی خانے میں پہنچ کر چوکی اٹھا کر سامنے  
 رکھی اور اس پر چڑھ کر اوپر والی الماری کا پتہ داک کیا۔  
 نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہاتھ مار مار کر ٹٹولا  
 شروع کیا۔ دائے ناکامی کچھ ہاتھ نہ آ سکا۔  
 ایک کے بعد ایک الماری کی تلاش اور ایک  
 کے بعد ایک ناکامی۔ ہانپ کا پ گئے، پیٹ پانی  
 کی مانند بہنے لگا۔  
 ”سب الماریاں خالی پڑی تھیں۔“  
 ”اب یہاں کون جھانڈ پھیر گیا؟“  
 بڑبڑاہٹ میں جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔ وقت ہاتھ سے  
 پھسلا جا رہا تھا۔ کٹری میں وقت دیکھا، صرف



”کیا ہو گیا ہے۔ کیوں شور مچا رہا ہے۔“  
 ”شور ہم نے کھڑا کیا، تم نے آکر کیا ہے۔“  
 شبانہ خاتون کو دیکھ کر حاکم حسین کا قصہ سے سر سے  
 سے غور کر آیا۔

”اب جب کہ داوی انھیں بھیجی تھی تو اس کی  
 فریادیں ختم تھیں۔ سب ختم کر کے ہاتھ مہاڑنا باہر کو  
 بڑھل جاتے جاتے پلٹ کر داوی کو مخاطب کیا۔  
 ”داوی! سارے سالوں کے چمک، دالیں،  
 چینی اور چاول اس بالٹی میں رکھے ہوئے ہیں۔“  
 ہاتھ سے ایک کونے میں پڑی بالٹی کی طرف اشارہ  
 کیا جس کے اوپر آٹا گوند مٹے والا سلاٹا دھرا تھا۔  
 ”اور سیسہ، صابن، سرف وغیرہ یہ رہے۔“  
 ہاتھ سے زمین کی طرف اشارہ کیا جہاں تمام چیزیں  
 رکھ کر کچن کی صفائی کا کپڑا بڑی صفائی سے ان پر ڈال  
 رکھا تھا۔ دادی نے صدقے ہوتی نظروں سے پوتے  
 کو دیکھا۔

”کام ہی تو کر رہا ہوں۔“ دانت دو بارہ سب  
 میں گز دیے۔ ”آپ بتائیں، آپ کی کچھ مدد  
 کروں؟“ متنی خیر انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے  
 سوال کیا۔  
 ”داوی نے کہا تھا، میرے اٹھنے تک کچن پر نظر  
 رکھا اس لیے وہاں بیٹھ کر کچن پر نظر رکھے ہوئے  
 تھا۔“ ہاتھ سے کچن کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جو  
 باغ میں مچھلی تھی۔  
 (الو کا پٹھا، اتنی دیر سے میری نگرانی کر رہا  
 تھا)۔ ایک تو وقت ضائع ہونے کا غصہ، پھر ہاتھ بھی  
 کھینک آیا۔ انہیں سخت غصے نے آگھیرا۔  
 ”کس چیز پر نظر رکھنے کا کہا تھا بڑھیا نے۔ سارے  
 ہاتھ پائی مانے میں تو پونچھا پھیر کر سونے لگی ہے۔“  
 پہلے ہی جلتے توے پر بیٹھے تھے سوا اخلاقی حدود  
 باہل کرتے ہوئے گرے۔

”عداوب دادا! دادی کے بارے میں کوئی غلط  
 بات نہیں سنوں گا میں اور رہی بات پونچھا پھیرنے  
 کی تو وہ داوی نے نہیں میں نے پھیرا ہے۔ میں نے  
 ساری چیزیں اکٹھی کر کے چھپا دی تھیں تاکہ چوری  
 ہکاری کا خطرہ نہ رہے۔“  
 ابھی دادا، پوتے کی گفتگو درمیان ہی میں تھی  
 کہ شبانہ خاتون اڑتی ہوئی کچن تک آئیں۔

”ہائے میرے اللہ! عورتوں کے نصیب میں  
 سکون آ جاتا ہے اس عمر میں، پر میرے مقدر میں سکھ  
 کہاں۔ یہ بڑے میاں جب تک زندہ ہیں نہ خود  
 سکون سے رہیں گے نہ کسی دوسرے کو سکون کا سانس  
 لینے دیں گے۔“  
 وہ بولتی رہیں، بولتی رہیں۔ بات نصیبوں،  
 لعنتوں، ملامتوں اور حاکم حسین سے ہوتی ہوئی اب

”ہاں، میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، تم تو  
 آب حیات کی کرا آتی ہو۔ ساری دنیا کو قبر میں اتار کر  
 راج کرنا ان کی قبروں پر، سازشی بڑھیا!“ وہ بکتے جھکتے  
 باہر کو بڑھے پر شبانہ خاتون کو اشارت کر دائیں۔  
 ”ہائے میرے اللہ! عورتوں کے نصیب میں  
 سکون آ جاتا ہے اس عمر میں، پر میرے مقدر میں سکھ  
 کہاں۔ یہ بڑے میاں جب تک زندہ ہیں نہ خود  
 سکون سے رہیں گے نہ کسی دوسرے کو سکون کا سانس  
 لینے دیں گے۔“  
 وہ بولتی رہیں، بولتی رہیں۔ بات نصیبوں،  
 لعنتوں، ملامتوں اور حاکم حسین سے ہوتی ہوئی اب

”ہائے میرے اللہ! عورتوں کے نصیب میں  
 سکون آ جاتا ہے اس عمر میں، پر میرے مقدر میں سکھ  
 کہاں۔ یہ بڑے میاں جب تک زندہ ہیں نہ خود  
 سکون سے رہیں گے نہ کسی دوسرے کو سکون کا سانس  
 لینے دیں گے۔“  
 وہ بولتی رہیں، بولتی رہیں۔ بات نصیبوں،  
 لعنتوں، ملامتوں اور حاکم حسین سے ہوتی ہوئی اب

”ہائے میرے اللہ! عورتوں کے نصیب میں  
 سکون آ جاتا ہے اس عمر میں، پر میرے مقدر میں سکھ  
 کہاں۔ یہ بڑے میاں جب تک زندہ ہیں نہ خود  
 سکون سے رہیں گے نہ کسی دوسرے کو سکون کا سانس  
 لینے دیں گے۔“  
 وہ بولتی رہیں، بولتی رہیں۔ بات نصیبوں،  
 لعنتوں، ملامتوں اور حاکم حسین سے ہوتی ہوئی اب

”ہائے میرے اللہ! عورتوں کے نصیب میں  
 سکون آ جاتا ہے اس عمر میں، پر میرے مقدر میں سکھ  
 کہاں۔ یہ بڑے میاں جب تک زندہ ہیں نہ خود  
 سکون سے رہیں گے نہ کسی دوسرے کو سکون کا سانس  
 لینے دیں گے۔“  
 وہ بولتی رہیں، بولتی رہیں۔ بات نصیبوں،  
 لعنتوں، ملامتوں اور حاکم حسین سے ہوتی ہوئی اب



حاکم حسین کے ماں باپ تک آپہنچی تھی۔

”ارے اللہ ان سے پوچھے گا، یہ سارے زمانے کا کاروان انسان میرے ہی سے مار کر چلے گئے۔ ساری زندگی ہو گئی اس کو بھگتے۔“

جب تقریر ان کے ماں باپ تک پہنچی تب وہ میٹ کا کنڈا کر اکر بس باہر نکلنے کوئی تھے، بغل میں نسواری رنگ کا تھیاد بار کھاتا تھا۔ گیٹ کو کھولتے ان کے ہاتھ تھم سے گئے، اگلے قدموں واپس ہوئے (بات ماں باپ تک ان کی موجودگی میں ہی آپہنچی تھی، سو جواب دینا واجب ہو گیا تھا)۔

”اللہ تو تمہارے اماں، دادا سے پوچھے گا۔ جو یہ پانچ فٹ دس انچ کی بلا (انگلی سے شاہانہ خاتون کی طرف اشارہ کیا) میرے ساتھ باندھ گئے۔ ساری زندگی ہو گئی میرا خون چوستے، اس کے کلیجے میں اب تک شہنشاہ نہیں بڑی۔“

”ارے بس کر جاؤ میاں! سب جانتی ہوں۔ کس بات کی تکلف ہے تمہیں۔ ارے، وہ تو آج بھی تمہیں گھاس نہیں ڈالتی (انگلی اٹھا کر اوپر والے پورشن کی طرف اشارہ کیا)۔ تم ہی پتا نہیں کون کون سے ارمان سینے سے لگائے بیٹھے ہو۔“ دونوں جانب سے برابر کی گولہ باری جاری تھی۔ حمزہ کے فائنل سمسٹر کے پیپر ز چل رہے تھے، وہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ پارہا تھا۔

”یار! یہ دادا جاکوں نہیں رہے۔ آج کچھ ہاتھ نہیں لگا مگر پہلے سے تو کچھ نہ کچھ اپنی زمیں میں چھپا کر رکھنا ہی ہو گا نا۔“ اس نے سوچتے ہوئے کتاب زور سے بند کی اور اٹھ کر باہر جن میں چلا آیا۔

”بس۔۔۔۔۔“ جن میں آ کر وہ ادنیٰ آواز سے بولا۔ مرزا جان مرنج دادا اور پہلوان نما دادی، دونوں کی زبانوں کو ایک ساتھ بڑیک لگی۔

”دادی! مجھے لگ رہا ہے، آپ کا بی بی لی شوٹ کر رہا ہے۔ آپ رکیں۔ میں بی بی اپریس لے کر آتا ہوں۔“

”اور دادا! آپ نے بالکل کہیں نہیں جانا، میں

آپ کو گواہ بنا کر دیتا ہوں۔ ذرا دادی کافی لی تھی۔ کر لوں پہلے۔“

وہ بی بی اپریس لینے اندر آیا اور اس کے بازو آنے تک حسب توقع دادا زور پکڑ رہے تھے۔

حاکم حسین ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، بھی مشکل سے اور بچی بھی مشکل سے۔

ہر دو، تین سال بعد کوئی نہ کوئی بیماری شدید حملہ کرتی کہ جان کے لالے پڑ جاتے۔ خیر زندگی تھی، اس لیے جان بچتی رہی۔

رشیدہ، ان کی بیوہ خالہ کی تنہا جیوتی کے گھرانے کے ساتھ بچ کر جوان ہوئی۔ انیت جی لگاؤ تھا یا پھر۔۔۔۔۔

جو کچھ بھی تھا، وہ اپنی شریک حیات کے طبع پر رشیدہ ہی کو دیکھتے تھے مگر یہاں پر خالہ اڑ گئیں، کسی صورت بیٹی کا رشتہ دینے کو تیار نہ ہوئیں۔

نہ پڑھا لکھا، نہ کوئی ہنر سیکھا، سارا سارا دل آوارہ گردیاں اور باپ کی محنت سے بنائی جائیداد آوارہ دوستوں پر اڑانا۔ یہ تھیں وہ جملہ خصوصیات جن کی بنا پر حاکم حسین کو رشیدہ کا رشتہ نہ مل سکا۔

رشیدہ کو اس کی ماں نے بیاہ دیا، گاؤں کے کسی بڑے چوہدری کے بیٹے کے ساتھ۔ یہ قصہ بھی تمام ہوا۔ اس کے دو ماہ بعد ادھی، لمبی چوڑی، بے تحاشہ

خوب صورت شاہانہ خاتون حاکم حسین کی دہن میں ان کی زندگی میں آ گئیں۔

شاہانہ اور حاکم کا کوئی جوڑ نہ تھا، حاکم کے باپ کے پیسے نے شاہانہ کے باپ کی آنکھوں پر پانی باندھ دی۔ سو یہ شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔

اس شادی کے دو، تین ماہ بعد رشیدہ کی ماں خالق حقیقی سے جا ملیں۔

ایک ماہ اور تمام ہوا۔ رشیدہ کی بیٹی سیکھ دو سال کی تھی اور شاہانہ رجب (حمزہ کا باپ) تقریباً ڈیڑھ سال کا جب

رشیدہ بیوہ ہو کر واپس آ گئی۔ میکے کے نام پر



خالہ، خالو کا آسرا تھا۔

خالہ، خالو نے ولداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ شاہانہ کو بھی بظاہر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس واقعے کے کوئی چارہ ماہ بعد شاہانہ نے نگینہ کو جنم دیا۔ پر معاملات تب خراب ہوئے جب حاکم حسین نے رشیدہ سے عقد ثانی کی بات چھیڑ دی۔

شاہانہ نے تو وہ ہنگامہ کیا کہ الامان الحفیظ۔ اس قدر فساد برپا ہوا کہ حاکم حسین کل گھر ٹوٹنے پر آمگیا۔ گورشیہ نے شروع سے آخر تک بھی حاکم حسین کی رتی برابر بھی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ اس کے باوجود شاہانہ کی نظر میں وہ برابر کی مجرم ٹھہریں۔ شاہانہ ان کو بزدلاشت کرنے کو تیار نہ تھیں۔ دوسری طرف جائیداد کم ہوتی جا رہی تھی حاکم حسین کی آوارہ گردیاں زیادہ۔

سوا حاکم حسین کے باپ نے ایک بروقت اور فوری فیصلہ کیا۔ اوپر والا پورشن ہوا کر رشیدہ اور اس کی بیٹی سکینہ کو اوپر منتقل کر دیا۔ بیٹے کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے یہ بڑا سارا گھر بہو کے نام کر دیا اور بہو کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے اوپر کا پورشن رشیدہ اور سکینہ کے نام کر دیا۔

چار، پانچ سالوں کے اندر اندر ساس، سر دونوں گزر چکے۔ حاکم حسین نے دکانیں، پلاٹ سب اللے تللوں میں اڑا دیا۔

آخر میں گھر بھی بیچنے کو تیار بیٹھے تھے جب ہٹا چلا کہ گھر تو شاہانہ کے نام ہے۔

اور تب سے شروع ہوئے حاکم حسین کے نمے دن۔

ساس، سر کے انتقال کے بعد اوپر والوں اور نیچے والوں کا رابطہ بس اس قدر رہ گیا کہ ٹھیک سے، بیڑھیوں کی طرف جاتے آنا سامنا ہو گیا اور بس۔

رشیدہ نے سکینہ کو بیاہ دیا، دونوں ماں بیٹی دونوں کے دوپٹے ٹانگنے کا کام کرتی تھیں۔ سکینہ کو رشیدہ نے اپنے سرال میں اچھی جگہ بیاہا تھا۔ مجاہد اچھا شوہر تھا تو اس سے کئی زیادہ اچھا داماد ثابت ہوا۔

کہانی میں ٹوئسٹ جب آیا جب نگینہ کی شادی اور رجب کے باہر جانے کے لیے پیسے کی ضرورت پڑی۔ شاہانہ نے گھر بیچنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی تو یہ عقدہ کھلا کہ وہ نہ صرف رشیدہ کو اس گھر سے بے دخل نہیں کر سکتیں بلکہ گھر بیچنے کی صورت میں آدمی رقم کی حق دار بھی رشیدہ اور سکینہ ہوں گی۔

یہ جبران کے حواسوں پر بجلی بن کر گری بھی در نہ وہ تو انتظار میں تھیں کہ سکینہ شادی کے بعد ماں کو ساتھ لے جائے اور وہ گھر کی بلا شرکت غیرے مالک ہوں گی۔

۔۔۔ رشیدہ تک بھی خبر پہنچ گئی۔ وہ تو اس قدر سیانی نکلیں کہ بیٹی، داماد کو بلا کر اپنے ساتھ ہی رکھ لیا کہ کہیں قبضہ نہ ہاتھ سے نکل جائے۔

اس کے بعد تو شاہانہ خاتون نے زبان کے وہ، وہ جو ہر دکھائے کہ کسی طرح تنگ آ کر یہ خود ہی جان چھوڑ دیں مگر سلام ہے رشیدہ کی ثابت قدمی کو، وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

الٹا بیٹی کے سرالیوں کی فوجیں بلا بلا کر دنوں گھر میں رکھیں۔ شاہانہ خاتون کے سینے پر سانپ لوندے رہتے جن کا زہر وہ زبان کے راستے۔ باہر نکالتیں۔ بھی رشیدہ چپ کر جاتیں، بھی مقابلے پر آتیں تو اگلے پچھلے سارے حساب برابر کر دیتیں۔

ایک مرتبہ تو بات اتنی بڑھ گئی کہ ایک دوسرے کے گلے پکڑ لیے۔ بڑی مشکلوں سے محلے داروں نے بچ بچاؤ کرایا۔

رجب کی شادی کر کے شاہانہ خاتون نے اسے باہر بھجوا دیا۔ نگینہ بھی بیاہی گئی، رجب سال کے سال چکر لگاتا۔

ماں باپ کو عمرہ کروایا، بیوی بیچے (حزو) کا بھی بہت خیال رکھتا۔ بہن کی بھی جس حد تک ممکن ہوتا نہ دکرانے کی کوشش کرتا۔ (نگینہ کے میاں کی آٹا چکی تھی، حالات بس گزارے لائق ہی تھے)۔

بڑوں کی رنجشوں اور عداوتوں کے باوجود بچوں کے درمیان جانے کیسے اتنا پیار اور دوستی ہو گئی تھی۔



سکینہ کی نور، مگینہ کی مہک اور رجب کا حمزہ باغ  
میں گھنٹوں کھلتے۔ شاہانہ خاتون دیکھ لیتیں تو نور کو  
ڈانٹ ڈپٹ کر اوپر بھیج دیتیں لیکن ان کی دوستی ختم نہ  
کر دیا گئی۔

مہک آٹھ سال کی تھی جب مگینہ کا میاں باہر  
جانے کو رتول رہا تھا۔ وہ باہر چلا گیا۔ دو سال بعد  
بیوی اور بیٹی کو بھی بلوا لیا۔

اس کے دو سال بعد رجب نابوت میں بند ہو کر  
گھر آیا۔ کام کے دوران ہی دل بند ہو گیا۔ قصہ تمام۔  
بہو کو اس کے ماں باپ لے گئے، حمزہ کو ادھر ہی  
چھوڑ دیا۔ باپ قدرت نے چھین لیا، ماں دنیا نے۔

حمزہ کو دادی کی صورت ماں مل گئی۔ دادی کو حمزہ  
میں رجب دکھتا۔ گھر کا کمانے والا منوں مٹی تلے جا  
سویا۔ شاہانہ نے بڑی کوشش کی کہ اوپر والے کسی  
طرح گھر خالی کر دیں تو وہ کرائے پر چڑھا کر گزر بسر  
کی کوئی سہیل کریں۔

مگر رشیدہ خاتون نے جم کر مقابلہ کیا۔ اوپر کا  
حصہ ہاتھ سے نکلنے نہ دیا۔ مگینہ نے خرچ باندھ دیا۔  
ہر ماہ اچھی رقم بھجوانے لگی۔ اس کے میاں کا کام اچھا  
چل رہا تھا۔

ہر چار سال بعد وہ مہک جو باہر جا کر میکی  
ہو چکی تھی پاکستان کا چکر ضرور لگاتی۔ ایک غیر رسمی  
غیر اعلیٰ نسبت حمزہ اور میکی کی شروع سے ٹھہرائی  
جا چکی تھی۔

اب حمزہ اور میکی کے درمیان نور بھی تھی، اس کا  
تو کسی کو ظلم ہی نہ تھا اور نور تو اصل میں حمزہ اور میکی کے  
درمیان بھی ہی نہیں۔ یہ تو میکی بھی جو حمزہ اور نور کے  
درمیان تھی۔

اور اب.....

چوہدری محمد ابراہیم بھی۔

☆ ☆ ☆

حمزہ گھر میں داخل ہوا تو دادا کی زبان  
اٹکارے اٹھ رہی تھی اور دادی خوشی سے بے حال  
ہوئی جا رہی تھیں۔

مجنس سا آگے بڑھا تو سامنے ہی دادی کی  
خوشی کی وجہ نظر آ گئی۔  
ایک نئی گھوڑا ٹوٹیک واشنگ مشین لٹکارے  
مار رہی تھی۔

”السلام علیکم!“ اس نے باوازا بلند سلام کیا۔  
”وعلیکم السلام! جیتا رہ میرا بچہ۔“ دادی چپکے  
ہوئے بولیں۔

”اکیلا ہی آیا ہے؟“

”نہیں، پاک فوج کے دستے سلامی دیتے  
ہوئے ساتھ ساتھ آئے ہیں، باہر دروازے پر  
کھڑے ہیں۔“

”میں نے تجھے پلبر لانے کا کہا تھا۔“ شاہانہ  
خاتون اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔

”اوہ۔“ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”بھول گیا۔“  
”چل جا، میرا بچہ! بھاگ کر جا، کسی پلبر کو پکڑ لا۔“

”پلبر کوئی گلیوں میں کد کڑے لگا رہے ہوں  
گے کہ میں جاؤں اور گردن سے پکڑ کر لے آؤں۔“

”ٹھیک ہے، میں خود جاتی ہوں، تو اور تیرا یہ  
ناکارہ دادا دونوں چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھے رہو۔“ وہ  
کچھ پریشان ہوا۔

”تو اتنی ایمر جنسی میں پلبر کی کیا ضرورت  
پڑ گئی آپ کو۔“

”یہ مشین سیٹ کروانی ہے۔“ پیار سے مشین پر  
ہاتھ پھیرا۔

”یہ تو خاصی مہنگی لگ رہی ہے۔ اتنے پیسے  
کہاں سے آئے۔“

”ارے بڑھیا جو خزانہ ساری عمر سے جمع  
کر رہی ہے، اسی میں سے نکال کر لائی ہے۔“

جواب دادا کی طرف سے آیا۔

”بس مجھے چار پیسے دیتے تکلیف ہوتی ہے،  
باقی ہر جگہ اللے تلے کریں گی۔“ دادا تو جلتے توے،  
بیٹھے تھے جب سے مشین آئی تھی۔

”ہاں، تم تو چاہتے ہو، جو جمع ہوتا ہے تم،  
لگا دوں تاکہ سارے زمانے میں لو اب بنے پھرے



رہو۔ اے میاں! میری بیٹی ہے جو اتنے عرصے سے چھینچ رہی ہے ورنہ قانون مر رہے ہوتے۔“  
 ”میری بیٹی ہے وہ۔“ حاکم حسین ایک بار پھر سینہ جان کر میدان میں اترا اسی چاہتے تھے کہ حمزہ درمیان میں کود پڑا۔

”میری بیٹی نہیں ہے۔ میری پھوپھو ہیں۔“  
 لب آہ دونوں ذرا خیر سگلی کا مظاہرہ کریں۔“  
 ”نہرے چہ بے میں کئی خیر سگلی، ہٹو، میں خود دھوٹ کر لاتی ہوں پلیبر۔“

”پلیبر میں لے کر آتا ہوں، چائے بناؤ تم دو بندوں کی۔“ حاکم حسین بولے۔  
 ”دو پلیبروں کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایک۔“

”اتق محبت! دوسرا میں ہوں۔“ دو کہہ کر دھواؤ کر اس کر گئے۔

”والہی! اپنی مشین ٹھیک ٹھاک تو چل رہی تھی، یہ اتنا غر چا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“  
 ”تجے نہیں بتا، یہ مشین کیا جادو کرتی ہے، اس لیے تو اس بات میں کہہ رہا ہے۔“  
 ”یہ اس میں تم میلے پلے سے اٹاتے ہیں، ساتھ میں صرف نکالتے ہیں، خود پانی میں کپڑے دھوتی ہے پھر گھگھاتی ہے، پھر خشک کر دیتی ہے۔“  
 ”تا کیا ما؟“  
 انہوں نے ایسے حمزہ کی طرف دیکھا جیسے یہ مشین ان کی اپنی ایجاد ہو۔

”والہی! یہ کپڑے تو کر کے لٹاری میں نہیں رکھی۔“  
 ”میرے دل میں کچھ کر مشین کا جائزہ لے لیا تھا۔“  
 ”مشین ہے، تیری بیٹی نہیں ہے۔“ وہ مدد ہا کر بولیں۔

”اودہ! اچھا اچھا۔۔۔۔۔۔“  
 دوسری طرف حاکم حسین نے لا کے کو ابھی طرح سکھا چکا تھا۔  
 ”دیکھ! یہ سو مانگنا، جہاں پہ بیٹی بی قاض کر دی گئی۔“  
 ”کیا سوچتے ہو؟“  
 ”ایسا نہ کروں چاہا ہی اودہ جہاں تک لوں،“

پندرہ سو پڑن کر لیں۔ ساڑھے سات سو آپ کے، ساڑھے سات سو میرے۔“  
 ”نہیں بھئی، بڑی چالاک ہیں بڑی بی۔ ہٹا لگ جائے گا ان کو۔ بس جیسا میں نے سمجھایا ہے دیا ہی کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ لا کے نے سر ہلادیا۔  
 ”اچھا، ایک بات اور سن۔“ وہ متوجہ ہوا۔  
 ”کوئی معمولی سا نقص چھوڑ دینا، تیرا بھی روزگار لگا رہے گا اور میرا بھی۔“  
 ”ٹھیک ہے جناب۔“

جتنی دیر پلیبر مشین سیٹ کرتا رہا، حمزہ کمرے میں بند پڑحالی کرتا رہا۔ یوں ہی پانی پینے کے لیے باہر نکلا تو چونک گیا۔  
 ”کھوم پھر کر آ کے پیچھے سے اچھی طرح لا کے کا جائزہ لیا۔“

”کیا ہو گیا ہے۔ کیوں پاگوں کی طرح کی حرکتیں کر رہا ہے۔“ دادا سے زیادہ دیر برداشت نہ ہوا تو بول اٹھے۔

”لا کے کا بھی کام ختم ہوا، ہاتھ بھانٹنا اٹھ کھڑا ہوا۔“  
 ”شرٹ تو بڑی زبردست مٹنی ہوئی ہے۔“  
 حمزہ اسے کھڑے ہوئے ہوا۔

”یہ شرٹ۔۔۔۔۔۔“ اس نے اپنی شرٹ کو دیکھا۔  
 ”یہ تو اسے چاہا ہی نے۔۔۔۔۔۔“ بات ابھی اس کے منہ میں ہی تھی کہ عالم حسین نے تیز تیز بولنا شروع کر دیا۔

”ارے بھئی، کام ختم ہو گیا۔ آہا، ہٹو دے دو آ کر۔“

ساتھ ہی ساتھ پلیبر کو کچھ اشارے بھی کر کے لگے چلائے کی کچھ میں تو دادا نے الوداع کی کچھ میں اچھی طرح آگئے۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا، ہند میں آئی کیا حاکم حسین سے جواب ملے گی۔

”اودہ! یہ میری شرٹ اس پلیبر تک کچے کچی ہے۔“  
 ”چل ہٹ یہاں سے، آرام کر لے دے“



مجھے۔ بازار میں ہزاروں چیزیں ملتی ہیں ایک طرح کی۔ وہ نظریں جراتے ہوئے بولے۔

”آپ کو اچھی طرح معلوم ہے، یہ شرٹ پھوپھو نے بھیجی تھی میرے لیے۔ اس کا ادھر کا ایک بن نوٹ کیا تھا، میں نے جو دوسرا بن لگایا تھا، وہ بالکل مختلف تھا۔ وہی اس پلمبر کی شرٹ پر لگا ہوا تھا۔ یہ سونی صدمیری ہی شرٹ تھی۔“

”ہاں تھی، تیری ہی شرٹ۔ جا پولیس بلا لے جا کر۔“ انہوں نے لیٹ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

مطلب، اب دفع ہو جا۔

”ایسے نہیں جاؤں گا میں۔ میری بہت سی چیزیں گاہے بگاہے غائب ہوتی رہی ہیں۔ سب کا حساب چاہیے مجھے۔“ اس نے دادا کو دھمکانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے بیٹا، پوری رات ادھر ہی لیٹا رہ حساب۔“ تھوڑی ہی دیر میں کمرہ ان کے خزانوں سے کونچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

مزہ، دادی اور دادا، نیکی کو لینے ایئر پورٹ جا رہے تھے۔ نیکی میں سب بیٹہ چکے تو مزہ کو یاد آیا موبائل تو اندر ہی رہ گیا ہے۔

”ایک منٹ میں ذرا موبائل لے آؤں اندر سے۔“

وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، نور سے ٹکراتے ٹکراتے پچا۔

کالی بیڑی سی چادر میں خود کو چھپائے وہ غالباً صفائی کرنے بیچے آئی تھی۔ شاہان خاتون نے گیٹ سے لے کر بیڑیوں تک کی صفائی اوپر والوں کے ذمے لگائی ہوئی تھی، جو نور ہی کرتی تھی۔

آج کتنے دن بعد وہ نظر آئی تھی۔ سیاہ چادر کے پاس لے میں مقلم اس کا بیچ پھیرہ بیڑی بیڑی آگئیں، ایسی کتنی سیاہ ٹائیں، ٹھوڑی پر قدرے موم ساہل۔

”چوہدری ابرار، تجھے تو میں اپنی محبت پر قبضہ

کرنے نہیں دوں گا۔“ دل ہی دل میں اس نے فکرم آستینیں چڑھائے بھینسوں کے باڑے میں بیٹھا چوہدری ابرار کے مقابل محسوس کیا۔

”تم کیوں چھٹی پھر رہی ہو مجھ سے؟“ مزہ نے لگا ہوں میں اس کا چہرہ قید کرتے ہوئے سوال کیا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے چھپنے کی۔“ اس نے لگا ہوں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر فرما دی نظریں جھٹکا لیں۔

”منگنی مبارک ہو۔“ مزہ کا لہجہ کشیدہ ہوا۔

ایک لمحے کی بات تھی، وہ واپس اپنی جون میں پٹی۔ چہرہ سرخ ہوا، آنکھوں سے غصہ چھا گیا۔

”تمہیں بھی شادی مبارک ہو۔“

مزہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”اچھا، شادی ہوگئی میری۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ لہجہ میں ہلکا سا مسخرہ مود کر آیا۔

”میری بھی منگنی ہوگئی اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ اسی کے لہجہ میں جواب دوٹوایا۔

”وہ تمہارا بھینسا..... اوہ سوری، میرا مطلب ہے منگیتر۔ کب ملو آؤ گی اس سے؟“

”ملو آؤں گی جب آئے گا۔ فی الحال تم اپنی ہونے والی بیوی کو لینے جاؤ، لیٹ ہو رہے ہو۔“

باہر نیکی والا ہارن پر ہارن دے رہا تھا۔

”میری ہونے والی بیوی تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

نور نے حیرت سے اس کی خوش کمائی ملاحظہ کی۔

”تم کس دنیا میں جی رہے ہو مزہ؟ میری نسبت ملے ہو چکی ہے۔ تمہاری شادی تقریباً متوقع ہے، ایسے میں کس آس پر تم امید کے بجائے میرے ہاتھ میں تھما رہے ہو۔“ اس کا کارندہ چمکا۔

ہارن کی آواز کان پھاڑنے لگی تھی۔

”مزہ جو کہتا ہے، وہ کر کے دکھاتا ہے۔“

سینہ تان کر بولا۔ ”تمہارا وہ اور میری وہ۔“

چیمسی دلوں کی۔ بس ”تمہیں“ میرا ساتھ دیتا ہے۔ تمہیں پر سارا زور تھا۔



نور خاموشی سے واپس پلٹ گئی بغیر کوئی جواب دے۔

☆☆☆

”اے میکی! تو جب سے آئی ہے یہ دسترخوان کے ڈیزائن والا اسکارف کیوں باندھے پھر رہی ہے۔“  
شاہانہ خاتون کو میکی کا یہ پردہ خاصا کھٹک رہا تھا۔  
”کیا ہے نانی! اچھا نہیں لگ رہا کیا؟“ میکی چڑھ گئی تھی۔ ”آج تین دن ہو گئے ہیں، آپ نے، نانا نے، حمزہ نے پوچھ پوچھ کر عاجز کر دیا ہے۔“  
”ایک دہ بھی تو ہے۔“ ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اتنا بڑا خیمہ چڑھا کر پھرتی ہے، اس پر تو اعتراض نہیں ہوتا آپ کو۔“

”وہ جو خیمہ چڑھا کر پھرتی ہے نا، اس کے اندر بھی انسانوں والا جلیہ ہوتا ہے۔ تیری طرح نہیں کہ اوپر سے سر ڈھک کر پھر رہی ہے، نیچے یہ مردوں والی بنیان (اس کی ڈھیلی ڈھالی لی شرٹ پر چوٹ کی) اور پینٹ چڑھا کر پھر رہی ہے۔“

اس کا اسکارف گھر میں سب ہی کو کھٹک رہا تھا پر مجبوری یہ تھی کہ وہ یہ اسکارف اتار نہیں سکتی تھی۔  
”اچھا سن، تیری ماں کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی، شادی کی شاپنگ شروع کر دے۔ کپڑا، جوتا، جویلا ہے، لے لے۔“

میکی نے بے زاری سے سر جھٹکا۔  
”اور مگینہ بتا رہی تھی تو نے کوئی ڈگری وغیرہ لی ہے یا ہرے۔“

”جی نانی! میر کنگ کا کورس کیا ہے۔“

جب ہی حمزہ اندر داخل ہوا۔

”ہائے لیڈیز! کیا اور ہا ہے؟“

”تمہارا انتظار اور ہا تھا، کہاں غائب رہتے ہو سارا سارا دن۔ میں گھر میں بیٹھ بیٹھ کر بور ہو گئی ہوں۔“  
”ہیں.....“ حمزہ نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ ”تمہیں دن پورے نہیں ہوئے، چہیں آئے ہوئے اور تمہارا پورے کا پورے بھی شروع ہو گیا۔ اسے مے میں تو محسوس بھی نہیں اترتی۔“

کھٹکھٹو درمیان میں تھی کہ حاکم حسین بھی چلے آئے۔

”نانا، نانی! آپ لوگ ہی کہیں مگھونے کا پروگرام بنالیں۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ بنالیتے ہیں سیر ویر کا پروگرام بھی۔“ نانا بولے۔

”اچھا میکی! وہ، تو حمزہ کو تو بتا۔ کاہے کا کورس کیا ہے تو نے؟“

”مہیر کنگ کا۔“ میکی نے دہرایا۔

”مہیر کنگ مطلب ہال وال کاٹنے کا۔“ حاکم حسین نے سوال کیا۔

”جی..... نانا۔“

”اوہ، ہائے۔“ شاہانہ تاک پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوئیں۔ ”میکی! تجھے اور کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ملا تھا جو نانیوں والی ڈگری لے ڈالی۔“ وہ جتنا حیران ہو تھیں کم تھا۔

”اچھا میکی! بات سن۔ خالی بال کاٹتی ہے یا شیڈ وغیرہ بھی کرتی ہے۔“ حاکم حسین نے تو اپنے حساب سے پوچھا تھا پر حمزہ کے چمت پھاڑ قبہوں نے درود پوار ہلا دیے۔

☆☆☆

”ٹیپو، ادنیپو!“ باغ میں بیٹھا حمزہ چائے کا مختصر بیٹھا تھا۔ ابھی تک ٹیپو چائے لے کر نہیں آیا تھا۔

مجبوراً خود کچھواڑے آ کر آواز دینا پڑی۔ ٹیپو نے تو آواز نہیں سنی، کسی کام سے گیلری میں آئی نور کے کان کھڑے ہوئے۔

”کیا بات ہے؟ ٹیپو نہیں ہے گھر پر۔“ نور نے بتایا۔

”تو غالموا شام کی چائے تو بھجوا دو۔ کب سے انتظار کر رہا ہوں۔“

”اچھا، تو وہ جو ٹیپو کو شام کی چائے کا دورہ روز پڑتا ہے، اس کے جیسے یہ کہانی ہے۔“

”ہاں، تمہیں تو جیسے بتا ہی نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس فضول بات کی سزا کے طور پر آج بغیر



چائے کے گزارا کرو۔" وہ جا چکی تھی، اپنی خوشبو بچھے چھوڑ کے۔

ہو ہو ہو

شاہانہ خاتون ٹریک کھولے اللہ جانے کیا الم غلم، نکال نکال کر ڈمیر کیے جا رہی تھیں۔ حزرہ یاس بیٹا موبائل پر مصروف تھا، تب ہی میکی وہاں چلی آئی۔ "کیا چل رہا ہے یہاں؟" وہ انٹرائی لیتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"یہ حیرتی شادی کے لیے جوڑے تھے کچھ۔" بولتے بولتے اچانک ہی میکی پران کی نگاہ پڑی تو ایسی زوردار چیخ باری کہ حزرہ کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔

جلدی سے موبائل اٹھا کر دادی کا چہرہ دیکھا جو عجیب و غریب سا ہورہا تھا۔ ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو میکی کو دیکھ کر اس کی بھی چیخ بس نکلتے نکلتے رو گئی۔

نانی کی چیخ سن کر میکی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا پر تیر کمان سے نکل چکا تھا، اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سو پاؤں پسا کر آرام سے بیٹھ گئی، ویسے بھی وہ تنگ آگئی تھی اس اسکارف والے ڈرامے سے۔

"میکی! تیرے بال کہاں گئے؟" شاہانہ خاتون کی صدے سے چور آواز حلق سے پرآمد ہوئی اور حزرہ کی تو آواز بھی حلق کے اندر ہی گھٹ گئی۔ کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہا۔

نظر میکی کے بالوں سے خالی سر پر تھی، جہاں تقریباً آدھا آدھا بال کے قریب بال سر کندوں کی طرح گھڑے تھے۔

"میکی! تجھے کینسر ڈیٹر تو نہیں ہو گیا۔ اسی میں ہنر جاتے ہیں نا بال۔"

اب وہ صدے سے کھل کر رونے والے فیز میں آنے والی تھیں لیکن میکی نے اس کی نوبت نہیں آنے دی۔

"ننانی! بس شرط ہار گئی تھی دوستوں سے۔ انہوں نے شرط ہی منج کروانے کی رقمی تھی، سو کروانی

پڑی۔ ماما کا تو آپ سے بھی زیادہ برا حال تھا۔ کچھ دن تک کھانا نہیں کھایا انہوں نے۔" اہلانات کے اختتام پر خود ہی قہقہہ مار کر ہنس دی۔ "تو نے شرط کے پیچھے بٹڈ کر والی؟" اب صدے کی جگہ حیرت نے لے لی تھی (کیا جڑی مان کی نوا سی۔ ایسا تو نہ بھی دیکھا نہ سنا)۔ حزرہ نے لاشعوری طور پر اپنے کئے ہالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"شرط کے پیچھے نہیں نانی ادا ہتی کے پیچھے۔" وہ آرام سے گویا ہوئی۔

"میکی! تجھے اپنے ہونے والے شوہر کا بھی خیال نہ آیا۔" شاہانہ خاتون ایک کے بعد ایک جھگڑے سے گزر رہی تھیں۔

ہائے شادی، سچی دلہن، لوگوں کی باتیں۔ کیا کیا کچھ نہ نظروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

"اپنے ہونے والے شوہر ہی کے کہنے پر تو کیا ہے یہ۔" اس نے سکون سے کہتے حزرہ کا سکون برباد کیا۔

شاہانہ خاتون نے حزرہ کی طرف دیکھا گویا کہ رہی ہوں۔

"حزرہ..... تُو.....؟" "میں نے کب تمہیں بٹڈ کروانے کا کہا۔" وہ بے چارہ بوکھلائی تو سمجھا۔

"میں تمہاری نہیں، اپنے ہونے والے شوہر کی بات کر رہی ہوں۔"

اس نے حزرہ اور شاہانہ دونوں کی سماعتوں پر ایک ساتھ بم پھوڑا۔

☆☆☆☆

"دادی کیا ہے، اب بس بھی کر دیں۔ آپ نے تو ایسے خود کو روگ لگا لیا ہے، جیسے میری ٹھکان

آپ کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔" بچے سے اس نے ہائے روگ کیسے نہ لگاؤں۔ بچے سے یہ کہ

تھے حیرتی شادی کے۔" انہوں نے پھر سے ہلکے پھپک کر رونا شروع کر دیا۔



آج میکی کو داپس سدھارے بھی ہفتہ ہونے کو  
آ رہا تھا۔ رادی نے جو خود کو بستر سے لگایا تھا تو مزہ کی  
لاکھ ٹکلی کوئی کے ہاں جو وہ سنبھل کر نہ دے رہی تھیں۔  
”تو میں نے کیا میکی کی خاطر جوگ لے لیا  
ہے۔ کر دیجیے گا تا میری شادی، پورے کر لیجیے گا  
اپنے سارے ارمان۔“  
”میں نے تو میکی کو ہی سوچا تھا تا ہمیشہ، تیری  
دلہن۔“

”ذرا اس گنجی کو میرے ساتھ رکھ کر سوچیں، خود  
ہی اپنی سوچ پر غصہ آئے گا آپ کو۔ اس غم میں، میری  
اتنی اچھی نوکری کی خوشی بھی سکتی بریٹ نہیں کر سکے ہم  
لوگ۔ چلیں انھیں، اچھی ہی جائے پاؤں آپ کو۔“  
ان کے وجود میں کوئی جھنجھٹ نہ ہوئی۔  
تب ہی حاکم حسین اندر آئے۔

”اب بس کر دو تا بیگم! زندگی سے سارے  
رنگ ہی ختم کر دیئے ہیں تمہاری خاموشی نے۔“  
شاہانہ خاتون تو ایک طرف مزہ نے بھی حیرت  
سے دادا کو دیکھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں بھی  
دادا کو ایسے اپنائیت سے بات کرتے نہیں سنا تھا وہ  
بھی رادی سے۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بجا۔  
”چلو، آؤ، اٹھو۔ آج کا کھانا باہر کھائیں  
گے۔ بچے کی خوشی تو نہ خراب کرو۔“  
شاہانہ خاتون اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پینسٹھ سالہ  
زندگی میں کبھی ایسے جلے نہیں سنے تھے میاں کے منہ  
سے۔ حیرت سے منہ کھل گیا۔

”تو پھر کہاں جائیں گے ہم لوگ؟“ مزہ  
جوش سے اٹھ کھڑا ہوا۔  
”ارے بتایا تو ہے، باہر کھائیں گے۔“ وہ  
بولے۔

”وہی تو پوچھ رہا ہوں باہر کہاں؟“  
”باہر کھن میں اور کہاں جائیں گے۔ پیسے  
کہاں ہوتے ہیں میرے پاس۔“  
اتنے دنوں بعد شاہانہ خاتون کھل کر ہنسی تھیں۔  
”تم بھی تا حاکم حسین ا“ ابھی وہ کچھ کہنا ہی

چاہتی تھیں کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔  
”میاں کہو، مجازی خدا کہو..... کوئی اور اچھا سا  
افزا استعمال کر لو تا۔“  
”کیا میں باہر چلا جاؤں؟“ مزہ نے انٹری  
دی۔

حاکم حسین اور شاہانہ نے ایک دوجے کو دیکھا  
اور جھینپ کر مسکرا دیے۔  
☆ ☆ ☆

ٹیپو چائے لے کر آیا تھا۔ وہ دونوں بارش میں  
بیٹھے تھے۔  
”مزہ بھائی ادو آڈیو سنوائیں تا۔“  
”یہ لے۔“ مزہ نے ریکارڈنگ چلائی۔  
میکی کی گفتگو، اتفاقاً تا یا اراداً تا مزہ نے اس دن  
ریکارڈ کر لی تھی۔ اب وہ دونوں روز بیٹھ کر چائے  
کے ساتھ یہ ریکارڈنگ سنتے تھے۔

”اب کی بار آخری بار ہے۔ میں آخری مرتبہ  
پاکستان آئی ہوں۔ شادی میں اپنی مرضی سے اپنے  
برطانوی نژاد مسلمان دوست ابراہام سے کروں گی۔  
ماما، بابا کو یہ بات واپس جا کر بتاؤں گی، پہلے آپ  
لوگوں کو بتانا چاہتی تھی اور پلیز، مجھے جذباتی طور پر  
بلیک میل کرنے کی کوشش مت کیجیے گا جو کہ آپ  
پاکستانیوں کی عادت ہوتی ہے۔“  
ریکارڈنگ ختم ہو گئی تھی۔

مزہ اور ٹیپو نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر  
ہاتھ مارا۔  
”ایک بار اور سنیں بھائی؟ بڑا مزہ آتا ہے۔“  
”کل سنیں گے، ورنہ بور ہونا شروع ہو جائیں  
گے۔“

”اچھا ٹیپو! تو بتا، تیرا وہ بھینسا جیل سے باہر آیا  
یا نہیں۔“  
”افو، مزہ بھائی! میں آپ کو کتنی بار بتاؤں  
گا۔ ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا اب اس بھینسے سے۔ ابو  
نے رشتہ ختم کر دیا ہے۔“  
”بس یا! بار بار سننے میں مزہ آتا ہے۔“



”آپ کی قسمت اچھی تھی جو راستے خود بخود  
ہموار ہوتے چلے گئے۔ آپ کا اس میں کوئی کمال  
نہیں ہے۔“

”یعنی کہ تم اب بھی نہیں مانو گی۔“  
”ہرگز نہیں۔“

”دو سال ہو گئے ہیں شادی کو۔ یا رابا تو

مان جاؤ میری کرامت۔“

”پیس سال گزر جائیں گے تب بھی آپ کی کسی

کرامت کا عمل دخل نہیں مانوں گی اس سب میں۔“

”چلو، پھر میں مان لیتا ہوں۔“

”کیا.....؟“ نور کے ہاتھ بل بھر کر کے۔

”یہ تمہاری تہجد کی لمبی لمبی دعاؤں کا اثر تھا، جو

حالات ہمارے حق میں سازگار ہوتے گئے۔“

”کون سی دعائیں؟“ وہ انجان بن گئی۔

”تمہیں غالباً معلوم نہیں ہے۔ تمہارے گھر

میں، میرا ایک مخبر بھی رہتا ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”مخبر کو کیا معلوم دعائیں کس چیز کے

لیے تھیں۔“

”مخبر کو اتنا تو معلوم ہی ہوگا کہ اس کے پیچھے

میں پاس ہونے کے لیے تو کم از کم آپ اپنی لمبی لمبی

دعا میں نہیں کر سکتی۔“

”مخبر کی تو ابھی خبر لیتی ہوں جا کر۔“

”مخبر کی خبر بعد میں لیتا۔ پہلے چلو ذرا دادی،

دادا کی خبر لے آئیں۔“

”چلیں۔“ دونوں آگے پیچھے باہر آئے۔

”چاندنی رات اور من چاہے ہم سفر کا ساتھ۔“

”کیا زندقہ میں اس سے بڑھ کر بھی کسی چیز

کی طلب ہو سکتی ہے، دونوں نے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔

”اچھا تو پھر نہیں، انہیں پولیس ایسی جگہ سے  
م گرفتار کر کے لے گئی تھی جس کا نام بھی ہم شریف لوگوں  
کے لیے گناہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد تو یہ تو یہ

تو یہ۔۔۔ پھر ابو نے یہ رشتہ ختم کر دیا۔ بس بات ختم۔“

”ارے ایسے ہی بات ختم۔ آخری حصہ باقی

ہے، وہ بھی بول جلدی سے۔“

”بیلا آتنی نے گاؤں میں ہر طرف آیا کے

غلاف ایسی ہم چلائی ہے کہ اب گاؤں کا کم از کم کوئی

گھر آپا کا ہاتھ مانگنے کی کوشش نہیں کرے گا اور شہر

والوں کو یہ کوشش ہم کرنے نہیں دیں گے۔“ عزہ نے

نیچے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”اور آپ کی بات کا بھی آخری حصہ باقی

ہے، جلدی سے بتائیں تاکہ میں واپس جاؤں۔“

”دادا اور دادی ایک جان دو قالب بن چکے

ہیں۔ ہر طرح کا لڑائی جھگڑا ختم ہو چکا ہے۔ میں تنخواہ

دادی کے ہاتھ پر رکھتا ہوں، وہ سب سے پہلے دادا کو

میں سے کا خرچ دیتی ہیں۔ بھی دادا کہہ دیں کہ ابھی تو پچھلے

ماہ کے بھی میسے باقی ہیں تو دادی ناراض ہو جاتی ہیں۔

زیر دستی تھماتی ہیں پیسے اور ساتھ میں کہتی ہیں، ہمارے

بیٹے کی کمائی ہے۔ ہمارا حق ہے اس پر۔“

”یعنی کہ پچی اینڈ۔“ نیچو اٹھ کھڑا ہوا۔

”پچی اینڈ ابھی کہاں ہوا، وہ تو ہونا باقی ہے۔“

”تو آپ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔

بھجوائیں نارشتہ۔“

”ابھی نہیں۔ ذرا مناسب وقت آنے دو۔ دادی

جب اپنے منہ سے بات کریں گی میری شادی کی

تب۔“

”اوکے، میں چلا۔“ نیچو ہاتھ ہلاتا اپنے پورشن

کی سمت بڑھ گیا۔

☆☆☆

”میں کہتا تھا نا جو میں کہتا ہوں، وہ کر کے

دکھاتا ہوں۔“

وہ بیڈ پر لیٹا کنبی پر سر نکائے نور کو کپڑے سے

کرنا دیکھ رہا تھا۔





# انکسپریس

ہدی اپنی آؤی کار میں بیٹھی، گاڑی تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے لوگوں کی گالیاں سننے کا نوٹیکیشن کی تحریک میں پہنچتی ہے۔ ہدی بے حد امیر باپ کی بے حد غریبی، بے حد فیشن ایبل اور کافی حد تک فضول لڑکی ہے جسے خوب نرنگی کا شوق ہے۔

اس کا کاس فیول لائٹ اس سے ہلکی پھلکی چھینڑ چھاڑ کرتا ہے۔ اس کی دولت پر مٹھ کر رہا ہے۔ وہ اس سے کتنی بے کرکھے بد نصیب سمجھنے کے باوجود جو تم چاہتے ہو کہ میری جگہ تم ہوتے۔

کانوٹیکیشن میں دو تصویریں کھینچا ہوا ہے، ڈگری لیتی ہے۔ جب وہ نویریال اچھال کر تصویر کھینچا رہا ہے ہوتے ہیں ہدی لڑکھڑاتی ہے اور نیچے گر جاتی ہے۔ تین سے چار بار اس کے ساتھ کھینچا ہوتا ہے، وہ اچانک بے ہوش ہو جاتی ہے۔ آخری بار بورا بورا جانے پر وہ بے ہوش ہوتی ہے اور سول کھینچے بعد ہوش آتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کے پاس ہوتے ہیں اور وہاں اسے صدم ہوتا ہے کہ وہ کینسر جیسے مرضی میں مبتلا ہے اور اس کے پاس فقط سات مہینے باقی ہیں، وہ اپنا طعنا کر دانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا اندر مردہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے پاپا اسے پرائیویٹ جیٹ میں واپس لاتے ہیں اور

## مکمل ناول

PakiBooks.Site





# انٹرایکشن

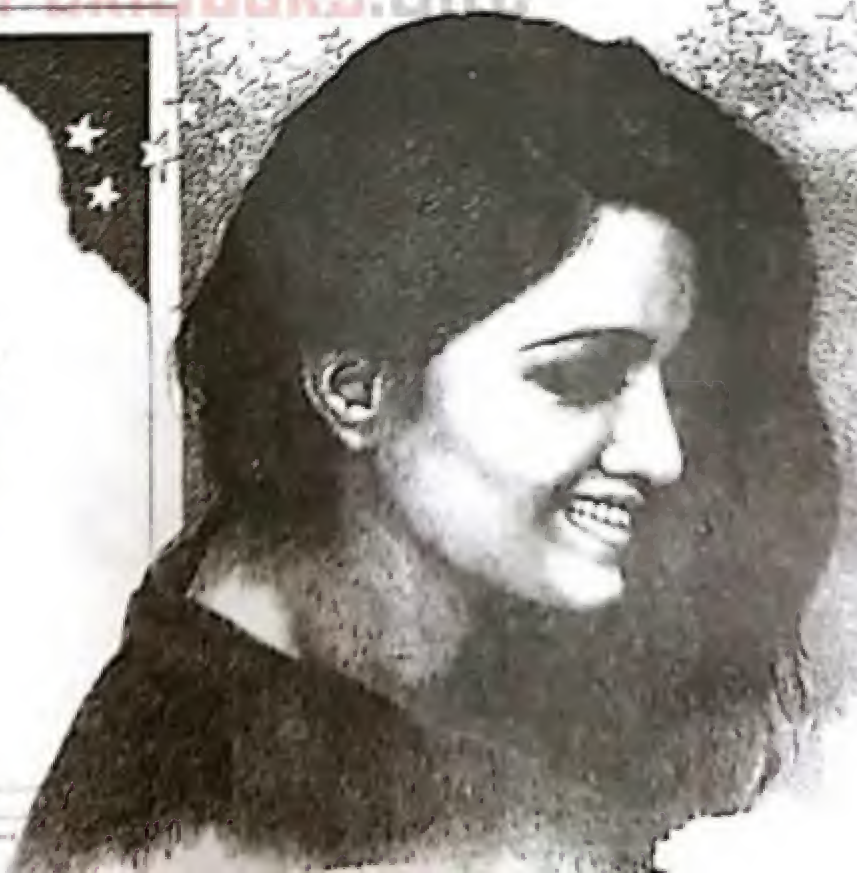
ہدی اپنی آؤی کار میں بیٹھی گاڑی تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے لوگوں کی گالیاں سننے کا نوڈیشن کی تقریب میں پہنچتی ہے۔ ہدی بے حد امیر باپ کی بے حد غریبی، بے حد فیشن ہیل اور کافی حد تک فصول بڑی ہے جسے خوب ترن کی کاٹھن ہے۔

اس کا کلاس فیلو لائم اس سے ہلکی پھلکی چھینڑ چھاڑ کرتا ہے۔ اس کی دولت پر طعنے کرتا ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ مجھے بد نصیب سمجھنے کے باوجود جو تم چاہتے ہو کہ میری جگہ تم ہوتے۔

کا نوڈیشن میں دو تصویریں کھینچواتی ہے، ڈگری لیتی ہے۔ جب وہ ٹویں اں اچھا ل کر تصویر کھینچتا ہے ہوتے ہیں تو ہدی لڑکھڑاتی ہے اور نیچے گر جاتی ہے۔ تین سے چار بار اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے، وہ اچانک بے ہوش ہو جاتی ہے۔ آخری بار بورا بورا جانے پر وہ بے ہوش ہوتی ہے اور سولہ گھنٹے بعد ہوش آتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کے پاس ہوتے ہیں اور وہاں اسے علم ہوتا ہے کہ وہ کینسر جیسے مرضی میں مبتلا ہے اور اس کے پاس فقط سات مہینے باقی ہیں تو وہ اپنا علاج کروانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا اندر مردہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے پاپائے سے پرائیوٹ جیٹ میں وہ اٹھ لاساتے ہیں وہ

## مکمل ناول

Pakibooks.Site





بے حد کم ہمت ہو چکی ہے اور اس کا وزن چیزی سے گر رہا ہے۔

ایک روز اسے اپنے کمرے میں ایک بچی دکھائی دیتی ہے جو اسے پھول دیتی ہے۔ اس بچی کا نام شیلے ہے۔ وہی بچی بعد میں اسے ہسپتال میں جمی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں اسے علم ہوتا ہے کہ شیلے چھ سال کی بچی تھی جو نیم خانے سے اغوا کر کے اسے اپنے کینسر کے علاج کے لیے آئی تھی۔ وہاں اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچی اکثر کینسر کے مریضوں کو دکھائی دیتی ہے اور لوگ اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ مگر آ کر وہ پھر سے ڈپریشن ہو جاتی ہے اور تب ہی اسے فرشتہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ فرشتہ اسے دیسا کی کہانی سناتا ہے، دیسا نے کوڑھ کی بیماری ہوئی۔

دیسا پاپے پاپ کی بے تحاشا لاڈلی، بے حد ذہین، کسی حد تک بدتمیز، سارا وقت اچھل کود، لڑائی جھگڑوں اور لوگوں کو کانٹے میں اپنا وقت گزارتی ہے۔

اس کے والد اس سے وعدہ لیتے ہیں کہ وہ نیچے گھائی میں کبھی نہیں جائے گی۔ گھائی میں کوڑھ کے مریض رہتے ہیں جس کی کوڑھ بوتا ہے، اس کے گھر والے اسے وہاں چھوڑ آتے ہیں تاکہ دوسرے محفوظ رہ سکیں۔

پاپ بچی گھائی کی چوٹی پر بیٹھے ہوتے ہیں اور والد اسے کہتے ہیں کہ وہ کاٹنا چھوڑ دے، تب ہی دور سے گھنٹیوں کی آواز آتی ہے اور پاپ دیسا کو چادر میں چھپا لیتا ہے کیونکہ کوڑھی خیروں میں گھنٹیاں باندھتے ہیں اور اس کوڑھی بوڑھی سے کہتا ہے کہ وہ اس علاقے سے دور ہے۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا تب بوڑھی کہتی ہے کہ اس کے والد بھی اس سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔

ایک روز خرطوم اسی کوڑھی بڑھیا کو چھو مارتا ہے۔ دیسا اسے بچانے کی کوشش کرتی ہے اور خرطوم کو مارتی ہے جو ابادہ اسے کوڑھی ہو جانے کی بددعا دیتا ہے۔

دورین کی شادی میں دیسا بہت سچ سنو کر آئی ہے۔ سب کی نظریں اسی پر مرکوز ہیں تب ہی ایک دانا عورت کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ وہ اس کی کھائی سے کپڑا ہٹاتی ہے۔ کھائی پر سفید دھبہ دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ دیسا کو کوڑھ ہو چکا ہے۔ اب آگے پڑھیے۔

## دوسری اور آخری قسط

دیسا نے ابدا کچھ بچھا کرتی ایک گہری سانس لی۔ دانا عورت کی آواز، وہاں موجود ہر ذی روح کی سماعت تک پہنچ چکی تھی۔ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہرا ہوتا دولہا تک چونک کر سیدھا ہو چکا تھا۔ جتنے لوگ اس کے قریب کھڑے تھے، اس کی سہیلیاں، شادی میں شریک دوسری لڑکیاں، عورتیں اور کچھ بچے، دو بچیاں تو اس کے لباس کے کونوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں، وہ تک بدک کر پیچھے ہٹتی تھیں۔

ایک لڑکا..... اور وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ اس نے اپنی ”دھیا کھائی“ سے ریشم سر کا یا اور اسے اوپر تک سر کائی ملی تھی۔ وہ ان دھبوں کو دیکھنا چاہتی تھی، جو کھڑے کھڑے اسے نامراد بنا گئے تھے۔ وہ چند دن پہلے بھی انہیں دیکھ چکی تھی لیکن وہ فکر مند نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو بھول بھی گئی تھی کہ اس کے جسم پر کہیں کوئی نشان موجود ہے..... ایک کے بعد اس نے دوسرے بازو سے ریشم سر کا یا..... سب اسے دیکھ رہے تھے۔

”بد بخت! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ دوں گی، میری دیسا کو تو نے کوڑھی کہا۔“ کہیں بہت پیچھے سے ماں بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ ماں نے اس عورت کے منہ پر ہاتھ کا پنجا ایسے مارا تھا جیسے اس کی کھال ادھیڑ لے گی۔ عورت تکلف سے بلبلا اٹھی، لیکن ماں نے اپنی گرفت ڈھیل نہیں کی تھی۔ وہ بار بار کہتی تھی۔ ”میں تیرا منہ نوج لوں گی، میری دیسا کو“



کوڑھی کہہ۔

”میرا من تو اپنے کے بجائے اپنی بد بخت لڑکا کو  
کانت تو راج پاکی عورت۔ اس پر خدا کی پھانسی پڑ  
چکی ہے۔“  
سائنس لیجی ورسا، دل دھڑکا تو ورسا۔ اس  
نے تکلیف کا ایسا گھونٹ بھرا کہ اس کی روح بیٹھا  
اٹھی۔

”خدا کی پھانسی۔“ وہ زریب بڑبڑایا۔  
ریت میں کرکڑی میس، کرکڑی ٹکڑی روکی، گرنے لگی  
تھی۔ سارے کے لیے کوئی ٹھکانہ، براہِ حق نہ کرنے  
سے جسے کیا کوشش میں ہاتھ روٹنے کے لادے  
تھریا۔ آگ نے اس کے ریشم پر اپنی پٹنگاری  
چھوڑی اور بجھ گئی، ریشم نکال دیا۔ وہ ساری کی ساری  
جل گئی۔

”اس پر خدا کی لعنت پڑ چکی ہے۔ ٹھکانے  
یہ۔“ ورسا نے یہ لفظ بہت بار سنے تھے۔ آج جتنا بار  
اپنے لیے سنے تھے۔

”بد نصیب عورت! کیسی اولاد پیدا کی ہے تو  
نے جس نے خدا کے عذاب کو دعوت دی ہے۔  
کوڑھی ہو چکی ہے یہ، فرشتے اس پر لعنت بھیج رہے  
ہیں۔ خدا سے فداقت کا ڈھیر بڑا چکا ہے۔ دُور ہو جاؤ  
سب اس سے، ہمیں تم بھی خدا کے عذاب کے مستحق  
نہ ٹھہرائے جاؤ۔ اس پر بھیجی جانے والی لعنت کے  
چھینے ہم پر بھی نہ پڑ جائیں۔ اس کے ناپاک جسم،  
گندی روح کا خیا زہن ہم سب کی جانوں پر بھی نہ  
آجائے۔“

جو پہلے ہی اس سے دُور ہو چکی تھیں، وہ منہ پر  
ہاتھ رکھ کر اور دُور ہونے لگی تھیں۔ خولہ اور دورین۔  
وہ سسک رہی تھیں اور منہ ڈھانپ رہی تھیں۔ اس  
نے گردن تھما کر دیکھا، وہ اس سے دُور، بہت دُور،  
پھرتی جا رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایک دم سے نم ہو  
گئیں۔ وہ بھی روئی نہیں تھی۔ لیکن۔ لیکن اب  
اس کا پیچھا کر کے وہ اتار دئے کہ سارے جہاں کو

اپنے آنسوؤں میں ڈبو رہا ہے۔

”توبہ توبہ! کچھ توبہ ہے۔ یہ لڑکی تم پر  
عذاب لانے والی ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا  
سکتیں۔ مجھے یہ شہر، اس بد بخت کی جہد سے بڑا ہونا  
دکھائی دے رہا ہے۔ اس سیاہ کار کے گناہ کا عذاب  
بہت جلد اس شہر پر کالی آنکھیں میں کر، ہر جان  
پر بھاری پڑنے والا ہے۔ سب مل کر توبہ کرو۔ اگر تم  
نے توبہ نہ کی تو ایک ایک کر کے تم سب کوڑھی ہو جاؤ  
گے۔ اپنے گناہوں کے لیے روتا، گڑگڑاؤ اور  
کوڑھ سے بڑا، مانگو۔ اس کے گناہ کا خدائی قہر ہم  
سب کے سروں پر منڈلانے لگا ہے۔ اے خدا

ہیں اپنی پڑاؤ میں رکھ۔ اے خدا۔“  
ماں اپنے ہوش کھو رہی تھی۔ بچوں کے ساتھ  
کھینچا اس کا بھائی، وہ اپنا کھیل چھوڑ کر ماں کا پلو کھینچ  
کھینچ کر پوچھ رہا تھا۔  
”نہیں! وہ جاری دیرسا کوڑھی ہو گئی، ماں؟ ماں؟  
کیا ہاری دیرسا۔ ماں؟“

سفید ریشم ہوا اس پھر پھڑا رہا تھا۔ ماں سے  
جواب نہ پا کر وہ اس کی طرف آیا تھا۔  
”دیرسا۔ دیرسا۔“ وہ رونے لگا تھا۔ اس  
کا ہاتھ کھینچ کر رہا تھا۔

اس نے اپنا کوڑھی ہاتھ بھائی سے الگ کر لیا۔ وہ  
اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے گال پونچھتا چاہتی تھی۔  
جھک کر اس کا منہ چومنا چاہتی تھی۔ لیکن اب وہ یہ نہیں  
کر سکتی تھی کیونکہ اب تو وہ کوڑھی ہو چکی تھی کیونکہ  
کیونکہ۔ اب وہ صرف دیرسا نہیں رہی تھی۔

”دیرسا۔ بولو بولو۔ والد کی جان، بولو  
بلا۔“ وہ سسک رہا تھا۔  
والد کی جان۔ اب ان کی جان لینے والی  
تھی۔

”دیرسا۔ میری پیاری دیرسا۔“ اس کا  
رونا کتنی جلدی ہتھکیوں میں بدل چکا تھا۔ بے چارہ  
کوڑھ سے کیسا غم زدہ تھا۔



”ہاں..... میں کوڑھی ہو چکی ہوں۔“ سارا شہر جو کبھی اس کی جرأت کا گواہ رہا تھا، اس وقت اس کی ”بزودی“ کا گواہ ہوا تھا۔ اس کی کپکپاتی کم زور آواز نے اس کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چٹان حوصلے سہار ہونے لگے تھے۔

”دببسا..... دببسا.....“ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو دببسا ہے۔ وہ کوڑھی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ اس کی بہن ہے۔ والد کی لاڈلی ہے۔ حسن کی دیوی ہے۔ وادی کا پرندہ ہے۔ زمین کا پھول ہے..... وہ کیسے..... وہ کیسے..... لیکن اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ اس کے نام کی تکرار کے جا رہا تھا۔ پھر وہ اس سے لپٹ گیا۔ وہ چھوٹا تھا لیکن کوڑھ اور کوڑھی کے نصیب سے اچھی طرح سے واقف تھا۔

وہ رو رہا تھا کہ شاید یہ نصیب بدل جائے۔ اس کی دببسا کوڑھی نہ رہے۔ دونوں بازوؤں سے اسے تھام کر وہ یہ تسلی کر رہا تھا کہ اس کی دببسا کہیں جانے والی نہیں..... کہیں نہیں..... گھائیوں پر خدا کا قہر برے، آسمان کی بجلی گرے۔ اس کی دببسا..... اس کی دببسا..... وہاں کیوں جائے..... زمین دلدل ہو، اور گھائیاں اس میں غرق ہوں، اس کی دببسا..... اس کی دببسا۔

دببسا نے اسے خود سے الگ کیا اور کہا کہ وہ ماں کو سہارا دے اور گھر لے جائے۔ لیکن اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ وہ پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ پھیلی سے اپنی آنکھیں رگڑتا جاتا تھا شدت سے ہچکیاں بھر رہا تھا..... اس نے ماں کو سہارا دے کر کھڑا کرنے کے بجائے شادی کے گھر سے دور بھاگ جانا چاہا..... والد کے پاس۔

”بابا..... ہماری دببسا..... وہ..... ہماری دببسا.....“ شہر کی گلیوں میں بھاگتے، باپ کو پکارتے، دببسا پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر دیتے، وہ اپنے نم پردہائی چٹا سر پٹ بھاگتا جا رہا تھا۔

اس رات، سارے شہر نے ”ہماری دببسا، ہماری دببسا“ کی پکار سنی تھی۔ اس رات پورا آسمان گواہ بنا تھا کہ جب وہ زمین والوں پر گرتا ہے تو کیسا حشر برپا ہوتا ہے۔ اس رات زمین نے اپنی جڑیں کھوکھلی کر کے جانا کہ جب وہ خود کو تنگ کرتی ہے تو زمین والوں پر کیا گزرتی ہے۔

شادی کی تقریب میں یونانی حسن کی دیوی..... دببسا..... کھڑے کھڑے کوڑھی ہو چکی تھی۔ ☆☆☆

”اسے کوڑھ نہیں ہے۔ اس عورت کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ والد کے لہجے میں ایسی تندی اور سختی تھی کہ شہر کے معززین نے سہم کر پہلو بدلے تھے۔ وہ خائف ضرور ہوئے تھے لیکن ارادے کے پکے تھے۔

وہ سب مل کر والد کو یہ یاد دلانے آئے تھے کہ جلد سے جلد دببسا کو گھر اور شہر سے نکال دیا جائے۔ ہوائی جلدی نہیں پھیلتی، جتنی جلدی یہ بیماری پھیلتی ہے۔ اس لیے وہ ”بیماری“ کو اس کی اصل جگہ روانہ کریں۔ ”ہم اندھے تو نہیں ہیں۔“ ایک نے خضر سے کہا۔ وہ اس انسان کی کم عقلی پر حیران ہوا تھا۔

”اندھے ہو یا بہرے، میں نے کہہ دیا ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، میری دببسا کا نام لیا تو میں زبانیں کاٹ لوں گا۔“

”کس کس کی زبان کاٹو گے؟ کب تک کاٹو گے؟ تمہیں لگتا ہے کہ تم اس کا کوڑھ چھپا کر رکھ لو گے؟ یہ ناسور ہم یہاں اپنی بستیوں میں پھیلنے دیں گے؟ کس لیے؟ سارے شہر میں دبا پھیل جائے گی۔ تم چاہتے ہو کہ سارا شہر کوڑھی ہو کر مرے۔“

”اسے یہ بیماری نہیں ہے تو دبا کیسے پھیلے گی.....“ وہ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہے تھے۔

”تم کے دھوکا دے رہے ہو؟ خود کو یا ہمیں؟ ٹھیک ہے تو بلاؤ پھر دببسا کو..... ہم خود دیکھ لیتے ہیں۔“



”کسی کے سامنے نہیں آئے گی۔ آپ سب  
— جانے ہو گے۔“

گوئی یہاں سے جانا ہو۔  
 بہم تم سے نرمی سے بات کر رہے ہیں، اس کا  
 مقصد یہ نہیں ہے کہ تم اپنی من مانی کر سکتے ہو۔ اس شہر  
 کے کچھ قانون ہیں، اصول ہیں۔ بہم ایک کے لیے  
 پورے شہر کو کوڑھ کا تختہ نہیں دے سکتے۔ جان حلق میں  
 غلی کیوں نہ لگی ہو، انسان اپنی فلاحیت نہیں کھا سکتا۔ تم  
 بھی اس فلاحیت کو نہ چاؤ۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔“

”کیسا شہر؟ کون سے لوگ؟ میں سارے شہر کو

آگ لگے دوں گا..... نکلے یہاں سے۔“  
 ”تو تم نے مان لیا کہ وہ کوڑھی ہو چکی ہے؟؟“  
 ”ہاں ہو چکی ہے..... ہاں ہو چکی ہے..... اب  
 دفع ہو جاؤ یہاں سے.....“ وہ ایک ایک کو دھکے  
 دے کر گھر سے نکل جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔  
 ایک نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کی شدت پسندی کو روکنا  
 چاہا۔

”تین سال پہلے شہر کے معززین میرے گھر بھی آئے تھے۔ میری گیارہ سالہ بہن کے لیے۔۔۔ ان لوگوں میں سے ایک تم بھی تھے۔ تم نے کہا تھا کہ ہر بیماری کا ایک علاج ہوتا ہے، اس بیماری کا علاج گھائی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ یہ بیماری ہم پر خدا کا عذاب ہے۔ مخلوق کو اس عذاب سے بچانے کے لیے ہمیں اپنے دلوں پر پتھر رکھنے ہوں گے۔ میں نے دو پہاڑ سا پتھر اپنے سینے پر رکھ لیا تھا۔ میرا باپ اس کے تم میں مر گیا، میری ماں اس کے لیے بستر سے جاگتی تھی۔ لیکن ہم نے اپنے سینوں سے پتھر نہیں کھسکا تھا۔

مجھے بھی اپنی بہن سے اتنا ہی پیار تھا جتنا تمہیں  
اپنا دیرسا ہے۔ وہ ڈیڑھ سال گھائیوں میں رہی  
اور پھر مر گئی۔ لیکن ہم نے اس کی میت اسی وقت اٹھا  
لی تھی جس وقت وہ گھائیوں میں جا رہی تھی۔ وہیں ہم  
نے اس کی قبر کھود دی تھی۔ میں نے وہی کیا جو اس شہر  
کا قانون تھا۔ تمہیں بھی وہی کرنا ہو گا۔ کوڑھی آبادی

## 5 خواتین ڈائجسٹ

\_\_\_\_\_

میں نہیں رو سکتا۔ اس لئے تم یہ جان لوں نہیں توڑ سکتے۔" والد کے ہاتھ کپکپا گئے تھے۔

”میری دینسا کو چھوڑ دو۔ میں اسے گھر کی کوٹھڑی میں بند کر دوں گا۔ وہ کسی کو دکھائی نہیں دے گی۔ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔ میں اسے کوٹھڑی میں زنجیروں سے باندھ کر رکھوں گا۔“ وہ رو دیے تھے رات کو بچکیاں لیتے، دکھ سے بلباتے جیسے کی طرح، جو انہیں دیکھتے ہی ان سے لپٹ گیا تھا اور بس روتا ہی جاتا تھا۔

”تا کہ سارے شہر پر عذاب نازل ہو جائے؟  
تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو۔ اس پر خدا کی لعنت پڑ چکی  
ہے۔ وہ اپنے گناہ کی پکڑ میں آ چکی ہے۔ اس کی  
روح ناپاک ہے۔ وہ بد بخت ہے۔ ہم ایسے  
بد بخت انسان کو شہر میں نہیں رکھ سکتے۔“  
”میں یہ شہر چھوڑ دوں گا۔“ انہوں نے ہاتھ

156 58

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف  
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

ایک نئی مثال

رخسانہ نگارستان

مکمل ماحول کنڈیسیشنز میں  
میں شائع ہو گیا ہے



قیمت - 500 روپے

منگوانی کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

قون نمبر:

32735021

37. اورو ہندو کراچی



اس کے من کے کن کا تھا اس کے کنارہ پر  
 رہا تھا۔ اس کی شرارتوں سے بھرا ہوا تھا  
 اس کی ہر حرکت سے لبر مطلق ہو لے گا خدا  
 اسے چل رہی دیوی کا لقب دیتے تھے وہی خدا  
 اسے مٹا اس کی پہلی کہہ رہے تھے لایاں اس کی  
 چراگت پر لدا سب وہی لایاں اس کے سامنے  
 بچ کر اور کڑی ہیں۔

ایک لڑکا..... اور سب قسم ہو گیا.....  
 دنیا کی کوئی طاقت اس کے کام نہیں آتی  
 تھی۔ سب باپ کا اختیار، ماں کا پیار ہی کسی کام کا  
 نہیں رہا تھا، وہ اپنی دنیا کی کیا حیثیت تھی؟ اسے کوئی  
 نہیں بھاسکتا تھا تو پھر کون بھاسکتا تھا؟ اصل طاقت  
 در کون تھا؟ کس کے پاس تھا ہر جان کی تقدیر کا  
 اختیار؟

☆☆☆

والد اتار دئے تھے کہ وہ ان کی طرف دیکھتی  
 تھی تو اسے اپنے گناہ کار ہونے کا یقین ہو جاتا  
 تھا۔ وہ جو والد کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی، ان کے لیے  
 انکارہ بن چکی تھی۔ گھر کی ایسی حالت تھی جیسے وہاں  
 ایک ساتھ کئی لوگ مر چکے ہوں۔ ان کی منتیں ملی  
 پڑی ہوں اور کوئی دفنانے کی ہمت نہ کرتا ہو۔  
 "میں آج رات تمہیں یہاں سے لے کر کل  
 جاؤں گا۔ ہم کہیں اور جا کر رہیں گے۔" اس کے  
 ہاتھ چومتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے۔  
 "اور ماں؟"

"تمہاری ماں کمزور نہیں ہے، وہ اکیلی رہ سکتی  
 ہے۔ ہم دیرانوں میں رہ لیں گے ویسا لیکن یہاں  
 نہیں رہیں گے۔"  
 "دیرانوں میں ہی رہنا ہے تو..... تو.....  
 والد..... مجھے وہیں جانے دیں جہاں۔"  
 "تمہیں اپنے باپ کی جان کی قسم ہے ویسا  
 تمہیں میری قسم ہے میری آنکھوں کے نور....."  
 روتے روتے ہانکنا ہو چکے تھے۔  
 "یہ نہ کہنا، کبھی نہ کہنا۔ میں کیسے سہوں گا۔ ہم

ہر ایک کے لیے تھے۔  
 وہیں کوئی اپنے شہر کی حدود میں کھائے نہیں  
 دے گا۔ اپنے لیے نہ کی کوئی جگہ بنا۔ ہم کہا ہے وہ  
 کرو۔ لیکن ہم تم باپ..... لیکن چوہو سوچ سب خدا  
 نے ہی اسے لکھ دیا تھا کہ اول کیوں بھلا ہوا  
 رہا ہے۔ اور پھر کہ خدا اپنے بندوں سے بہت پیار  
 کرتا ہے۔ لیکن سب کو کسی بے بدلتی پہنچتا ہے تو وہ  
 انسان اسی بدلتی کا شوق ہوتا ہے۔ کڑھ ہی۔  
 بدلتی کی نشانی ہے۔ تمہیں اپنے بد بخت انسان سے  
 دل نہیں لگانا چاہیے۔ تو یہ کرو..... خدا سے اپنے  
 منوں کی معافی مانگو..... معافی مانگو کہ وہ تمہیں  
 معاف کر دے جو ایسی گناہ کار بنی کے باپ بنے۔"  
 "کہ اس بند کردہ اپنی میں تمہارا منہ توڑ دوں  
 گا۔" وہ چلا اٹھے تھے۔ گھر کی چیزیں اٹھا لیا کر ان  
 پر پھینکے گئے تھے۔

وہ اوت میں کڑی، سب دیکھ اور سن رہی تھی۔  
 والد دہرائے ہوئے تھے۔ ماں کی کل رات سے عجیب  
 حالت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بحر مدار سے اپنی  
 سانسوں کی ڈور ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ گھر میں وہ پیار،  
 والد اور والدہ اور ایک روکی ویسا موجود تھے۔ لیکن ان  
 پیاروں کی پیار پر ہی کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔  
 یہ وہ پیاری تھی، جس کی حیات کرنے والوں کو  
 بھی بد بخت سمجھا جاتا ہے۔ ایسی دلہیز بھی پار نہیں کی  
 جاسکتی۔ جہاں کوئی کوڑھی رہتا ہو۔ اس کی سہیلیاں  
 تک نہیں آتی تھیں۔ اس پاس کے مسائے اپنا گھر  
 بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جب تک ویسا گھائیوں  
 میں نہیں چلی جاتی تھی، وہ اپنے گھروں میں واپس  
 آنے والے نہیں تھے۔

کل سورج غروب ہوا تھا تو سب کچھ ٹھک تھا،  
 آج کا سورج طلوع ہونے سے پہلے سب کچھ ختم ہو  
 چکا تھا۔ اس کی خوش قسمتی، بد بختی میں بدل چکی تھی۔  
 اس کا من کر یہ ہو چکا تھا..... نام "کوڑھی" اور  
 وجود بدلتی۔

رات کے تین پہر ہی بیتے تھے کہ سارا شہر جو



یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں تمہارے لیے کوڑھی کا لٹہ نہیں سن سکتا۔ میرا جی چاہتا ہے میں اپنے کانوں میں سیسہ انڈیل لوں۔ اپنے باپ پر رحم کرو دیسا! خد نہ کرنا، بس میں جو کہوں وہ کر لیتا۔“

”آپ خود کو بلکان کر رہے ہیں والد! مجھے اب اس زمین پر نہیں پناہ نہیں ملے گی۔“

”پھر میں تمہارے لیے آسمانوں میں پناہ ڈھونڈ لوں گا۔“ باپ کی ایسی بات نے دیسا کا دل کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

”میرے ساتھ رہ کر آپ بھی اس بیماری سے نہیں بچ سکیں گے۔“

”تمہارا باپ اس بیماری سے ڈرے گا؟ جو خوف تھا وہ تو پورا ہو گیا۔ اب اس بیماری سے کیا ڈرنا دیسا۔“

”پھر اس بیماری کے نصیب سے بھی نہ ڈریں والد! میں لعنت کی مستحق تھی، مجھے لعنت مل گئی۔ میں جہاں بھی جاؤں گی، میرے ساتھ یہی ہو گا۔ مجھے بد بخت کہا جائے گا، خدائی عذاب کا طوق سمجھا جائے گا۔ مجھے پتھر مارے جائیں گے۔ میری پیشانی دیکھیں، اس پر روشن چاند گرہن کھا چکا ہے۔“

میری آنکھیں دیکھیں، یہ اپنا نصیب پڑھ چکی ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ لوگ خدائے محبت کرنا تو چھوڑ سکتے ہیں لیکن کوڑھی سے نفرت کرنا نہیں۔ جسے خدا دھک مارے، اسے دنیا بھی ضرور ہی دھکارتی ہے۔ خد نہ کریں۔ اپنے حصے کی بد بختی مجھے بھگت لینے دیں۔“

”خدا میری دیسا پر لعنت کیسے بھیج سکتا ہے۔“ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

”اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بڑھ کر آپ کے آنسو نہیں پونچھے تھے، ان کے ہاتھ کی پشت اتنا ہند ماتھا۔ اس نے دنیا کو خود سے دور کرنے کی خاطر اپنے باپ سے کی تھی۔ اس نے ان سے فاصلہ کو لایا تھا۔“

”دروازہ کھول لعتی کے باپ۔۔۔۔۔ دروازہ کھول۔۔۔۔۔“ گھر کے باہر شور اٹھا تھا۔ شام گہری تھی، رات ہونے ہی والی تھی۔ ماں بے چاری نے گھر میں روشنی بھی نہیں کی تھی۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر اپنے شوہر کے آنسو ہی پونچھ دیتی، روشنی کا انتظام کیسے کرتی۔ اس کا تو بس یہی جی چاہتا تھا کہ بستر پر پڑے پڑے مر جائے۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کرے تو دوبارہ کھول نہ سکے۔۔۔۔۔

”کیا لینے آئے ہو یہاں۔۔۔۔۔؟“ وہ دروازے کے سوراخوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ وہاں ایک عالم کھڑا تھا۔

”بہت سن لی ہے ہم نے تمہاری۔ نکالو اسے باہر اور خود بھی نکلو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اپنی بد نصیبی میں ہمیں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔ شہر پر عذاب آنے لگا ہے۔ ہم نے اپنے رب کی حکم عدولی کی ہے۔ شہر میں آگ لگنا شروع ہو چکی ہے، صید کا گھر شعلوں سے بھڑک رہا ہے۔ ہم نے ایک سیاہ کار کو پناہ دے رکھی ہے۔ سارا شہر جل کر راکھ ہو جائے گا۔ جس سے خدائے زار ہو چکا ہو، ہم اس سے لگاؤ نہیں رکھ سکتے۔ پاگل انسان، اپنی دوسری آل اولاد کے بارے میں سوچ۔ تو چاہتا ہے کہ ان سب پر بھی عذاب آئے۔“

”اپنی مصیبتوں کا الزام تم میری بیٹی پر کیسے لگا سکتے ہو کم عقلو۔۔۔۔۔“ والد سسکے۔

”دروازہ کھول دو، ورنہ ہم تو ڈریں گے۔ تمہارا بہت لحاظ کیا ہے ہم نے۔ رات تک ہم پر نجانے کتنی اور مصیبتیں آچکی ہوں گی۔ ہم خدا کو اور ناراض نہیں کر سکتے۔“

”باپ کے دل پر وار کر کے تم خدا کو راضی نہیں کر سکتے۔ تو ڈرو دروازہ۔ میں اسے کھول کر اپنی بیٹی کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔۔۔۔۔“ وہ لپک کر دیسا کے قریب آئے۔

دروازے پر دھکے مارے جانے لگے تھے۔ بستر سے نکل کر کرنی پڑی ماں یہ منظر دیکھ کر پھوٹ



بھٹ کر رونے لگی تھی۔ اسے رونے کے سوا کوئی چارہ ہی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اتنی بے بس تھی کہ خود کو جھوٹی تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔ والد جلدی جلدی چند ضروری چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ وہ اسے اپنے ساتھ شہر سے باہر لے جانا چاہتے تھے۔

”ہم جھپٹی دیوار کو دگر نکل جائیں گے۔“ وہ اس کا ہاتھ کھینچ رہے تھے۔ وہ دیوار کی طرح بھی نہ بننے کے لیے کھڑی تھی۔

”نہیں والد! یہ ہجرت ہمیں اس نہیں آئے گی۔ مجھے بھی وہی بھگتنا ہو گا، جو شہر کے دوسرے کوڑھی بھگت رہے ہیں۔“

”اپنی زبان کاٹ لو دیسا! میرے سامنے خود کو کوڑھی نہ بنو۔“

اس نے اپنے باپ کی بے پناہ محبت کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ اس شدت کی محبت اس کے باپ کی ہے تو۔۔۔ تو۔۔۔ خدا اس سے کیسے نفرت کر سکتا ہے۔۔۔ وہ کیسے اسے دھتکار سکتا ہے۔۔۔

شدت غم سے کانپتے والد کے وجود میں الٹاؤ دیک رہے تھے۔ رات ہی رات میں، نہ جانے کسے ان کی ساری داڑھی سفید ہو چکی تھی۔ سیاہ بال تھے بھی تو وہ ردپوش ہو چکے تھے۔ ماں کی حالت پر حشر پاتا تھا۔ ایک ہی رات میں، جھوٹے بھائی نے بڑھاپے کی چال سیکھ لی تھی۔ گھر کی سانس، باس دینے لگی تھی۔

گھر کے دروازے پر پتھر پڑ رہے تھے۔ باپ نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ اسے جھپٹی دیوار تک لے جانا چاہتے تھے۔ وہ اسے ساری دنیا سے چھپا لیتا چاہتے تھے۔ تنگ ہو چکی زمین سے بلند کر کے، وہ اسے کھلے آسمان پر اٹھا لے جانا چاہتے تھے۔ کہ۔۔۔ کہ دیسا نے اپنا ہاتھ ان سے آزاد کر دیا۔ اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

”میں جارہی ہوں۔ والد کے گھر پر پتھر نہ برسائیں۔“ چوکھٹ کے درمیان میں کھڑے ہو کر اس نے اطمینان سے کہا۔

”تمہارا باپ انہی چمڑوں کی نالیہ لکڑی ہے۔“ کسی نے خیر یہ کہا۔

”وہ نا سمجھ ہیں آپ جیسے سمجھنا نہیں سکتا کیا مقابلہ ٹھہر نہ کریں، میری جیت سب سے کوئی عذاب نہیں آئے گا۔ لعنت کا دھنسا دینا ہے، اس طوق کا عذاب بھگتنے میں جاری ہو سکتا ہے کوڑھی ہو چکی ہوں اور کوڑھی بن کر رہے سکتا ہے بھی تیار ہوں۔“

بد بخت دیسا۔

لعنتی دیسا۔

ناپاک دیسا۔

☆☆☆

بد بخت۔۔۔ لعنتی۔۔۔ ناپاک۔

ہڈی نے زیر لبہ نام دہرائے تھے زمین پر اترا کر چلتے ہوئے اسے بھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اسی زمین پر کسی کو ذلت سے ٹھہرا گیا ہے اس کے حصے میں جتنا سکھ آیا ہے، اس سے تیس زیادہ، غنی کے انسان کے حصے میں عذاب آیا ہے۔

وہ چھٹی ہوئی آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ بھرا تھا۔ لفظ لعنت سے سخت نفرت تھی۔ اسکول میں اس کی کھانسی لڑائی اسی ایک لفظ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ ٹرائی بڑھ گئی تھی کہ اسے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ گھر نے اسی پر بس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی کھانسی فیو کے فریج گئی تھی۔ شام کو کھیتے کے لیے وہ پارک آئی تو اس نے مار مار کر اس کا مسٹر خراب کر دیا تھا۔ بد بخت اسکول کا بورڈ، اس بچی کے والدین، سب جڑ سے کہ وہ اتنی تشدد پسند کیوں ہو رہی ہے۔ گھر نے اسے اتنا بھڑکا دیا ہے۔

لعنت۔۔۔ کبھی بار شیطان پر بھیجی گئی تھی۔ اس لفظ کا مستحق قرار پایا تھا۔ انسان اپنے لیے اس لفظ کے طوق پر بلبلاتا تھا۔

”انہوں نے دیسا کو لکھی کہا“ اور فرشتے پوچھ رہی تھی۔



تھے۔ ایک ایک کر کے اس نے ان سب لوگوں کو جو اس کی بیماری کا سن کر پریشان ہوئے تھے، کال کی، ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اسے خدا کے عذاب کی گالی دینے سے باز رہے تھے۔

رات اسی طرح گزر گئی..... نئے دن کا سورج اس نے جھیل کے کنارے سے ابھرتے ہوئے دیکھا۔ وہ جاگ گئی تھی..... نیند سے بیدار ہو چکی تھی۔

غفلت خوبی نہیں، اور جاہلیت نیکی نہیں۔ یقین کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہوں تو، بے یقینی کی دلدل میں گرنا ضروری نہیں۔ ہر چیز، ہر کیفیت نے اپنے معنی بدل دیے تھے۔ وہ پھول جو شیلے نے دیے تھے، وہ پھول جو فرشتے کے ہاتھ میں رہے تھے، وہ اس نے بہت محبت سے تھام کر اپنے سینے سے لگا لیے تھے۔ زندگی کسی بیماری، معذروہ، تکلیف، مصیبت، پریشانی، روگ پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ تب ہی تو یہ شروع ہوتی ہے۔ انسان کو کوئی چیز مٹی سے سونا، سونے سے ہیرا، اور ہیرے سے کوہ نور نہیں بناتی جتنی جلدی تکلیف بناتی ہے۔

”اگر کوئی بیماری لعنت رہی ہے، تو کیا کبھی کوئی بیماری نعمت بھی رہی ہے؟“ وہ فرشتے سے پوچھ رہی تھی۔

”بیماری ہر حال میں نعمت ہوتی ہے۔ ہر کیفیت اور ہر احساس میں۔ وہ کتنی ہی معمولی، بے ضرر اور مختصر دورانیے کی کیوں نہ ہو۔ تکلیف ہر حال میں نفع ہے۔ گناہ گار کو ہوتو بھی، مومن کو ہوتو بھی، یہ ہر حال میں اللہ کی رحمت کا ذریعہ ہے۔ اللہ کی رحمت کے سب سے زیادہ قریب ”بیمار“ ہوتا ہے..... وہ جسمانی بیمار ہو، ذہنی، روحانی، جذباتی یا دلی..... وہ اللہ کی محبت اور توجہ کا سب سے زیادہ مستحق قرار پاتا ہے..... بیمار..... اللہ کی لعنت نہیں اللہ کی رحمتوں کے سایے میں رہتا ہے۔

☆☆☆

”مادی چیزیں ہاتھ سے نکل جائیں تو دوبارہ

ہاں..... کیونکہ سب کا ماننا تھا کہ یہ بیماری لعنت ہے.....“

”کیا کوئی بیماری اپنے ساتھ لعنت بھی لاسکتی ہے؟“ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”کوڑھ لائی تھی..... لعنت، ملامت، تہمت، دھکار..... انسانوں کی نفرت کا عذاب..... ذلت، تنہائی اور بدنامی.....“

اس کی آنکھیں اتنی نم ہو گئیں کہ فرشتہ ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے آج تک کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ وہ کتنی لعنتوں سے محفوظ رہی ہے۔ کتنی زحمتیں ہیں جو اس زمانے کے انسان کے لیے رحمتوں میں بدل دی گئی ہیں۔ کاٹنا چھینے پر بلبلانا اٹھنے والے انسان نے کبھی جاننا ہی نہیں چاہا کہ کتنے ہی کانٹے اس کی راہ سے پہلے ہی چن لیے گئے ہیں۔

شیشے کی کرچیوں کا ڈھیر سمیٹا جا چکا تھا۔ ماما، پاپا اس کے پاگل پن سے پریشان تھے۔ وہ ان کے پاس گئی اور اس نے باری باری دونوں کے ہاتھ چمکے۔ وہ بھی ان کی محبت، ان کی فکر، ان کی موجودگی کا شکریہ ادا نہیں کر سکی تھی۔ وہ یہ بھی جان ہی نہیں پاتی تھی کہ انسان پر سب سے پہلا اور عظیم احسان ماں باپ کی صورت میں کیا گیا ہے۔ باپ کی شفقت اور ماں کی محبت، کسی نعمت کو ان دو نعمتوں کے برابر کا درجہ نہیں دیا گیا۔

”تم اپنے ساتھ کیا کرنے جا رہی تھیں پڑی؟“ ماما رو رہی تھیں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو پونچھنے لگی تھی۔

”میں کم عقل ہوں اور جلد باز بھی.....؟“ وہ مسکرا رہی تھی۔

فون لے کر اس نے اپنی فرینڈز کو کالز کرنا شروع کر دی تھیں۔ وہ سب اس کی بیماری کا سن کر ہما کی چلی آئی تھیں۔ وہ اس کے لیے خوش آمدیدی لائی تھیں، لعنت نہیں۔ پھر وہ اپنے کلاس فیلوز اور لائٹ سے بات کرنے لگی، جن کے ہاتھ پتھروں سے خالی



اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

مائل کی ہاتھی اس لیکن صرف ایک ہی ہاتھی ہے۔

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"

اس نے کہا کہ "تم میں آئے والی چیزیں ان کی ہیں۔"



اما نے اس کی دھاتی ہڈی "تھپڑ مارا  
 بعد ازاں وہ صحت کی طرف لوٹ گیا اور وہ اپنے  
 "اپنے"۔

اس نے کال کر لیا اور وہاں پہنچا تو وہاں  
 ہی ادا تھا۔ وہ اپنا سر مالہ دار ہڈی کی ہڈی  
 چلیے کر رہی تھی۔ وہ ادا تھا۔ وہ اپنا سر مالہ  
 رہی تھی کہ وہ اس پر چڑھ گیا تھی۔ وہ ایک اور  
 "مسل"۔ وہ اپنا اپنی تھی۔ وہ اپنا سر مالہ  
 اس نے ہی ٹوہہ۔ وہ اس نے اپنی تھی۔ وہ  
 سالانہ اکھڑا اور اس کی تھی۔ وہ اس  
 لڑکھٹائی تھی۔

پاپا کی طرف کی مشرق تھی۔ اس نے اس  
 ہالوں کا شوق، وہ اور دکھاتا تھا اس نے تھپڑ بھی  
 اسٹائل دیا۔ یہی تو فلس کی تھی کہ اس کی تھی۔ وہ  
 وہ تھی۔ وہ اس نے ان کی تھی۔ وہ اس نے  
 "مکرون کے تھپڑ ہال نہ تھی۔" کے زمرے میں  
 آئیں۔

اور اب.....  
 اس نے تھی۔ اس نے تھی۔ اس نے تھی۔ اس نے تھی۔  
 رکڑیں۔ کیا برجن کو تھی۔ اس نے تھی۔ اس نے تھی۔  
 لکھا ہے؟ بس؟  
 ہر چیز کافی ہے۔ ہر چیز ختم ہو جانے والی  
 ہے۔

منہ پر پانی کے مچھنے مار کر وہ باہر نکلی۔ کرسی  
 سیٹ ہو چکی تھی۔ سامنے گول ٹیبل۔ کھا تھا۔ وہ تھی۔ تو  
 اس کے گرد سفید اچھان لپیٹ دیا گیا۔ اس کے  
 اس کے بالوں کو سمیٹ کر اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی میں  
 مقید کیا تو اس نے ایسی گہری آواز بھری کہ کاکت کی  
 ہر شے ایک لمحے کے لیے اس ہو گئی۔

جب آپ زندگی کی چھوٹی چھوٹی پریشانوں  
 سے گھبرا کر بددل ہو جائیں تو اس وقت اس کا سوچ  
 لیں کہ دنیا میں کہیں کوئی اپنی "زندگی" کے لیے ہی  
 پریشان ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ چھوٹے سے

۱۱۱  
 وہ پہل میں الجھتا ہو چکی تھی۔ زندگی کے  
 وہاں پر اس کے چاروں طرف دکھ رہے تھے۔  
 "مجھے تو تھا کہ میں آپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔  
 جس اب سوچتی ہوں کہ کاش میرا کوئی اور بہن بھائی  
 ہی ہوتا۔" ماما، پاپا دونوں اس کے ساتھ تھے۔  
 دونوں بہت خوش تھے۔ کیونکہ وہ خوش اور مطمئن  
 تھی۔ ماں کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنے دل میں آگ  
 خیال ان سے کہہ دیا تھا۔

"میرے دس بچے بھی ہوتے تو تمہاری بہن  
 کوئی نہیں لے سکتا تھا۔" ماں کو خیال آیا کہ وہ ان کے  
 تھارہ چلنے کے خیال سے آپ دیدہ ہے۔  
 "بھئی بھئی ہم بہت زیادہ مازار ہو کر لڑکے  
 نہیں کرتے ماما آپ کو اپنی فٹنس کی فکر تھی۔ اس لیے  
 مجھے اکلوتا رکھا۔ مجھے بلا شرکت غیر سے آپ کی محبت  
 پر فخر تھا۔ اس لیے بھی بہن بھائی کی ضد نہیں کی۔ دونوں  
 لاپٹی اور مفاد پرست بنے رہے۔ ہے نا؟" ان کی  
 آنکھیں ڈبڈبائیں۔ وہ اس کی بات سمجھ چکی تھیں۔  
 اس کے پاس ماں بھی، باپ تھا، لیکن خون کا کوئی دوسرا  
 رشتہ موجود نہیں تھا۔ اب وہ تنہا ہوئی تو اسے احساس  
 ہوا تھا کہ بہن بھائی، یہ دوا اور شفا کی طرح کام  
 کرتے ہیں۔ بیماری آدھی بیماری اس کے خاندان  
 کے لوگ تھیل جاتے ہیں۔

"میں آپ سے شکایت نہیں کر رہی۔ میں بس  
 یہ کہہ رہی ہوں کہ شاید ہم نے زندگی کی حقیقی پلاننگ  
 نہیں کرنا شروع کر دی ہے۔"  
 "پلاننگ؟" انہوں نے گہری سانس بھری۔  
 "نہان اور اس کے پلانز..... کیا ہیں؟ سب  
 ہوں۔" وہ ادا ہو گئیں۔

"ماما سنیں! ایک دم سے ہی مجھے بچے بہت  
 تھے کچھ لگے ہیں۔ میرا دل ان کی طرف کھنچا جاتا  
 ہے۔ میں انہیں بیماری یا تکلیف میں دیکھتی ہوں تو  
 دل ہلاتا ہے کہ بھوٹ بھوٹ کر رو دوں۔ ایسا پہلے تو  
 نہ تھا۔ شاید شیلے نے مجھے بدل دیا ہے۔"



سرک کی جنگ ٹرور سے بول سکتی ہیں تو زندگی کی  
جنگ ٹرور ہے۔ اس جنگ میں ایک ایک کر کے  
اپنی سب کچھ قربان کر دینا پڑے گا۔ ساتھ ساتھ  
جوار ہے۔

جب آپ اس لیے پریشان ہوں کہ آپ  
بھڑے ہیں، سوئے یا بنے ہیں۔ آپ بھڑی  
نیت میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اچھی جا بھٹکا  
حاصل کر سکتے۔ اچھے پتہ ہیں اور جو توں اور کھلیات  
سے محروم ہیں۔ غربت نہ اچھی میں پتے پتے تھک کر  
چور ہو چکے ہیں۔ اس وقت اس شخص کے بارے میں  
ضرور سوچنے کا جو اپنی سب سے ٹھیکے "زندگی"  
سے بہت زیادہ ہونے جوار ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ لوگ کام کی زیادتی  
پر شکایت کرتے ہیں۔ شکر گزار ہوں کہ آپ کا  
خیمہ اس قافلے ہے کہ آپ کام کر سکتے ہیں۔ اپنی  
تصوراتی کی قدر کریں۔ زندگی جس قدر خوب صورت  
سے گھبراہٹ کے لیے ہے۔ یہ روحانی ہے زندگی کا نام  
ہے اس پر بھی متوجہ ہیں۔ ہر اس میں شکر گزار ہوں  
جو تکلیف سے ہر اتار رہا ہے۔ حتیٰ کہ ان دنوں میں  
بھی جب آپ قہر، ہتھکڑیاں لپی چاری میں مبتلا  
ہوئے ہیں جو جان لیوا نہیں ہے۔ شکر گزار  
ہوں۔ شکر گزار ہوں اور جس شکر گزار ہوں۔"  
(ہولی پھر کے خط سے)

\*\*\*  
"الحمد للہ۔ میں کینسر کی جگہ جیتنے کے لیے  
تیار ہوں۔"

جس دن دو ہاسپٹل میں داخل ہوئی اسی دن  
اس نے اپنی بیماری کی خبر کو پیش کر دیا تھا۔  
خبر پھر سے جنگ کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔  
جوڑی میں فیشن ویک کو کور کرتی رہی تھی، وہ لڑکی  
اب ہاسپٹل کے بینہ پر ہوئی۔ اس تصور نے کچھ لوگوں  
کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور کچھ کو۔ ظاہر ہے۔ سکون  
نصیب ہوا تھا۔ اس کی شہرت نے لاقعد لوگوں کو  
اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ دشمن دشمن اب وقت کے

بدلتے ہوئے تھے۔ اس کے گرد کے جانور  
سے ڈال کر تھے۔

نیزو جھٹکا، پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا  
دعوت اس سے ملتا چلتے تھے۔ ان دنوں کی جیت  
تھے اسے لائیو لے جاتا چلتے تھے کہ وہ  
چلتے تھے۔ کینسر کے لیے کام کرنے والے  
اور این جی او ایس سے کچھ خیرات ساتھ ساتھ  
کرنے چاہتی تھیں۔ وہ لائیو اس کے، بھول نہیں  
تھے، اس نے غربت کو پار کرنا چاہتے تھے۔  
اس کی یہ لڑائی کوڑھینی شہرت چاہتے تھے۔ وہ  
گھٹے۔ مگر بے کس کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔  
ہر چیز کے لیے تھی۔ اب ہر چیز کی قیمت گتے کی تھی۔  
"کینسر" کی تھی۔

چند کینسر این جی او ایس کے علاوہ، باقی  
صرف اپنے بزنس اور فائدے کے لیے آنکرز کو رہے  
تھے۔ وہ اس بدلتی دنیا کے رنگوں کو دیکھ کر پریشان  
ہو رہی تھی۔ زمانہ قدیم میں جو پتھر کوڑھیں کو  
کرتے تھے، زمانہ جدید میں بھی ویسے ہی  
پتھر موجود تھے۔

"آپ اپنے احساسات، کیفیات، تکلیف  
جو کچھ بھی آپ محسوس کرتی ہیں وہ ہمارے لیے  
سکتی ہیں؟" امین جی او کا فائدہ اس سے پوچھ  
رہا تھا۔

"کس لیے۔۔۔ کوئی اپنی یہ لڑی یا تکلیف کو  
یادگار کیوں بنائے گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں سوشل میڈیا  
پر بہت ایسیوری ہوں لیکن اب میری دلچسپی  
سب چیزوں میں مفر ہو چکی ہے۔ میں زندگی کا ایک  
ایک لمحہ جینا چاہتی ہوں، تصویریں سچ سچ کر پوسٹ  
کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔"

"آپ تبھی نہیں مس بدی! لاری این جی او  
نان پرافٹ ادارہ ہے۔ ہمیں شہرت چاہیے،  
بزنس۔ دنیا میں لاقعد لوگ اس بیماری سے تڑپے  
ہیں۔ اس بیماری کے لیے دوا اور دعا سے زیادہ  
چیز کی سب زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔"



ہم نے یہ سب کچھ دیکھا ہے کہ غلامی کی حالت اور حالت میں ہوتی ہے۔  
اسی غلامی کا ہم نے خود کو محسوس کیا اور  
اسی غلامی کی حالت میں ہم نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔

تو وہ بھی ہے کہ میں تو اس کے لئے ہے۔

”ہر کس میں امید ہوتی ہے اور نصیب بھی ہوتا ہے۔“

وہ چوکی تھی۔ "تو آپ مجھوں پر یقین رکھتے ہیں؟"

”آپ ٹریڈنٹ نہیں کروانا چاہتی تھیں، اب  
دواری ہیں، کیا یہ مجھ کو نہیں؟ کیا آپ خدائی  
بارے یا خدائی پیغام پر ملاقات کے لیے رضا مند نہیں  
ہیں؟“ دو حیران پریشان این جی او کے نمائندے  
اسٹریٹ کیوری بھی، ایسا ہی ہوا تھا۔

”کیا ہماری اس دنیا کا ہر مگر خدا کی نشانیوں  
پیغامات سے خبر ہوا نہیں؟“ وہ یوں چورہا تھا۔

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ اس نے انکار کیا۔ اس کے سامنے فرشتہ موجود تھا۔ اس کے ساتھ فرشتہ جو تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اس کی بھلائی کے کام تھے۔ وہ اسے فلاح کی طرف پیش قدمی پر ساتے تھے۔ وہ اسے امید کے جام بھر بھر کر پلاتے تھے۔ اس سے یہ چکر کیا نشانی ہو سکتی تھی۔

”اگر میں مرتد ہوں تو۔۔۔ لوگ ناامید ہو جائیں گے۔۔۔“ وہ خوف زدہ تھی۔

”زندگی کے ساتھ کبھی ”اگر“ نہیں لگتا۔ پیدا  
 ہونے والا کبھی یہ نہیں کہہ سکتا ”اگر میں پیدا ہو گیا۔  
 اگر مجھے زندگی عطا کر دی تھی۔“ زندگی پہلا ہجر ہے  
 جو انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسے کوئی قیمت نہیں  
 لگانی پڑتی۔ زندگی موجود رہتی ہے، دو آگے بڑھ  
 جاتی ہے۔

نہ کیا آپ سمجھ رہی ہیں؟“ دو بے چارے کافی دیر

۱۰۰  
 ۱۰۱  
 ۱۰۲  
 ۱۰۳  
 ۱۰۴  
 ۱۰۵  
 ۱۰۶  
 ۱۰۷  
 ۱۰۸  
 ۱۰۹  
 ۱۱۰  
 ۱۱۱  
 ۱۱۲  
 ۱۱۳  
 ۱۱۴  
 ۱۱۵  
 ۱۱۶  
 ۱۱۷  
 ۱۱۸  
 ۱۱۹  
 ۱۲۰  
 ۱۲۱  
 ۱۲۲  
 ۱۲۳  
 ۱۲۴  
 ۱۲۵  
 ۱۲۶  
 ۱۲۷  
 ۱۲۸  
 ۱۲۹  
 ۱۳۰  
 ۱۳۱  
 ۱۳۲  
 ۱۳۳  
 ۱۳۴  
 ۱۳۵  
 ۱۳۶  
 ۱۳۷  
 ۱۳۸  
 ۱۳۹  
 ۱۴۰  
 ۱۴۱  
 ۱۴۲  
 ۱۴۳  
 ۱۴۴  
 ۱۴۵  
 ۱۴۶  
 ۱۴۷  
 ۱۴۸  
 ۱۴۹  
 ۱۵۰  
 ۱۵۱  
 ۱۵۲  
 ۱۵۳  
 ۱۵۴  
 ۱۵۵  
 ۱۵۶  
 ۱۵۷  
 ۱۵۸  
 ۱۵۹  
 ۱۶۰  
 ۱۶۱  
 ۱۶۲  
 ۱۶۳  
 ۱۶۴  
 ۱۶۵  
 ۱۶۶  
 ۱۶۷  
 ۱۶۸  
 ۱۶۹  
 ۱۷۰  
 ۱۷۱  
 ۱۷۲  
 ۱۷۳  
 ۱۷۴  
 ۱۷۵  
 ۱۷۶  
 ۱۷۷  
 ۱۷۸  
 ۱۷۹  
 ۱۸۰  
 ۱۸۱  
 ۱۸۲  
 ۱۸۳  
 ۱۸۴  
 ۱۸۵  
 ۱۸۶  
 ۱۸۷  
 ۱۸۸  
 ۱۸۹  
 ۱۹۰  
 ۱۹۱  
 ۱۹۲  
 ۱۹۳  
 ۱۹۴  
 ۱۹۵  
 ۱۹۶  
 ۱۹۷  
 ۱۹۸  
 ۱۹۹  
 ۲۰۰

موتی صوفیہ سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے فرمایا کہ میں نے  
تو بھیجا کہ تم کو تو یہ خیال ہے کہ آسمان پر شعلیں  
کی آفات مریات کسکے۔

موت امید کنند کہ جس نے جس کو بھی جس  
بنی! ہمیں لوگوں کو بھی تو سمجھا دے کہ زمین کی  
موت کا نہیں، بلکہ جینے کا ہے۔ جس کی یہ بات  
علاقہ نہیں پہنچا۔ ہر شخص کا ہے ہر حال میں  
ہے اور یہ شفا انسان کے اپنے اہم موجب سے ہے  
اس شفا کو مہرِ شفا کہہ سکتے ہیں انسان کو جبراً کہتی  
ہے، ہمیں اسے اس تجربہ سے شفا ہے، اسے وہاں  
زمین کا حصہ ہے۔ اس کو کبھی نہیں فرمادیا گیا۔  
”کیا آپ بتا کرے یہ نہیں کی؟ دوپہر چورہا

وہ ایک نیک انسان پشت کے پیچھے کمرے  
لے فرماتے ہیں کہ کون سی محبت

”اس دنیا کو اس وقت جس چہر کی بے  
زیادہ ضرورت ہے وہ ”امید“ ہے۔“ فرشتہ کہہ رہا  
تھا۔

”ہوا، پانی، خوراک، سانس سے بھی زیادہ۔  
بے چینی کی اس دنیا کو مایوسی کے گرداب سے نکلنے کی  
سخت ضرورت ہے۔ ڈپریشن، مایوسی، تا تمام  
خواہشیں، بے قراریاں، تکلیفیں، غم، بیماریاں،  
سب۔۔۔ امید کے ضرورت مند ہیں۔ دنیا بھر کے،  
مفکروں، قلم کاروں، اسکالرز کو چاہیے کہ وہ اپنے  
سب کام چھوڑ چھاذر صرف امید بانٹنے میں لگ  
جائیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ صرف امید بھری  
لوریاں گائیں۔ اس وقت بھی جب ان کے بچے کود  
سے نکل کر اپنے بچوں کو کود میں کھلانے لگیں۔



”نہرک ہے..... میں نکھوں گی.....“ وہ کہہ  
 رہی تھی۔ فرشتے کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں..... وہ  
 داغی میں مسکرا رہا تھا۔

میں فاسکرتیا میں سے باہر نکل کر اس  
دور ان دو تین بار چلتی تھی درخواست کر چکا تھی اور  
جیوں بار ڈاکٹر نے اسے یہاں رہنے کے لئے  
پرغور کیا کی کہیں گیا اس کے پاس درخواستوں  
کے بار بار اس نے درخواست کی تھی کہ  
اسے یہاں رکھنے کے لئے باہر سے لے کر جانے دو  
جائے۔

[illegible]

مختلف ہندو متوں میں ہے، ہندو متوں میں ہندو متوں میں  
ہندو متوں میں ہندو متوں میں ہندو متوں میں ہندو متوں میں  
ہندو متوں میں ہندو متوں میں ہندو متوں میں ہندو متوں میں  
ہندو متوں میں ہندو متوں میں ہندو متوں میں ہندو متوں میں  
ہندو متوں میں ہندو متوں میں ہندو متوں میں ہندو متوں میں

اُس نے اُس کو دیکھ کر کہہ دیا کہ اُس نے  
 اُس کے لئے ایک عرصہ پہلے ہی میں  
 اُس کو دیکھ کر اُس نے اُس کو دیکھ کر  
 اُس نے اُس کو دیکھ کر اُس کو دیکھ کر  
 اُس نے اُس کو دیکھ کر اُس کو دیکھ کر  
 اُس نے اُس کو دیکھ کر اُس کو دیکھ کر  
 اُس نے اُس کو دیکھ کر اُس کو دیکھ کر

لوڑیہ سڑکی بیسیوں میں ہاتھ دال کر لوڑیوں کی  
میں پروردگار سے تعلق قائم رکھنے، ہر قدم پر  
اپنی فکر پر عمل کرنے، کوڑے چمکانے، ہر قدم پر  
تعمیل۔ ہر قدم پر ایک کوڑا چال ہوتی ہے۔ ہر  
چال کا کوڑا "سٹوٹی" تھا۔ ہر کوڑا ہر سٹوٹی کے  
میں سے یونہی آتی تھی۔ یہیں اس سٹوٹی  
دوستوں کو بلا لیا تھا۔ اس کے گھر میں یونہی  
نہ نہ تو یونہی میں اپنے دامن استغنیٰ کو رہنے  
پسے اس سٹوٹی سے ملتا تھا، چونکہ چھٹی ایک کی  
تھی۔

[illegible]

”میت وین سون..... ایسے ہی سکر  
رہے تھے تھک کر کہہ۔“

جانی پھول۔ عورت کی مسکراہٹ  
 شہ نے ہنسی۔ بیویوں حوروں نے اسے لالچ  
 پھول اس نے تاک کے قریب کر لیا تھا۔  
 محض تھی وہ اب جانتا تھا کہ زندگی کی خوشبو  
 خوشبو کی طرح بیوی ہے۔ اور ان دونوں کی خوشبو  
 کائنات کے کوئے کوئے سے آتی ہے۔

لازم وغیر وہ بے یقینہ مشی کے لئے ہے۔ ان میں سے  
بعضیہ اس کے انتظار کر رہے تھے۔ ان تک آنے  
آتے رہے مٹی دار ہائے رملو کرنے، رملو ہائے



لیئے لیے اس نے کچھ کر لی۔

”جی چاہتا ہے کہ ایسی ہی ایک بڑی سی یونیورسٹی بنواؤں اور اس پر ہڈی نام لکھ کر دنیا والوں کو گفٹ کر دوں۔“ اس نے یونیورسٹی کی عمارت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور اطراف میں نظر دوڑا رہی تھی۔

”تم ہم غریبوں کو ایک ایک گھر گفٹ کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ یقین جانو میں اپنے بیوی بچوں کی پیشانیوں تک پر تمہارا نام کھدوا دوں گا۔۔۔۔۔۔ یہ بڑے بڑے حروف میں۔۔۔۔۔۔ ہڈی۔۔۔۔۔۔“ لائٹ کی بات پر بے ساختہ تہقہہ پڑا تھا۔

”بڑے بے غیرت ہو۔۔۔۔۔۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ بہت بڑا والا بے غیرت ہوں۔۔۔۔۔۔ اب تو کھرٹے کاٹا؟“ وہ سننے لگی۔

”چلو یونیورسٹی دیکھتے ہیں سر برو فیروز سے ملتے ہیں۔ آج مجھے لائبریری بھی دیکھنی ہے۔“ وہ کمزری ہو گئی۔

”کیوں لائبریری کو شرمندہ کرنا ہے؟“ وہ سب ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔ وہ ان کے آگے چل رہی تھی۔

”قہیں۔۔۔۔۔۔ خود کو۔۔۔۔۔۔ میں بھی اپنی ایک بک لکھ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔“ اس نے غر سے بتایا تھا۔

”داد کیا قسمت ہے تمہاری۔ یعنی کتابیں پڑھ پڑھ کر بوڑھے ہم ہو گئے، اور بک لکھنے کی نوبت تم پر آئی۔ مجھے تو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔“

”اپنے کولڈ میڈلز کا پسند اہٹا کر قبول کرو۔ ان تین تینوں میں، میں نے سب سے بڑی ہیں۔“ چلتے چلتے وہ اینڈی کے مل کمروں کر رہے تھے۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ اس کا ماننا تھا کہ اسے لڑائی دی جانی چاہیے۔

”پوری“ چہ۔ یعنی اتنا بڑا لیا تم نے؟ کیوں اپنے دماغ بے چارے پر اتنا بوجھ ڈالا ایڑا جس کام کا وہ مادی نہیں ہے، وہ کام اس سے لبر وستی

پہنچے ہوں گے پاس رکنا پڑا تھا۔ وہ اس ہڈی سے جھٹکتے رہے تھے جو بہت امیر، فیشن ایبل اور مشہور تھی۔ اس ہڈی سے مل رہے تھے جو بیمار تھی اور جسے بچے کا ڈاکٹر اور بے شمار مسکراہٹوں کی ضرورت تھی۔

”تمہیں ایسے گھنیا کپڑے پہن کر یونیورسٹی نہیں جانا چاہیے تھا۔“ لائٹ نے اس کے عجیب و غریب طرز کی طرف اشارہ کیا۔ ”نہ کیونے والے کیا کہیں گے، دنیا اتنی غریب ہو گئی ہے کہ مٹی کی پٹی جینز پہننے پر مجبور ہو گئی ہے۔“

اس نے تہقہہ لگایا۔ وہ آتے ہی کمر کے بل ٹھاس پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے، اب ہی تو میں امیر ہوئی ہوں۔ آج میرے پاس پورے چوبیس گھنٹے ہیں۔۔۔۔۔۔

پورے چوبیس گھنٹے۔۔۔۔۔۔ سارے ڈاکٹرز کو میں بھاڑ میں جموٹ کر آئی ہوں۔ دو ایسٹ لاکڈ کر آئی ہوں۔

نرمز کو آنکھ مار کر، ہاسپٹل کو بائے بائے کہہ آئی ہوں۔ دو گھنٹے نذر چکے ہیں۔ باقی بچے پورے یا نہیں گھنٹے۔ کیسا؟“ وہ ہاتھ اٹھا کر داؤد لینا چاہ رہی تھی۔

”گھنٹا ہے تم نے“ ان کا نام ”مودی“ دیکھ لی ہے۔ جہاں جس کے پاس جتنا وقت ہوتا ہے، وہ اتنا ہی امیر ہوتا ہے۔“

”نی المائل تو تم سب مجھ سے زیادہ امیر ہو۔“ ٹھاس پر وہ بچوں کی طرح چل رہی تھی۔

”تم ان تین تینوں میں کرنی کیا رہی ہو۔ میں تو انسٹا، فیس بک پر۔۔۔۔۔۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔ اس کا کلاس فیلو چھوڑا تھا۔

اس نے تہقہہ لگایا۔ ”خجوروں کافی ہی پوچھ لو۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہوں۔“ سفر سے اس کا مطلب تین تینوں کا سفر تھا۔ کسی کا بیک کھیٹ کر اس نے سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ ”بڑی پیاری ہوتی ہے یہ ٹھاس یارا۔“ ٹھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود سے کہا۔

”تمہیں دیکھنا غریب کھو۔۔۔۔۔۔“ لائٹ نے ہیک ٹھاس سے ہیک کیٹ نکال کر اس کی طرف اچھالی کر



کیوں کروا رہا ہے؟ کہنے کیسے نہیں تھا ہوا کا وہ موصوم۔ کتنا ہو گا اچھا بھلا فیض میں کب رہا تھا۔ یہ کہاں لگا رہا ہے۔

”سنت اپ اتم ہیٹھ مجھ سے جیاس رہے ہو۔“  
 ”اب میں تم سے حد درجہ متاثر ہو رہا ہوں۔“ کلام نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم حیران کن ہو۔ بلکہ بہت خاص ہو۔“ وہ واقعی میں بہت حیران تھا۔ وہاں موجود ہر شخص حیران تھا۔ وہ، وہ، وہ، وہ، وہ ہرٹی نہیں تھی، جسے وہ جانتے تھے۔ اپنے سے وقت میں، وہ ان سے زیادہ بے دار لگنے لگی تھی۔ اس کی چال، اس کا انداز، دنیا کو دیکھنے والی اس کی نظر، سب میں انقلاب برپا ہو چکا تھا۔

اس کے چہرے پر موصومانہ خوشی تھی۔ جس یونیورسٹی میں وہ پورے چار سال تک پڑھتی رہی تھی، اس یونیورسٹی کو وہ آج اپنے دیکھ رہی تھی جیسے یہاں پہلی بار آئی ہو۔ یونیورسٹی کی پہلی پہلی نے اس کا دل ہشاش بشاش کر دیا تھا۔ زندگی اور دنیا کی رونق انسان کے دم سے ہے۔ آواز سے، پکار سے، شور سے، تہمتوں، کچھ فکر، زیادہ بے لگاری اور جوش و خروش سے۔

وہ اپنی کلاس کی طرف جا رہی تھی کہ اسے کوریڈور میں اپنے جیسی لڑکیاں نظر آئیں۔ ایک کے سر پر کبھی، دوسری کا بغیر بالوں کا سر نمایاں تھا۔ وہ پہلے بھی یہ جان ہی نہیں پائی تھی کہ زندگی کے ساتھ ساتھ موت بھی چلتی ہے۔ تندرستی کے ساتھ ساتھ بیماری۔ پھر اپنی بیماری پر اس نے ایک دم سے زندگی کو روک کیوں لیا تھا؟ جو روح پیدا کر دی گئی ہے، اس پر بھی ”فل اسٹاپ“ نہیں لگتا۔ یہ جہاں یا وہ جہاں، سفر جاری رہتا ہے۔ سفر جاری رہتا ہے۔

کیسی بھی مشکلیں آئیں، تکلیفیں ملیں، رنج و غم کا جوار بھاء پھونے، اس جہاں میں، اس زندگی پر کبھی ”فل اسٹاپ“ نہ لگنے دیں۔ چلتے رہیں، سفر جاری رکھیں، بس چلتے رہیں۔  
 پروفیسرز سے ملنے کے بعد ان سب نے لچ

کہا تھا۔ شام کو وہ ایک چھوٹا سا تھیٹر شواہک چلے گئے تھے۔ ان کا دس لوگوں کا گروپ کئی کئی گھر رہا تھا۔ انہیں پنج کہاں کرنا ہے، کال کہاں ہے، کون سا شو دیکھنا ہے، کس پارک کو جانا ہے۔ وہ بحث کر رہے تھے، جھگڑا رہے تھے، ایک دوسرے کو ملنے دے رہے تھے اور لڑ رہے تھے۔

بھئی بس میں بیٹھے، کبھی فٹ پاتھ پر کھڑے کبھی ریٹورنٹ میں میزوں کے گرد کھڑے کھینچتے، وہ سب ہڈی اور ہڈی کی کچھ پرانی مریض تھیں۔ کچھ تصویروں کو تندر کا نشانہ بھی بنا رہے تھے وہ اسے، اس کی کچھ ایسی حرکتیں یاد دل رہے تھے، یونیورسٹی میں داخلہ رہی تھیں۔ وہ چل پھر کر، اس کا انداز اپنا کر، اس کی نظریں اتار رہے تھے۔ بس نہیں اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔

”ایک بار تم ایسا ڈریس پہن کر یونیورسٹی آئیں کہ میں چپکے سے تمہاری تصویر لیے بغیر نکل سکا تھا۔“

”اتنی اچھی لگ رہی تھی میں؟“ اپنی تعریف سن کر اسے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

”اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ میں نہیں رک رہا تھا۔ سوچا کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں، تو تم نے وہ تصویر ادھر ادھر ہارٹ دی۔“

”تم سب بہت کہنے ہو۔۔۔۔۔۔“ اس نے من لیا۔ وہ سب کافی لی رہے تھے۔ دل پر بھاری بھر پور کر انہوں نے کچھ مہنگی والی میسرےاں منگوا دی تھیں۔ ہڈی آج بھی انہیں مہنگی ہی پڑنے والی تھی۔۔۔۔۔۔ اف یہ مہنگائی۔۔۔۔۔۔ اف یہ ان کی غربت۔۔۔۔۔۔ کسی جوگر سے کم تم بھی نہیں رہیں۔

میں سر یا، آنکھوں میں سیسہ۔ حال میڈو، انداز کشی بھری۔ پتا نہیں تم امیر لوگ ایسی دلیان چیزیں کہاں سے سیکھ لیتے ہو۔ دنیا کو جوتی کی نوک پر رکھنا اور انسان کو انسان نہ سمجھنا۔ دولت تو بڑی بات ہے۔



”ہاں! ایسا ہی ہے۔“ ہڈی نے لائم سے اتفاق کر لیا۔ وہ ایسی ہی تھی، لیکن وہ اکیلی تو ایسی نہیں تھی۔ آدمی دنیا اس جیسی تھی۔ شوآف اور وہیات۔ مفرور اور بدو بارغ۔ جب میں ساری دنیا کی اتھارنی رکھ کر پوزیشن اور اسٹیشن کی دوڑ میں دوڑنے والے۔

اس کی دوستوں نے کہا کہ وہ اسے ڈراپ کر دیں گی لیکن وہ نہیں مانی تھی۔ شام چھ بجے تک وہ ان سب کے ساتھ رہی پھر وہ ان سے الگ ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی روٹ پر، بار بار بسیں بدل رہی تھی۔ چڑھتی، اترتی تھی، چلتی تھی، اٹکتی بس میں بیٹھ جاتی تھی۔ وہ دنیا کے بہت سارے مناظر کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتا جاتا ہی تھی۔ تاکہ وہ واپس جائے تو اس کے پاس یاد کرنے کے لیے بہت کچھ ہو۔

رات ہوئی تو اس نے ایک جگہ سے ڈنر کیا، دوسری جگہ سے کافی پی، تیسری جگہ سے جوس اور چوتھی جگہ بیٹھ کر وہ یہ سوچتی رہی کہ یہاں سے کیا کھائے۔ ویٹر کی گھوریاں کھانے کے بعد وہ پانی پی کر اٹھ گئی۔ راہ گیر، بسوں میں بیٹھے مسافر، ریسٹورنٹس کے ویٹرز، کوئی کی میز پر بیٹھی سرخ بالوں والی آنٹی، دھڑ دھانک کر مایوس صورت لڑکی، خون پر گرل فرینڈ سے بک جھک کر بالاکا۔ اس نے ہر منظر، ہر انسان، ہر احساس کو دل کی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اسے سب بہت اچھا لگتا تھا۔

ابھی رات کے نو بجے تھے۔ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ چلتے چلتے اسے مسجد دکھائی دی۔ پھر اس کی نظر چرچ پر پڑی۔ مسجد کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چرچ کا بھی۔ وہ چوٹی تھی۔ یہ بات آج اس کے علم میں آئی تھی کہ عبادت گاہوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اس نے مسجد کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ وہ مسجد کو اندر سے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اللہ کہاں رہتا ہے۔

”اپنے بندے کے دل میں۔“ فرشتے نے کہا تھا۔  
”وہ کیسے ملتا ہے.....؟“ اس نے بے ساختہ

☆ ☆ ☆  
وہ مسجد کو اندر سے دیکھنے کی نیت سے آئی تھی بس..... لیکن وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکی۔ ایک دم سے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ یہ اچانک ہی ہوا تھا کہ صبح سے اب تک وہ ہشاش بشاش رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس نے مسجد کے اندر قدم رکھا تھا، اس کی ساری توانائی اور پوری تکلیف اس پر آشکار ہوئی تھی۔ اس کا دل پلٹنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پیشانی کے بل گر جائے۔..... روئے..... خود کو خود دے۔

”کہو اللہ.....“ فرشتے نے کہا تھا۔

وہ چونک گئی۔ چلتے چلتے رک گئی۔

”اللہ.....“ اسے یہ نام اجنبی لگا تھا۔ کیونکہ اس نام سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نام کو پکارنے کی قوت ہی نہیں آئی تھی۔ نام سے جان کر کبھی نہیں جانتی تھی کہ ”اللہ“ کون ہے۔ نام سن کر، کہہ کر بھی، وہ اس نام سے اجنبی رہی تھی۔ ماننے بغیر یا جاننے بغیر ”اللہ“ پکارنا ایسے ہی ہے جیسے کسی سبق کا رٹا لگانا۔ ٹھیک ہے، اللہ رٹے پر بھی نمبر دے دیتا ہے، لیکن جس نے تیاری کی ہو، جان لگا دی ہو، دل لٹا دیا ہو..... اس کی تو کیا بات ہے۔

”اتنی بار کہو کہ تمہیں اس کے سوا سب لفظ بھول جائیں۔ سارا جہاں بھول جائے، یاد رہے تو بس یہ لفظ ”اللہ“۔ اللہ رحمان ہے اور یہ لفظ شفا۔ دل کا دکھی، جان کا روگی، نفس سے عاجز، درد سے یسبلا تا، کسی بھی بیماری سے بیمار، کوئی بھی، کیسا بھی، صرف اس ایک لفظ کا درد کرتا رہے تو شفا پائے گا۔

شفا کے نام پر وہ کانپ اٹھی تھی۔ دیوار کا سہارا لے کر ہانپنے لگی تھی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ سارا جہاں دکھائی دینا بند ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو ستون سے سرکا کر بیٹھے ہوئے پایا۔ آنکھوں کو بے تحاشا بھیکتے اور دل و جان کو صرف ایک نام کا درد کرتے۔



اللہ.....  
 وہ اپنا نام تک بھول گئی..... اس نے ایک لمحے  
 کے لیے بھی خود کو، خود میں نہیں پایا تھا۔  
 وہ سب سنتا ہے، لیکن اسے خاص طور پر سنتا  
 ہے، جو صرف اسے پکارتا ہے۔ وہ سب کے پاس  
 ہے لیکن اس کے پاس خاص طور پر ہے جو اس کی  
 تلاش میں ہے۔ وہ سب کو دے رہا ہے، لیکن اسے  
 خاص دے رہا ہے جو پورے یقین سے مانگ رہا  
 ہے۔ سب بیمار ہیں اور سب پریشان حال ہیں، اس  
 کا رحم سب کی تلاش میں ہے، لیکن یہ رحم اس پر خاص  
 طور پر سایہ فگن ہے، جو پر امید ہے، اور یقین رکھتا ہے  
 کہ اس کا رب اس سے غافل نہیں ہے.....  
 یقین..... صرف یقین..... اللہ کو اپنے بندے سے  
 صرف یہ ”یقین“ چاہیے۔“

آنسو آہستہ آہستہ اس کے گالوں پر پھسلنے لگے  
 تھے۔ ٹریسٹ کے تین مہینے اس نے ہر طرح کے صبر  
 کا مظاہرہ کیا تھا۔ دن کی روشنی کو اس نے اپنے آنسو  
 نہیں دکھائے تھے۔ اب تک وہ ہمت باندھ کر بیٹھی  
 رہی تھی، آج ہمت کی ساری پونلیاں اس نے یہاں  
 کھول دی تھیں..... وہ سسکنے لگی تھی۔  
 ”میں بہت تکلیف میں ہوں۔“ پھوٹ  
 پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے کہہ دیا تھا۔

رب اور بندے کا رشتہ..... یہ ازل سے ہے۔  
 اور ابد تک رہے گا۔ یہی باقی ہے..... باقی سب فانی  
 ہے..... ساری دنیا اکٹھی کر کے بیٹھ جائیں، اپنے دکھ  
 بتائیں، روئیں، چلائیں، دہائیاں دیں، اطمینان  
 نہیں ملے گا۔ ایک آنسو اپنے رب کے سامنے  
 بہا دیں خدا کا کرم، فضل، رحم، اور اطمینان..... سب  
 ہی قبول جائے گا۔

وہ رات بھر مسجد میں رہی تھی۔ فجر کے بعد مسجد  
 سے نکلی تھی۔ سڑک پر دھبی چال چلتے ہوئے وہ کسی  
 ٹیکسی کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس کا سر چکرایا تھا اور  
 خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی وہ کمری تھی.....  
 ان چوبیس گھنٹوں میں وہ ڈاکٹر کو ساتھ ساتھ

اپ ڈیٹ کرتی رہی تھی۔ فون اس کے پاس تھا۔ اس  
 سے کچھ دیر پہلے اس کی بات ہوئی تھی۔ اس کا لپٹا ہوا  
 ہو رہا تھا لیکن اس نے زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں  
 سمجھا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ وہ بھی کہ زیادہ روئے کی  
 وجہ سے ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھارہا تھا۔  
 شاید نیند نہ لسنے کی وجہ سے۔

یہ نیند کی ہی قسم تھی۔ دنیا کے جہوم سے پرست  
 وہ سڑک پر ڈھیر کی طرح پڑی تھی۔  
 ”اس کے اللہ“ کے گھر کے دروازے، اس  
 کے پیچھے ابھی بھی کھلے ہوئے تھے۔ ایسے ہی چپے  
 آسمان کے دروازے کھلے تھے۔ ایک طرف عبادت  
 کے لیے جایا جاتا ہے، اور دوسری طرف حساب  
 انعام کے لیے ”بلایا“ جاتا ہے۔ خدا کا گھر اور خدا کا  
 آسمان..... وہ ان دونوں کے درمیان تھی۔

☆☆☆  
 وہ ان سب کے درمیان کھڑی تھی۔  
 ”تم، ابھی نکلو گی یہاں سے۔“ اسے ہاتھ نہیں  
 لگایا گیا تھا، درخت کی شاخ سے دھکیلا گیا تھا کہ ابھی  
 نکلو، دفع ہو جاؤ۔  
 والد جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے تھے  
 دیسے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ پھر اپنے پورے  
 خاندان پر نظر دوڑائی۔ وہاں بچا ہی کون تھا جو اسے  
 زندہ دکھائی دیتا۔

”ایک بار آپ نے مجھے اپنی قسم دی تھی۔“  
 باپ کے پاس آئی تھی۔  
 ”آج میں آپ کو اپنی قسم دیتی ہوں۔ میری قسم  
 ہے آپ کو والد ابھی گھائیوں کی طرف مت آجے  
 گا۔“ اس نے ایک آخری بار باپ کا ہاتھ پکڑ کر  
 آنکھوں سے لگانا چاہا اور لگا لیا۔  
 انہوں نے جھٹک کر اپنا ہاتھ اس سے الگ  
 کیا۔

”ایسے نہ کہو دیسا۔“  
 ”نہ میرا حال پوچھئے، نہ اپنا حال بتانے نہ  
 میری صورت دیکھئے، نہ اپنی صورت دکھانے۔“







بہرے دیجاتی ہیں۔

[illegible]

یہ کتاب رقی کی ہے۔ مجھے مجھے سیدہ  
تقی س کی بیٹی کا ترجمہ ہے۔ یہ وہ ہے  
جسے راقیہ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔  
یہ بھی اس کی بیٹی کے ہاتھ سے لکھا ہے۔  
یہ ان کی بیٹی کے ہاتھ سے لکھا ہے۔  
یہ ان کی بیٹی کے ہاتھ سے لکھا ہے۔

[illegible]

والہ شکر کے سحر زریں میں سے خف نور  
شکر کے چہ بڑے غمزدہں میں سے ایک نور  
گم تریں اس کا گھر تھیں۔ چوں کہ تھیں  
بیت، قداقت کے ڈیر اس کا گھر تھیں  
سبک، چار یک عام، بد روز گھر تھیں۔  
فیضیوں کی آواز میں اور قد میں کا گھر تھیں

۷۸





وہ حق دار نہیں تھے۔ بچی موت..... تو وہ اس نعمت کے انتظار میں آنکھیں بچھا کر رکھتے تھے۔

اس کے حسن کو کھن لگ چکا تھا۔ وہ مری نہیں تھی اور زندہ بھی نہیں رہی تھی۔ دن کی روشنی میں وہ اپنے جسم پر پڑنے والے داغ دیکھتی رہتی تھی۔ اپنا جسم، اپنے ہاتھ پاؤں۔ پانی میں اپنا عکس دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی تھی۔ اس نے اپنے حسن پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ پھر بھی..... اس کا حسن خاک ہو رہا تھا۔ کوزہ جیوں کو عبادت کی اجازت نہیں تھی۔ وہ بد بخت اور لعنتی تھے۔ خدا کی طرف سے دھتکارے ہوئے۔ وہ اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ وہ بھیک مانگتے تھے تو اپنے مگناہ کے نام پر جس کی وجہ سے انہیں کوزہ نصیب ہوا تھا۔ خدا کے نام پر نہیں۔

اگلے دن صبح، والد پاگوں کی طرح گھائیوں سے کچھ دور دیسا دیسا چلاتے، بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔

”میں نے تمہاری دی قسم نہیں توڑی دیسا! میں گھائیوں سے بہت دُور کھڑا ہوں۔ تم نے کہا تھا میں تمہاری صورت نہ دیکھوں، اپنے باپ کو اپنی آواز سنا دو..... دیسا..... تمہارا باپ مر جائے گا.....“

”اپنے باپ سے تو مل لو دیسا.....“ اسے وہاں دیکھ کر ہر آنکھ رو دیتی تھی۔ ضعیفہ کچھ زیادہ ہی آب دیدہ تھی۔

”آج مل لیا تو وہ ہر روز یہاں آیا کریں گے۔ وہ یہیں رہ جائیں گے۔ لوگوں کے طعنے ان کا سینہ چھلنی کرتے ہوں گے۔ میرا گناہ، ان کی سزا بن چکا ہے۔ گھائیوں کو میں ان کے لیے جہنم نہیں بنے دوں گی۔“ اس نے کیلی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا تھا۔ والد کی آواز کی گونج اسے تکلیف دے رہی تھی۔ دنیا جہان کے پہاڑ اس نے اپنے سینے پر رکھ لیے تھے۔ باپ کی آواز کا کٹاؤ وہ سہہ نہیں پار رہی تھی۔ وہ سرنگ میں اتنی دور چلی گئی تھی کہ اسے والد کی آواز

سے ذرا دور ختم مٹی تھیں۔ شاید ان لوگوں تک شہر کے لوگوں کا شور نہ پہنچ چکا تھا۔ یا پھر ان کی بیماری زدہ حس نے انہیں بتا دیا تھا کہ ایک اور بد بخت، نامراد ہو کر ان کے ساتھ رہنے کے لیے آچکا ہے۔

خوف دل پر حاوی تھا، سہم سے سانس تنگ تھی۔ پتھر کی ڈھلان پر جبکہ کر کھڑی وہ پتھر ہو چکی تھی۔ وہ ان سب کے غلیظ پیر دیکھ رہی تھی۔ بد بودار لبادے، زخم خوردہ کھالیں۔

”یا خدایا..... دیسا.....“ ضعیفہ نے جیسے اپنا سینہ پیٹ لیا تھا۔ اس پر ہلکی مری تھی۔

اس نے سر اٹھایا۔ آگے پیچھے کھڑے کوزہ جیوں کو دیکھا۔

”ہاں دیسا..... لعنتی دیسا.....“ سر کو پتھر سے ٹکرا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆☆☆

شہر والوں نے اسے نکال دیا، وہ شہر سے نکل گئی۔ وہ اسے بھول گئے، وہ بھی انہیں بھول گئی۔ اس کا ذکر، قصہ کہانی بن گیا۔ اس کا نام ناپاک کہلایا۔ اس کا انجام عبرت ناک قرار پایا..... یہ زمانہ..... یہ لوگ..... یہ وقت کی چال..... یہ اوپر والے کا کھیل.....

وہ تاریک غار نما سرنگ میں ضعیفہ کے ٹھکانے میں پڑی رہتی تھی۔ ساری دنیا اس کے لیے خاک ہو چکی تھی۔ اس نے خدا سے یہ سوال بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ وہ بالکل خاموش ہو چکی تھی۔ اس کے شہر اور آس پاس کے شہروں کے کوزہ جی ان ہی گھائیوں میں رہتے تھے۔ یہ کوزہ جیوں کا چھوٹا سا شہر تھا۔ اگر کہا جائے کہ زندہ تو ہاں وہ یہاں زندہ رہتے تھے۔

زندگی پر تو تندرست انسانوں کا حق تھا اور وہ کوزہ جی تھے، اس لیے موت پر اپنا پورا حق جما کر، اس کے انتظار میں کھڑیاں، وہ یہیں کھنٹے تھے۔ زندگی پر ان کا بس اتنا ہی حق تھا کہ وہ بھیک مانگتے تھے اور وہیں تو ایک لقمہ کھا لیتے تھے۔ دوا تھی نہیں، شفا کے



سنائی دینا بند ہو گئی تھی۔

”دبیسا نے کہا ہے کہ اگر آپ دوبارہ یہاں آئے تو وہ سمندر میں کود کر اپنی جان دے دے گی۔“  
ضعیف نے دبیسا کا پیغام والد تک پہنچا دیا تھا۔

”اس نے کہا ہے کہ وہ اپنی زبان کی ایسی پکی ہے، کہ آپ کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دی تو وہ کود جائے گی۔“

”میری جان لے لی اس نے..... اب اپنی جان لے کر کیا کرے گی۔“ والد زریب بڑبڑائے۔  
انہوں نے آس پاس پڑے پتھر چٹا شروع کر دیے تھے کہ اگر ان کی دبیسا یہاں سے گزرے، اور کوئی اسے پتھر مارنا چاہے تو کسی کو اسے مارنے کے لیے پتھر نہ ملیں۔

انہوں نے زریب دبیسا، دبیسا کی تکرار شروع کر دی تھی، نہ کرتے تو سانس کیسے لیتے۔

☆☆☆

”دیکھو تمہارا پرندہ آیا ہے۔“

ضعیف نے دبیسا کو پرندے کی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا۔ چادر کو منہ تک اوڑھ کر وہ پتھر پٹی زمین پر پچھی خشک گھاس پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں مردوں کی طرح اندر کودھن چکی تھیں۔ جسم کی کھال کا وہ حال ہو چکا تھا کہ اسے دیکھ کر کھن آتی تھی۔

”تمہارا پرندہ تم سے ملنا چاہتا ہے.....“ اس نے پھر کہا۔

”تم ہر روز میرا سر کیوں کھاتی ہو؟ کیا اس جہنم میں بھی مجھے سکون نہیں ملے گا۔“

”سکون انسان کے اندر ہوتا ہے دبیسا! اگر اسے اندر سے سکون نہ ملے تو کہیں سے نہیں ملتا۔ ٹھیک ہے ہم پر خدا کی لعنت پڑ چکی ہے، لیکن اس کے باوجود، جیسے کوئی میرے اندر کہتا ہے کہ روئے زمین پر موجود سب انسانوں میں، میں خدا کی رحمت کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ میری روح سے صدائیں اٹھتی ہیں کہ خدا ہم پر کسی بھی دوسرے انسان سے زیادہ مہربان ہے۔“

دبیسا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”او خدا! ہمیں کوڑھ دے کر شفا دینا بھول گیا ہے۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”چھوڑو اسراٹھا کر اپنے پرندے کو دیکھو۔ کیا خوب صورت اور جوشیلا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ تمہارا فرشتہ ہے۔ تمہیں خدا کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ ہمارے پاس خوش ہونے کے کتنے عمدہ دیوانے ہیں دبیسا! یہ پرندہ ہر روز تمہارے سر پر آ کر مڑلاتا ہے۔ کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو سکتیں کہ یہ تمہارا دیوانہ ہے۔ جہاں انسان ہمیں دیکھتے ہی پتھر مارنے لگتے ہیں، یہ تمہیں دیکھتے ہی دیوانہ وار اپنے پر پھڑپھڑانے لگتا ہے۔ تم تو ابھی بھی بہت خوش قسمت ہو، مجھے دیکھو، میرا سایہ پڑتے ہی حشرات تک بھاگ جاتے ہیں۔“ اس نے اتنا کہہ کر قہقہہ لگایا۔

اس نے سراٹھا کر پرندے کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ وہی پرندہ ہے جس کے پیچھے وہ گھومتا باہر کی طرف بھاگی تھی۔ سب کہتے تھے کہ وہ دبیسا کا پرندہ ہے۔

”تمہیں کیسے پتا کہ یہ میرا ہی پرندہ ہے؟“ آج اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

”جو جس کا ہوتا ہے وہ دکھائی دے جاتا ہے۔ جیسے یہ زمین ہماری نہیں ہے لیکن ذرا سراٹھا کر دیکھو، وہ آسمان ہمارا ہے۔ اپنی چیز، اپنی طرف ہوتی ہے دبیسا! کیا تمہیں آسمان اپنی طرف نہیں کھینچتا؟“

دبیسا نے سراٹھا کر دیکھا۔ کتنی ہی دیر تک اوپر دیکھتی رہی تھی۔ پھر پرندہ اس کی نظر کی سمت میں اڑنے لگا تھا۔

”کیا تمہیں آسمان اپنی طرف نہیں کھینچتا؟“ پرندہ بھی یہی پوچھ رہا تھا۔

”خدا اس بندے پر لعنت کیسے بھیج سکتا ہے، جس کا وہ واحد ”خالق“ ہو؟“ وہ زریب بڑبڑاتی تھی۔ سوال سے ہی سہی، اس نے خدا سے کام لیا شروع کر دیا تھا۔ پرندے نے ہوا میں جوش سے ترپھی اڑان بھری۔ وہ خوش تھا۔ اس کے سر کے لہرے



انہی کے بچے۔۔۔ وہ سفید تھا۔ حضرت نوح  
کے بیسے پرندے کی طرح، جو کبھی سے زندگی کی نوید  
پلنے لگا تھا اور چونک میں سبزہ لیے، بامراد واپس پلٹا

اس کا پرندہ۔۔۔ وہ بھی بامراد واپس پلٹنے والا

☆☆☆

دنیا کے ہر انسان کا، پوری زمین پر پورا حق تھا  
لیکن ان جیسے پیادوں کا صرف اس تاریک، نوکیلے،  
بدبودار حصے پر حق تھا۔ رزق حلال پر بھی ان کا حق  
نہیں رہا تھا کیونکہ انہیں کوئی کام کیوں دے گا؟ وہ  
ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ سکتے تھے۔۔۔ انہیں خیرات  
نہیں دی جائے گی، ان کی امداد نہیں کی جائے گی،  
کیونکہ وہ خدا کی طرف سے پھنکارے گئے تھے۔

وہ بازار میں خرید و فروخت نہیں کر سکتے تھے۔  
انہیں کوڑا کرکٹ میں سے چیزیں چھنی پڑتی تھیں۔  
وہ کسی صحت مند انسان کا راستہ نہیں کاٹیں گے۔ ہوا  
کے مخالف سمت چلیں گے۔ مخصوص کپڑے پہنیں  
گے، گھنٹیوں کا شور کیے بغیر نہیں چلیں گے، خدا پر اپنا  
حق نہیں جتائیں گے، اسے پکارنے کی جرات نہیں  
کریں گے۔ بد بخت۔

وہ ضعیف تھا اور بھوک سے مجبور ہو کر سرائے کی  
طرف گیا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر سے اس کے ہاتھ کچھ  
نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں کیسے وہ ایک بچے سے ٹکرا گیا  
تھا۔ بچہ اس کے جسم کے نیچے دب گیا تھا۔ بچے کی  
چینوں سے سارا شہر لرز اٹھا تھا۔ اسے بچے کی جان  
اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر  
بچے سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک کوڑھی سی تو  
چاہتا تھا کہ اب اس کے بعد کوئی اور کوڑھی نہ ہو۔

جب وہ لوٹا تھا تو زخموں سے چور اور لہو لہان  
تھا۔ سب سے بری حالت اس کی آنکھ کی تھی، جو پتھر  
کی ضرب سے پھوڑ دی گئی تھی۔ ضبط کے سب سمندر  
نی مکنے کے باوجود وہ درد سے بلہا رہا تھا۔ گھائیاں  
اس کی کراہوں سے گونج رہی تھیں۔

باقی سب چکے چکے اپنے آنسو صاف کر رہے  
تھے۔ دو ان کے پاس کہاں ہوتی تھی۔ ان کے پاس  
تو ”دعا“ بھی نہیں رہی تھی۔ دیسا اونچی گھائی پر بیٹھی  
سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ بوڑھے کا  
واویلا چپ چاپ سنتی رہی تھی۔ یہ تو ہر روز کا معمول  
تھا، کوئی نہ کوئی ایسے ہی بلہانا ہوا واپس آتا تھا۔ وہ  
تکلیف کے سمندر میں غرق تھے، ان کے پانیوں میں  
پتھر پڑتے ہی رہتے تھے۔ وہ کراہتے، روتے،  
بلہاتے ہی رہتے تھے۔

بہت دیر بعد وہ نیچے اتری تھی۔ بوڑھے کی  
حالت دیکھ کر اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔  
”کیا ہوا؟“ وہ گھنٹوں کے بل، پتھر ملی زمین  
پر بوڑھے کے بستر کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ایک گندی  
سی پٹی اس نے اپنی آنکھ پر لپیٹ لی تھی۔ لیکن خون تھا  
کہہ رکھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تکلیف تھی کہ بے  
چارے کو کسی بل چین نہیں تھا۔

”میں نے پوچھا کیا ہوا؟“ وہ پوری قوت سے  
چلائی تھی۔ وہ سب جانتی تھی کیا ہوا ہو گا لیکن پھر بھی  
پوچھ رہی تھی۔

”تم اندھی تو نہیں ہو۔ نظر نہیں آ رہا کیا۔۔۔“  
ضعیف کو اس کے چلانے پر غصہ آ گیا تھا۔

”آپ نے وہی پتھر اٹھا کر ان کے سروں پر  
کیوں نہیں دے مارا؟“ وہ بیزک انھی تھی۔ غصے کی  
زیادتی سے کانپنے لگی تھی۔

سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ بھلا  
ایسی بات بھی وہاں کوئی کرتا تھا۔

”دوبارہ یہاں کوئی پتھر کھا کر واپس نہیں آئے  
گا۔۔۔ سن لیں سب۔۔۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر لٹکار کر  
کہا۔

پرندہ پوری شدت سے اپنے پر پھڑپھڑانے لگا  
تھا۔ زمانے گزر گئے تھے، پرانی دیسا اب زندہ ہوئی  
تھی۔ پرندہ گھائوں سے نکل کر شہر کی طرف جا رہا  
تھا۔ دیسا نے پرندے کو شہر کی طرف جاتے  
ہوئے دیکھا تو دمک رہ گئی۔ وہ اس طرف نہیں جاتا



جانتی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ چکی تھی۔ پھر اس نے اپنے قدم ہلکا پرندے کے پیچھے پیچھے بڑھا دیے۔  
ضعیفہ اسے روکتی رہ گئی تھی لیکن وہ چادر کو سر پر سمجھ کر شہر کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ سارے شہر کو آگ لگا دے گی۔ پتھر مار مار کر، ایک ایک کا سر پھوڑ دے گی۔

”بوڑھے کو کس نے مارا ہے؟“ وہ چلا کر پوچھ رہی تھی۔ سرائے سے آدمی باہر نکل آئے تھے۔ اس نے منہ تک چادر نہیں کھینچی ہوئی تھی۔ اس کی گھنٹیاں بھی غائب تھیں۔ وہ ہوا کے رخ پر کھڑی تھی۔۔۔۔۔ سامنے۔۔۔۔۔

”تمہارے باپ کی وجہ سے تمہارا لحاظ کیا جاتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم شہر میں دغا دہانی پھرو۔ ابھی تجھی عقل ٹھکانے نہیں آئی تمہاری۔“ وہ سب اپنی ناک پر ہاتھ رکھ چکے تھے۔

”میری عقل ٹھکانے آ چکی ہے، تمہارا ایمان ٹھکانے آنے والا ہے۔ میں اس انسان کا سر چل کر رکھ دوں گی جس نے اس بوڑھے کی آنکھ پھوڑی ہے۔ میں کوڑھی ہوں، اپنے منہ سے ایک ایک کو کاٹ کر، اپنی طرح کا کوڑھی گردوں گی۔ پتھر مارنے والے تمہارے بچوں کی گردنوں میں دانت گاڑ دوں گی۔ خون پی جاؤں گی سب کا۔۔۔۔۔ یاد رکھنا۔۔۔۔۔ میرا نام یاد رکھنا۔۔۔۔۔ دیسا۔۔۔۔۔“ اس نے بڑھ کر ذرا دور کھڑے ایک بچے کا ہاتھ دبوچ لیا تھا۔

”ہم نے رحم دلی کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔۔۔۔۔ اگر تم پتھر مارو گے تو ہم بھی ماریں گے۔ تم خدا کے پیارے ہو، تو ہم خدا کی طرف سے پھنکارے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سب ایسے ہے تو، پھر یہ ایسے ہی ہو گا۔“ اس نے منہ کھول کر بچے کا ہاتھ دانتوں سے کاٹنا چاہا تو اس کا باپ چلا اٹھا۔

”بد بخت امیرے بچے کو چھوڑ دے۔“ وہ بلبلاتا تھا۔

وہ ہنسی اور اس نے جھٹک کر بچے کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”دوبارہ یہاں سے پھر آئے، تو میں آگ لے کر آؤں گی۔۔۔۔۔ کوڑھ کی آگ۔۔۔۔۔ جلا کر راکھ کر دوں گی۔۔۔۔۔ اپنی زبانیں انگارہ بنی رکھو، لیکن ہاتھ باندھ لو۔ بھیک نہ دو اور ذلت بھی روک لو۔ نرم نہ کرو اور انسانیت کا کھوکھلا نقاب اوڑھ لو۔۔۔۔۔ مجھے جان سے مار دو۔۔۔۔۔ لیکن یہ یاد رکھو، اب اگر کسی کوڑھی پر ہاتھ اٹھا، تو میں وہ ہاتھ کاٹ کر لے جاؤں گی۔“

کتنے ہی لوگوں نے بھڑک کر اسے پتھر مارنے چاہے تھے، وہ اسے ڈرانا چاہتے تھے، لیکن وہ دیسا تھی، اس کی آواز کی گونج ان کے دل دہلا رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ واقعی میں ان کی گردنیں کاٹ لے گی۔ وہ ان کے سینوں سے دل نوچ لے گی۔ جیسے وہ بات کر رہی تھی، اس کی دہشت بتا رہی تھی، وہ ایک ایک کو کوڑھی کر دے گی۔

”میں خدا کا عذاب ہوں نا۔۔۔۔۔ اب اس عذاب میں، میں تمہیں بھی حصہ دار بناؤں گی۔۔۔۔۔“ کہہ کر وہ شہر سے باہر آ گئی تھی۔ اس کا دکھ اور غصہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایک کوڑھ۔۔۔۔۔ بس ایک بیماری۔۔۔۔۔ اور ساری دنیا شیطان بن گئی تھی، سارا جہاں جہنم بنا دیا گیا تھا۔ بیماری پران کا اختیار نہیں تھا، اور رحم پران بے رحموں کا۔

وہ واپس آئی تو بوڑھے کے برسر کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ زخموں سے اتنا چور چور نہیں تھا، جتنا اپنی بدھن سے تھا۔ وہ خون کے آنسو رو رہا تھا۔ دیسا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا جیسے وہ والد کا پکڑا کرتی تھی۔ اس کی محبت کے ایسے اظہار پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ آنسوؤں کا گولہ دیسا کے حلق میں پھنس گیا تھا اور ٹھیک اسی وقت دیسا کا پرندہ اس کے شانے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ دیسا نے سر کو ذرا سا ٹھم دے کر اسے دیکھا۔ اس نے اپنا پر لہرایا تو وہ دیسا کے کیلے کال سے ٹکرایا۔

بے رحموں کی زمین پر ”رحم کا پرندہ“ وہ دیسا کو خدائی پیغام دینے جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆  
”خدا ہمارا کیوں نہیں رہا۔ اس نے ہمیں چھوڑ



کیوں دیا؟

وہ کئی سے ہنس دئی۔ ”ذہانت، عقل و شعور جرات..... یہ سب خواب تھے جو میں نے بھی دیکھے تھے۔“

بدلتی پھرازا تھا۔ دور آسمان پر پرندوں کے غول کے غول کسی ایک جگہ کی طرف بچنے چلے آ رہے تھے۔ وہ اتنے زیادہ تھے کہ سارے آسمان پر چھا گئے تھے۔ بدلتی بھی اسی طرف گیا تھا۔  
”جاؤ اپنے بدلتی کے پیچھے.....“ ضعیف نے ہنس کر کہا۔

”نکل جاؤ اس کے ساتھ آوارہ گردی کرنے۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اس طرف کوئی جانور مر گیا تھا، جس کے گرد پرندوں کے غول کے غول منڈلا رہے تھے۔ قدم قدم وہ اس طرف جا رہی تھی۔ پہلے وہ بلند پرندوں پر چڑھی، پھر ڈھلان اترنے لگی تھی۔ کچھ پرندے زمین پر اتر رہے تھے، کچھ ہوا میں دائروں میں چکرا رہے تھے۔ سارا داویلا نیچے ڈھلان پر چھا تھا۔ بدلتی اسے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ اس کی طرف پہنچی تھی..... اور ڈھلان اترتے اترتے ایک دم رک گئی۔

جس کی آنکھ چھوڑی گئی تھی، وہ زندگی سے من موڑ کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند چکا تھا۔

وہ گہرا سانس کھینچ کر بوڑھے کے قریب آئی۔ جو جیتے جی مرا تھا، اب وہ واقعی میں مر چکا تھا۔ بھلا ایک کوڑھی کے مرنے پر پرندوں کی آمد کا کیا مقصد تھا۔ اتنا داویلا کس لیے؟ زمین جو اس کی سانسیں پر ٹپکتی تھی، اب اس کے مردہ وجود پر بھی ٹپکتی رہے گی۔ چپ چاپ کھڑی وہ کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔

اس کی آنکھیں بند تھیں، سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا، اس کے زخموں سے خون رستا ہوا تھا، لیکن اب اس کے انہی زخموں سے سکون برس رہا تھا۔ ابدی سکون دنیا میں اس وقت کہیں تھا، تو وہ بوڑھے کے مردہ چہرے پر تھا۔ وہ اتنا خوش دکھائی دیتا تھا، جتنا

یہ سوال، اس نے آنے والے ہر دن خود سے کیا تھا۔ غار کے دلانے پر بیٹھ کر، سرنگ کی تاریکیوں میں بھٹک کر، سمندر کی ہوا کے تھپڑے کھا کر، دھوپ کی ٹپس سہہ کر، رات کی تنہائی اور دن کی سختیاں جھیل کر۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، یہ سوال اس کے اندر چٹکاری سے آگ بٹاتا جا رہا تھا۔ ساری دنیا نے اسے چھوڑ دیا لیکن خدا نے کیوں چھوڑا..... دنیا سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، لیکن خدا تو اس کا تھا۔

دن کے پہرے، رات کے پہرے، اس نے اپنی پوری ہستی اس سوال میں ڈھال دی تھی۔ اسے کوڑھ سے شفا نہ ملے لیکن اس سوال کا جواب مل جائے۔ جس خدا نے اسے اپنا بندہ بنایا..... پھر اس نے اسے لعنتی کیوں بنادیا؟

اسے پتھروں سے سر جوڑ کر بیٹھنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ سر کے پیچھے زخم بن چکے تھے۔ نہ وہ عادت چھوڑ رہی تھی، نہ زخم مندمل ہو رہے تھے۔ ان کے زخم ویسے بھی مندمل نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس دن بھی وہ ایک تنگ منہ والے غار کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا پرندہ اس کے شانے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”تم بھی بالکل مجھ پر مئے ہو۔ ہر وقت آوارہ گردی کرتے رہتے ہو۔“

”پر تم تو یہاں پتھروں سے سر جوڑ کر بیٹھی رہتی ہو۔“ ضعیف نے مذاقاً کہا۔

اس نے انگلی سے اپنا سر ٹھوکا۔ ”یہاں..... یہاں سے میں پتا نہیں کہاں کہاں پہنچ جاتی ہوں۔“  
”تو پھر تمہارے پرندے کو بھی ویسا کہنا چاہیے.....“

وہ ذرا سا چوکی۔ ”مجھے اس کے اشارے پرندے ہیں، یہ اچھے راستے دکھاتا ہے۔ میرا خیال ہے اسے ”بدلتی“ کہنا چاہیے.....“

”بدلتی..... اچھا نام ہے..... راستہ دکھانے والا۔ واہ تمہاری ذہانت اٹ آئی ہے۔“



ساری دنیا مل کر بھی اسے نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کی موت کی ایک ایک نثانی گواہی دے رہی تھی کہ اسے دنیا سے رہائی نہیں ملی۔

”اسے خدا مل گیا ہے۔“

کھڑے کھڑے دیسا نے آس پاس نظر دوڑائی۔ اس روشنی پر جو بوڑھے کے مردہ وجود پر بڑی تھی۔ اس زمین پر جو ابھی بھی دلدل نہیں بنی تھی۔ اس ہوا پر جو ایک زندہ کوڑھی اور مردہ کوڑھی پر ہمیشہ کی طرح مہربان تھی۔ اگر خدا انہیں چھوڑ چکا تھا، تو اس نے ان کی ہوا کیوں نہیں چھین لی؟ ان کی روشنی؟ اگر وہ ایسے ہی بد بخت تھے تو ان کے بد بخت دل آسمان کی طرف کیوں کھینچے تھے؟ اگر وہ ایسے ہی ناپاک تھے، تو ان کے ناپاک دلوں سے ”خدا“ کا نام مٹ کیوں نہیں گیا تھا؟ شیطان پر جب لعنت بھیجی گئی تھی تو اسے تو یہی توفیق سے ہی خارج کر دیا گیا تھا، ان پر لعنت بھیجی گئی تھی تو بھی..... تو بھی..... وہ گھٹنوں کے بل جھک کر بوڑھے کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا مردہ ہاتھ تھام لیا۔

”اگر خدا نے واقعی ہمیں چھوڑ دیا ہے، تو اس نے ہم کوڑھیوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے لیے رحم سے کیوں بھر دیا ہے۔ اس نے ہمیں ایک دوسرے کا سہارا کیوں بنا دیا ہے۔ ہماری ناپاک روحوں کو اس نے، رحم کی پاکیزگی سے کیوں نوازا ہے؟“ وہ سسکنے لگی تھی۔ بوڑھے کی موت پر نہیں، اپنے سوال کی زندگی پر۔

اسے تمام سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ زمین پر بھی ہر شے، آسمان تک بلند ہر شے نے اسے جواب دے دیا تھا۔

”خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا..... بلکہ اس نے ہمیں اپنے قریب کر لیا ہے۔“ وہ بھاگ کر گھائیوں میں واپس آئی اور اس نے چلا کر کہا۔ وہ سب اپنے اپنے گھکانوں پر کھڑے اسے حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

”ہماری زبانیں ناپاک ہیں، نہ ہماری روئیں

غلط ہیں۔ ہم لعنتی ہیں نہ بد بختی ہمارا مقدر ہے..... یہ ان انسانوں.....“ اس نے شہر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ان انسانوں کی بتائی قصہ کہانیاں ہیں۔ یہ ان کی اور ہماری آزمائش ہے۔ وہ اپنی آزمائش میں تالاق رہے، ہم اپنی آزمائش میں صابر رہے۔ دیکھو سورج کو، جو ہماری رات کو صبح میں بدلتا ہے۔ اس ہوا کو محسوس کرو، جو ہمارے زخموں کو سہلاتی ہے اور نیند..... ہماری آنکھوں سے نیند جدا نہیں ہوئی..... اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ”نیند“ ہمارے نبیوں نے ہمیں سکھایا کہ اللہ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی ”نیند“ ہے۔ خدا نے ہم سے کچھ نہیں چھینا..... جو کیا..... اس زمین کے انسانوں نے کیا۔“

”لیکن اس نے ہماری تندرستی چھین کر اسے بیماری میں بدل دیا۔“

وہ بھاگ کر ضعیفہ کے پاس آئی تھی۔ ”یاد کرو، تم نے مجھے خدا کی مرضی زمین پر لانے کے لیے کہا تھا۔ پھر یہ بات تم خود ہی بھول گئیں۔ خدا کے حکم سے یہ بات تمہارے منہ سے نکلی تھی۔ یہ خدائی اشارہ ہے..... یہ سب خدائی اشارے ہیں۔ اس آسمان کا خدا کل جمعی ہمارا تھا اور آج بھی ہمارا ہے۔“ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ دینی دیسا بن چکی تھی جو والد کے ہاتھ پاندھا کرتی تھی اور جو والد کو ناامیدی سے ڈرایا کرتی تھی۔

”آؤ سب مل کر اپنے رب کو پکاریں کیونکہ وہ بھی چاہتا ہے۔ اپنی چاہت کے لیے اس نے ہمیں چنا ہے۔ ہمیں دنیا سے الگ کر کے، ہماری روحوں کو رحم سے بھر کر، ہمیں تکلیف سے گزار کر، ہمیں خاک سے نور کر کے، ہمیں بدتر سے بلند کر کے، ہمیں کوڑھ سے اپنے قریب کر کے..... وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے پکاریں..... ہمارے رب نے ہمیں چنا ہے۔ ہمیں اس کے انتخاب پر شکر ادا کرنا ہے۔“

سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اتنی خوش تھی کہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔



”آؤ اسے ایسے پکاریں کہ اس کی مرضی،  
ہمارے لیے معجزہ بن جائے۔ کوڑھ کو شفا اور ہمیں  
ہمارا ”خدا“ مل جائے۔“

☆☆☆

”امید یقین میں اور یقین معجزوں میں بدلتے  
ہیں ہڈی!“ فرشتہ کہہ رہا تھا۔

”اللہ نے میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کیا؟“  
ہوش میں آنے کے بعد اس نے پہلا سوال کیا تھا۔

وہ مسجد جا چکی تھی۔ تین دن کو ما میں رہنے کے  
بعد وہ ہوش میں آئی تھی۔ تین ہفتے..... وہ اس اور

اُس زندگی کے درمیان رہی تھی۔ اور ایک دن اللہ  
سے قریب رہنے کے بعد، وہ اس سے دس قدم دور ہو

چکی تھی۔ تکلیف ملتی ہے تو پہلا سوال ”کیوں“  
ہوتا ہے۔ ”میں ہی کیوں“ تجھ پر ہی کیوں؟

”تم اتنی آسائشوں میں پیدا ہوئیں۔ جنہیں  
دنیا جہاں کی نعمتیں، راحتیں میسر رہیں۔ تم پوری طرح

سے تندرست رہیں، تب تم نے اللہ سے سوال کیا کہ  
اس نے تمہیں اتنا کچھ کس لیے دیا؟ اور کیوں؟ جو

انسان ناشکری کرتا ہے، براہ نہیں ہے، براہ ہے جو  
کبھی شکر گزار ہی نہیں ہوا۔“

”کیا تکلیفیں زندگی کی قیمت ہیں؟“ وہ سکتے  
ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس کی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔

”کیا راحتیں زندگی کی حقیقت ہیں؟“ وہ بھی  
پوچھ رہا تھا۔

وہ شکایتی انداز سے فرشتے کو دیکھ رہی تھی۔  
”کیا انسان تکلیف پر رد بھی نہیں سکتا۔“

”روئے اور دوا لیے میں فرق ہوتا ہے۔“  
”میں کبھی مذہبی نہیں رہی۔ کیا یہ اس کی سزا

ہے..... کیا..... کیا میں کافر اور گناہ گار ہوں؟ یہ اس  
سب کی سزا ہے؟“

فرشتے نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تم نے  
ایسی خوب بات کہاں سے سیکھی؟“

وہ جھجکی تھی۔ ”مسجد میں کچھ لڑکیوں نے مجھے  
پہچان لیا تھا۔ ان کی باتیں میں نے سن لی تھیں۔ وہ

کہہ رہی تھیں کہ میں بھٹکی ہوئی ہوں۔ میں کافر اور  
گناہ گاہ ہوں۔ اللہ نے مجھے میرے اعمال کی سزا دی  
ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر بندہ اپنے رب کی طرف  
سیدھی طرح سے نہ آئے تو اسے طوعاً و کرہاً آنا  
پڑتا ہے..... اور کینسر مجھے گھسیٹ کر خدا کے پاس  
لے آیا ہے۔“

فرشتے نے ایک گہری سانس لی تھی۔ ”طوعاً و  
کرہاً..... خوشی سے ورنہ زبردستی..... اس دنیا کے

انسان کی سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ جس کام کا  
اسے اختیار ہی نہیں دیا گیا، یہ اسی کام کو

کرتا ہے۔ دوسروں کے اعمال کا حاصل جمع نکال کر  
انہیں ان کا انجام بتانے کا۔ وہ جنتی ہیں یا جہنمی،

انہیں یاد دلاتے رہنے کا۔  
جن لوگوں نے دیسا کو پتھر مارے، اسے لعنتی

اور سیاہ کار کہا، ان لوگوں کی تسلیں اس صدی میں بھی  
زندہ ہیں۔ وہ آج بھی بیماروں کو، ”اعمال کی سزا“ کا

عندہ دے رہی ہیں۔ وہ آج بھی ”تم بھٹکے ہوئے  
تھے، تمہیں اپنی طرف بلانے کے لیے اللہ نے یہ

مصیبت نازل کی ہے“ کے پتھر مار رہے ہیں۔ طوعاً و  
کرہاً ورنہ گھسیٹ کر..... یہ اس صدی کے انسان

کے نگر ہیں۔  
تم نے اپنے رب کے بارے میں ایسا گمان

کیوں کیا ہڈی؟ حضرت ایوب تیس سال تک بیمار  
رہے تھے۔ وہ پہلے سے ہی اللہ کی طرف متوجہ

تھے..... پھر وہ بیمار کیوں ہوئے؟ لاکھوں، کروڑوں  
بچے پیدا ہوتے ہی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا

ہو جاتے ہیں۔ کیا اس لیے کہ اللہ ان سے ناراض ہوتا  
ہے؟ یا وہ اللہ کی حکمت عدولی کرتے ہیں؟

سب سے زیادہ مشکلیں نبیوں، پیغمبروں نے  
جھیلی ہیں۔ سیدھا راستہ دکھانے والوں کے راستے

ہمیشہ کھنسنے والے ہیں۔ تو کیا اللہ ان سے ناراض تھا،  
اس لیے ان کے راستے میں مشکلیں رکھ دیں؟ آج

کی اس دنیا میں بھی، جو جتنا سچا، ایمان دار، پاک باز  
ہے، وہ اتنی ہی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے..... اس



پالیا تو باقی کیا بچا۔

تم سچی نہیں بند ہو، اور وہ تمہیں تو ذکر ”موتی“ بنا دینا چاہتا ہے۔

ہر دل جو تکلیف سہتا ہے، وہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ سوچو، عبادت میں افضل عبادت روزہ رکھنا ہے۔ تو کیا تم یہ کہو گی کہ اللہ بھوکا رکھو کر ثواب کا لالچ دے رہا ہے۔ وہ تمہیں ویسے ہی ثواب کیوں نہیں دے دیتا؟ تم سے کھانا پینا چھڑوا کر اللہ کیا کروانا چاہتا ہے؟

جسم کو بھوکا رکھو کر، اللہ روح کو غذا دلواتا ہے۔ ایک کی بھوک، پیاس، صبر، برداشت، دوسرے کی روحانی طاقت ہے۔ تم جیسی ماڈرن لڑکی کو میں یہ بھی بتا دوں کہ آج تک دنیا میں، سائنس یا ترقی کے نام پر جتنے بھی معجزے ہوئے ہیں، وہ ”روحانی طاقت“ سے ہوئے ہیں۔ جسمانی طاقت سے کبھی کچھ ظہور پذیر نہیں ہوتا۔

دنیا میں اموات کی تیسری بڑی وجہ، ذہنی امراض، ڈپریشن، بے چینی، مایوسی ہے۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ ہمارے پاس ان سب بیماریوں سے لڑنے کے لیے ہتھیار ہیں نہ طاقت..... ذہن میں جنگیں ہر پا ہیں اور انسان یہ جنگیں ہارتا جا رہا ہے، اپنی زندگی سے ہاتھ دھو رہا ہے..... کیونکہ وہ سب سے بڑی طاقت ”روحانی طاقت“ کو بیدار کرنے میں ناکام جا رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ روحانی طاقت صرف روزے سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ سب سے آسان طریقہ ہے اسے حاصل کرنے کا۔

تمہاری کھانے پینے کی طلب کو تو ذکر اللہ تمہیں اتنی بڑی طاقت دے رہا ہے، تم اپنے رب کے معاملات میں شک کیسے کر سکتی ہو۔ وہ بیماری ہو یا کوئی اور تکلیف۔ تم اس پر سوال کیسے اٹھا سکتی ہو؟  
”کتنے با علم اور با خبر ہو تم۔“ وہ اس کی ذہانت پر حیران تھی۔  
”میں نہیں ہدی اتم..... سارا علم، سب خبریں

لیے کہ ہدی کہ نیکی کا راستہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے ہی ان کا مقام بلند ہوتا ہے۔ کیا تم نے سوچا کہ وہ تمہیں عام سے خاص کرنا چاہتا ہے؟  
”مجھے.....؟ کس لیے؟ میں نیک اور اچھی لڑکی نہیں ہوں۔“

”دینے والے کی ”چاہت“۔ اس کی چاہت کہ تمہیں اپنی بندگی کے لیے بنایا، اس کی چاہت کہ تمہیں بلند مقام کے لیے چاہتا ہے۔“

وہ چونک گئی۔ ”اللہ کی چاہت..... میں؟“  
”کیوں نہیں..... اللہ کی چاہت، یہی ہے انسان کا اصل نصیب۔ تم نے اپنی بیماری کو اس کی چاہت سے کیوں نہیں دیکھا۔ وہ مت سوچو جو لوگ چاہتے ہیں کہ تم سوچو۔ اپنے رب کو اس گمان کے ساتھ نہ رکھو، جس گمان پر انہوں نے رب کو رکھا ہوا ہے۔ تم گناہ گار ہو، سیاہ کار ہو، نیک ہو، اچھی یا بری جو بھی ہو، اس فیصلے کا اختیار صرف اور صرف اللہ کے پاس رہنے دو۔ وہ اپنے فیصلوں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

مصیبت، تکلیف، پریشانی یا بیماری، اسے اللہ کا قہر یا عذاب سمجھنا چھوڑ دو۔ جب بادلوں کا سینہ شق ہوتا ہے تو آب برستا ہے۔ ہر شے جو ٹوٹتی ہے، وہ ایک نئی صورت میں بدل جاتی ہے۔ کوئٹیس، تچے، پھول، درخت، جنگل، سبزہ..... یہ انقلاب جج کی توڑ سے برپا ہوتا ہے۔ زمین کا سینہ شق ہوتا ہے تو جہاں، باغ و بہار ہوتا ہے۔ زمین پر اریڑیوں کی ضرب پڑتی ہے تو چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔ ماں پر تکلیف کا باب کھلتا ہے، تو ہی نئی روح کو راستہ ملتا ہے..... نئی روح..... ایک اور انسان..... ایک اور مقام.....

ایمان کے لیے انسان کا سینہ شق کرنا پڑتا ہے۔ جاہلانہ عقیدوں پر ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ پچھلے لوگوں کو اپنے پتھر کے خدا توڑنے پڑے تھے، تب ہی وہ ”واحد لا شریک“ پر ایمان لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جھوٹے خدائی کے دعوے داروں کو توڑا تو سچائی کو پایا۔ ہدی اکیا انسان گھالے میں رہا؟ ایمان



جہیں دی گئی ہیں..... انسان کو.....“

”مجھے.....؟ بدی کو؟“ اسے اپنی چوبیس سالہ زندگی یاد آئی۔ ”ایسی غفلت، ایسی جاہلیت۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔ ”بدی! تم نے علم کی کوئی ایک بات نہیں سیکھی..... کیوں؟“ وہ خود سے ہی شکوہ کر رہی تھی۔ ”تم نے اپنے رب کو کسی ایک بھی خوبی سے نہیں پہچانا..... کیوں؟“ وہ خود پر افسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

”عام طور پر موت کی دھمکی انسان کو اپنی زندگی سے زیادہ باخبر کر دیتی ہے۔“ (پادلو کوکلیا ہو)  
”مجھے کینسر کا تھوہ دیا گیا کیونکہ اس کے ذریعے اللہ نے مجھے تبدیل ہونے کا موقعہ دیا۔“ (علی بنت) اور اب وہ باخبر ہو چکی تھی..... اس لیے.....  
”میں اپنی بیماری کو قبول کرتی ہوں.....“ وہ مضبوط انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”روحانی طاقت اور زندگی کے لیے، اپنے رب کا مقصود پانے، خود کو پوری طرح سے، علم اور یقین کے حوالے کرنے کے لیے..... میں..... میں بدی! میں اپنی بیماری کو تکلیف نہیں، مصیبت نہیں، سزا نہیں، انعام کی صورت میں قبول کرتی ہوں۔“

فرشتے نے اسے خوشی سے دیکھا۔ ”مجھے خوشی ہے..... یہی میرا کام تھا، جہیں سمجھانا، راستہ دکھانا۔“  
”کیا میں ٹھیک ہو سکتی ہوں؟“ اس نے سب سے اہم سوال پوچھا تھا۔

”شک کرنا چھوڑ دو.....“ اس نے سب سے اہم جواب دیا تھا۔

”میں ٹھیک ہونا چاہتی ہوں..... شفا یاب۔“  
”وقت کی مقدار اور کنکٹی کو بھول جاؤ۔ اپنا حوصلہ پہاڑ بنا لو اور اپنی ہمت آسمان..... خدا سے تجارت شروع کر دو.....“

”تجارت؟“ فرشتہ اسے حیران کر رہا تھا لیکن اس بار کچھ زیادہ ہی حیران کر دیا تھا کہ بے ساختہ اس کا منہ کھل گیا تھا۔

”تمہاری زبان میں ”بزئس“ انویسلٹ

شروع کر دو اللہ کے ساتھ۔ جو دے سکتی ہو، دے دو، پھر اس سے وہ مانگ لو جو اس سے لینا چاہتی ہو۔“  
”کہنا عجیب لگ رہا ہے لیکن شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تم مجھے اللہ کے ساتھ بزئس کرنے کے لیے کہہ رہے ہو؟“

”بالکل..... اللہ کو قرضہ حسنہ دو، اللہ معاملات میں بہترین ہے۔ اللہ کے ساتھ بزئس کرنے سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ سب انویسلٹ کر دو، سب..... اس کا وعدہ ہے کہ اس کے ساتھ بزئس کرنے والا کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ ایسا بزئس ہزار گنا سے زیادہ منافع میں جاتا ہے اور اللہ کے ہزار گنا کو اپنے حساب کتاب کے ہزار گنا میں نہ گننا۔ اللہ کی کوئی اور وزن کے پیمانے انسان کبھی نہیں بنا سکے گا۔“

وہ ابھی تک ہکا بکا تھی۔ اس نے بے یقینی سے اپنی ٹھوڑی بھی کھجائی تھی۔ اس نے مذہب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، ساری دنیا، پوری مخلوق نے مل کر لفظ ”مذہب“ کو اتنا زیادہ بدنام کر دیا ہے کہ اس کا مطالعہ کرنا، جرم کرنے کے برابر لگتا ہے۔ ہر انسان مذہب سے ایسے دور بھاگ رہا ہے جیسے اس سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا چیز کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

”اچھا..... تو میں کیا انویسلٹ کروں؟“ یقین اسے ابھی تجھی نہیں آیا تھا لیکن پھر بھی وہ پوچھ رہی تھی۔

”کچھ بھی..... جو دے سکتی ہو، وہ دے دو تو، بدلے میں تمہیں اس کا منافع مل جائے گا۔“

”اچھا..... کیا میں بے چینی دے سکتی ہوں؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”بالکل..... دے دو..... بدلے میں قرارداد مل جائے گا.....“

”کیا واقعی..... میری بے چینی بھی انویسلٹ ہو سکتی ہے؟“

”بالکل ہو سکتی ہے..... اپنی توجہ، اپنی محبت، اپنی شکرگزاری، اپنا صبر، اپنا درد، اپنی تکلیف، سب



دے دو۔ اپنا سب کچھ انویسٹ کر دو۔ کسی چیز کو معمولی نہ سمجھو۔ اللہ ہر چیز سے ڈیل کرتا ہے۔ ہر چیز انویسٹ ہوتی ہے اس کے بزنس میں۔ ذمہ داریوں کو دی جانے والی کسی اور مصحوم دلوں کو دی جانے والی مسکراہٹ تو عام طور پر۔۔۔

”میری بے قراری۔ میرا غصہ۔ میرا بے مبراہن بھی؟“

”یہ تو سب سے پہلے۔ سب سے بڑی انویسٹ ہی ”منفی جذبات“ کی ہوتی ہے۔ سب بدی! تمہارے لفظ بھی، تمہاری خاموشی بھی۔ تم اس کے لیے مبراہن کرنا شروع کر دو۔ تم اس کے لیے تکلیف کو قبول کر لو، تم اس کے لیے اس تکلیف سے نکلنے کا چارہ کرنا شروع کر دو۔ تم اس کے لیے مسکرا دو۔ تم اس کے لیے اپنی بے چینی کا ٹکڑا کھوٹ دو۔ تم اس کے لیے پرسکون ہو جاؤ، تم اس کے لیے ”مبراہن“ سے رہو۔ تم اس کے لیے بے مبراہن چھوڑ دو، تم اس کے لیے ہمت سے کام لو، تنہائی سے نکل آؤ۔ یہ سب تم اس کے لیے کرتی جاؤ۔ اور پھر وہ تمہارے لیے سب کر دے گا۔“

”کیا اللہ اتنا کچھ۔“ سوال اچھورا رہ گیا تھا۔ فرشتے نے ”کیا“ سے بات اچھائی تھی۔ ”خدا کے اختیار پر بھی ”کیا“ کا سوال نہیں اٹھاتے بدی۔“ ”کیا“ بہت بڑا اعتراض ہے۔ کیا وہ میری مدد کرے گا، کیا وہ مجھے معاف کرے گا، کیا وہ مجھے سزا دے گا، کیا وہ۔۔۔ اللہ ہمیشہ موجود رہا ہے، وہ کبھی ”کیا“ نہیں ہوتا۔ اس لفظ کو اپنے دل سے نکال دو۔۔۔ اللہ کی صفات پر ”کیا“ نہیں لگ سکتا۔ وہ تو کن کہتا ہے اور فیکٹوں ہو جاتا ہے۔ کیا (سوال، شک) کو تو پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ کیا (شک) کو شیطان نے بنایا اور انسان کو تھما دیا۔“

بدی کو جیسے سارے جہاں کی دولت مل گئی تھی۔ ”کمال ہو گیا۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔ ”کتنی بے وقوف رہی ہوں میں۔“

”ہاں۔۔۔ بہت بڑی فول۔۔۔“ فرشتہ ہر بار

اسے لکھے اتفاق میں کسی دینے والا نہیں تھا۔ اس کا بھی حق بنتا تھا۔

اس نے بے ساختہ قبضہ لگایا۔ ”بار غفل۔“ فول۔۔۔ ”فول نے ماما کے لائے پھولوں میں سے ایک پھول نکال کر پکڑ لیا۔

”میری جی! انویسٹ۔۔۔“ اس نے کمرے سے باہر قدم بڑھا دیے تھے۔

”یہ آپ کے حصے کا پھول اور خوشی۔ مجھے اللہ کے باغ میں آپ کے نام سے کھلا ہوا مل، سوچا اللہ کے جہاں میں کھلے ہوئے دوسرے پھول کو دے دیں۔ آپ کو۔“ دوسرا تھوڑے کمرے میں آئی تھی، جہاں دو بچوں کی انٹاکس سالہ ماں اینڈرٹ تھی۔ وہ بھی کینسر کے مرض میں مبتلا تھی۔ اس نے ایسے محبت بھرے انداز سے کہا تھا کہ وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

”پھول، پھول کو پھول دے رہا ہے۔“ پھول لیتے ہوئے ہنس کر کہا۔

شوہر نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں دونوں ایسے باتیں کرنے لگیں جیسے ایک ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی ہوں۔ تھوڑا وقت اور گزرا تو دونوں کے بستہ دباؤنگ قبضوں سے دیواریں گونجنے لگی تھیں۔ یہ سب ایسے ہی جاری رہتا تو، ہاسپٹل کی چھت گرنے کا خطرہ بڑھ سکتا تھا۔ لڑکیاں جب مل بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں، تو یقیناً جانیں زمین کے پھٹنے تک کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

انسان، کسی دوسرے انسان کو جو سب سے زیادہ قیمتی چیز دے سکتا ہے، وہ اس کا ”وقت“ ہے۔ اللہ کے پاس جو بہترین چیز انویسٹ کر دیا سکتا ہے، وہ دوسرے انسان کو دی جانے والی ”مسکراہٹ“ ہے۔ انسانوں کو دیا جانے والا وقت، ان کے چہروں، کھلائی جانے والی مسکراہٹ اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ دوسروں کی راہ سے بنے جانے والے کانٹے، اللہ کو پھولوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ اب وہ یہ پھول حاصل کرنے والی تھی۔



کتنے چن کر اپنے لیے گھدستہ بنانے والی تھی۔  
☆☆☆

”دو امریکا کے بہترین ہسپتال میں علاج کروا رہی تھی۔ اس کے پاس دنیا کی کسی چیز کی کمی نہیں تھی، کئی تھی تو بس صحت کی۔ جو چیز وہ لاکھوں کروڑوں لگا کر بھی حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ چیز لاکھوں کروڑوں کو مفت ملی ہوئی تھی۔ بات قدر کی ہوتی ہے۔ بھی وہ بھی ان لاکھوں کروڑوں لوگوں میں شمار ہوتی تھی تب وہ ناقدری تھی۔ آج اسے قدر ہوئی تھی۔“

اسے فکر رہتی تھی اپنی خوب صورتی، جلد، بالوں، ناخن، حتیٰ کہ پیروں کی اینٹیوں تک کی۔ نہیں رہی تھی تو سب سے قیمتی شے زندگی کی نہیں رہی تھی۔

زندگی سے زیادہ اہمیت تو اس نے جیتے کی کھال سے بیٹے جوتوں کو دے دی تھی۔ جن کی قیمت تک اسے یاد تھی۔ نہیں یاد تھی تو اپنی ”زندگی کی قیمت“ چونکہ انسان زندگی کو خریدنا نہیں ہے اور دینے والا اسے بیچنا نہیں ہے تو وہ بھی اس کی اہمیت سے واقف ہی نہیں ہو پاتا۔ کل ملائکہ کا سجدہ، اشرف ہونے کا شرف، کائنات کی ہر شے کو تسخیر کرنے کا علم، بندگی کا رتبہ، انسانیت کی معراج، دنیا میں امن کا تاج، ترقی کا عندیہ، اپنی پہچان کا ہنر۔۔۔۔۔ یہ ہے اس کی اہمیت۔ اور اپنی قیمتی زندگی کو یہ انسان گھٹیا سی چیزوں کے لیے نظر انداز کر دیتا ہے۔

”مجھے میسے چاہئیں پاپا!“ وہ دو دن سے گھر آئی ہوئی تھی۔ یونانی طرز کا تازہ پھولوں سے بنایا تاج سر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ خود بھی ان پھولوں کی طرح مہکی ہوئی تھی۔ وہ یونانی دیوی تو نہیں تھی، لیکن اسے خوش کرنے کے لیے مان لیتے ہیں کہ وہ یونانی دیوی ہی لگ رہی تھی۔ گھر کے لان میں ہی چھوٹی سی پٹنگ کر رہی تھی۔ پاپا اس کے لیے سب کاٹ رہے تھے۔ اور وہ باسکٹ میں سے باقی چیزیں نکال نکال کر پٹنگ فیلڈ پر سجا رہی تھی۔ ابھی وہ چولہا بھی سوٹ کرے گی اور اس پر کچھ پکانے کی کوشش بھی کرے گی۔ کھائے

گی پھر وہ اکیلی ہی۔

”کتنے۔۔۔۔۔؟“ اس نے آج تک میسے مانگ کر نہیں لیے تھے۔ ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اس کا اپنا پرسنل اکاؤنٹ تھا، ہر مہینے اس کے اکاؤنٹ میں میسے ٹرانسفر ہوتے رہتے تھے۔ پاپا کے سب وی وی آئی پی کارڈز بھی اس کی دسترس میں رہتے تھے۔

”جتنے آپ دے سکیں۔“ ان دنوں اس کے پاس جو سب سے خوب صورت چیز تھی، وہ اس کی بے ساختہ مسکراہٹ تھی۔

پاپا اسے ناچھی سے دیکھ رہے تھے۔ ”جتنے تم لینا چاہو، میں اتنے دے سکتا ہوں،“ سیب کی قاش اس کے منہ میں ڈالی۔

”میں سب لینا چاہتی ہوں۔ بھاری انویسٹمنٹ کر رہی ہوں میں۔۔۔۔۔ بہت بڑی والی ڈیل۔۔۔۔۔“ ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ ”بہت بڑی مطلب، بہت تبت ہی بڑی۔۔۔۔۔“ وہ ہنس دیے۔

”اچھا۔۔۔۔۔ کیسی ڈیل اور کس کے ساتھ۔۔۔۔۔ یعنی یہ بڑی والی ڈیل؟“

”اللہ کے ساتھ۔۔۔۔۔ اپنا بزنس اسٹارٹ کر رہی ہوں۔۔۔۔۔“

”تمہاری زندگی کے لیے میں اب تک بہت کچھ چیر بٹی کر چکا ہوں اور بھی دے سکتا ہوں میری جان۔“

”میں جانتی ہوں پاپا! ہم تینوں نے کبھی چیز بٹی سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ لیکن پاپا! شاید وہ سب بھی ہم نے فیشن کی طرح کیا۔ سخاوت یہ نہیں کہ ”کچھ“ دیا جائے۔ سخاوت یہ ہے کہ ”بہت کچھ“ کیا جائے۔ ہم نے وہ دیا جسے دینے سے ہماری دولت پر فرق نہیں پڑا۔ جیسے سوڈا الرز میں سے ایک پینی دے دینا۔ اپنا، پیٹ، نیت، نفس سب اچھی طرح سے بھرنے کے بعد دینا۔ ہم اتنا کچھ جمع کر لیتے ہیں کہ باقی کی دنیا کو خردم کر دیتے ہیں۔“

”امیر ہونا گناہ نہیں ہے۔۔۔۔۔“



”لیکن امیر ہو کر غافل ہونا گناہ کبیرہ ہے۔  
کچھ کو کچھ پر اسی لیے برتری دی جاتی ہے کہ وہ دنیا کو  
بدلنے کے لیے آگے بڑھیں۔ لیکن ہم تو اپنے گھر،  
اپنے رنگ، اپنے بال، اپنی کھال بدلنے میں لگے  
رہتے ہیں۔“

”دنیا کو بدلنے میں، میں کبھی پیچھے نہیں رہا  
ہوں!“

”ہاں..... لیکن تب جب آپ کو اپنی مصروفیت  
سے وقت ملا۔ سال میں دو بار، ورنہ زیادہ سے زیادہ  
چار پانچ بار۔ آپ نے اسے اپنا مقصد نہیں بنایا۔  
آپ کا کروڑوں کا بزنس، پرائیٹی، مجھے نہیں بچا  
سکی..... دیکھیں ان سب چیزوں کی قیمت کتنی معمولی  
ہے۔ کیا ہم ان معمولی چیزوں کو دوسروں کے لیے  
غیر معمولی بنا سکتے ہیں؟ جو چیزیں مجھے کچھ نہیں دے  
سکیں، وہ دوسروں کو بہت کچھ دے سکیں گی۔  
آسانیاں..... مسکرائیں..... راحتیں..... سب سے  
بڑھ کر ”شفا“۔“

”کیا کرنا چاہتی ہو تم.....“

☆☆☆

اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی این  
جی او سے بات ہو چکی تھی۔ وہ انہیں فنڈز اکٹھے  
کر کے دینے والی تھی اور وہ کاغذ، افریقہ میں ہاسپٹل  
بنانے والے تھے۔ چیرٹی کی ابتدا اس نے اپنے  
آپ سے کی تھی۔

وہ اپنے ڈریسنگ روم میں آئی۔ آخری بار وہ  
یہاں تب آئی تھی جب اسے کانووکیشن کے لیے تیار  
ہونا تھا۔ اس کی یہ واک ان کلوزٹ تھی، اس گھر کا  
سب سے بڑا حصہ تھا۔ اسے پروفیشنل کی ٹیم نے آکر  
دیے ہی سیٹ کیا تھا، جیسے بڑے برائڈ کے اسٹور  
سیٹ کیے جاتے ہیں۔ ہر چیز ”شوکیس“ تھی۔ فیشن  
کی دنیا کی کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں تھی جو یہاں  
موجود نہ ہو۔ اگر وہ ایک ایک چیز کو گننے اور اس کی  
خوبیاں گنوانے بیٹھتی تو ایک چھوٹی سی کتاب تیار  
ہو سکتی تھی۔ یہاں موجود سب سے معمولی چیز اس کے

فرسلیپرز تھے جنہیں پہن کر وہ ڈریسنگ روم میں  
پھرا کرتی تھی۔ اور ان کی قیمت صرف دو ہزار پچاس  
ڈالر (تین لاکھ) تھی۔

کمرے کے درمیان کھڑی ہو کر وہ کمران گھا  
کرا ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ ہر طرف برائڈز  
برائڈز تھے۔ تاریخی، نایاب جوبلی، نیلا سیل میں  
خریدے گئے کچھ خاص بیگز، جیکٹس، جاکٹوں کی  
کھالوں سے بنے جوتے، ہاتھ کی کارمیری کے کپڑے  
نایاب نمونے..... ہر طرف نمائش تھی۔ ہر طرف  
پیسہ تھا۔ سفید سونے، ہر رنگ کے ہیرے موتی کے  
پھاڑ تھے۔ لاکھوں ڈالر سے بنا روم، کروڑوں کی  
مالیت کی ”چیزوں“ کے لیے۔ یہ سب چیزیں  
اس کے کسی کام نہیں آئی تھیں۔ وہ ہاسپٹل میں اس کی  
جنگ لڑ رہی تھی۔

”سادگی ایمان۔۔۔۔۔ سے ہے۔“

انسان کو سونے کے پھاڑوں میں دفن ہونے  
کے لیے، ہیرے موتیوں کو اوڑھنے بچھونے کے لیے  
پیدا نہیں کیا گیا۔ یہ چیزیں بس پتھر ہیں۔ لباس کتنا  
بھی مہنگا ہو، بس جسم کا پردہ اور آرام ہے۔ اس سے  
زیادہ اسے کچھ اور سمجھنا بے وقوفی ہے۔ اس سے زیادہ  
اس پر خرچ کرنا، اس سے بڑی بے وقوفی  
ہے۔ خوراک..... بس پیٹ بھرنا، بھوک ختم  
کرنا..... بس..... کتنا کھاؤ گے، اور کیا کیا کھا جائے  
گے؟

نہ دولت فخر ہے..... نہ غربت لعنت.....  
”زندگی کا ہدف، جسم، لباس یا خوراک نہیں  
ہے۔“

اگر چیزیں انسان کو خوشی دے سکتی ہیں تو وہ بس  
ایک ہی صورت میں کہ ان کے ساتھ ذمہ نہ رہا  
جائے۔ انہیں جڑ سمجھا جائے ”کل“ نہیں۔ ان کے  
پھاڑ نہ اکٹھے کیے جائیں، انسانیت کی تلاش کی  
طرف ان کے دریا بہا دیے جائیں۔ بھلا دنیا بھوک  
سے مرنے ہو، اور ساری انسانیت بھوک سے مرے گی  
ہیرے کے لیے بڑی بڑی بولیاں



ہو..... ہیرا..... انسان سے بڑھ کر اس دنیا میں کون  
"کو نور" ہوگا۔

اس نے سب سے پہلے اپنی سب سے پیاری  
جز کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ گلابی ہیروں کا  
ہار..... بابا نے بڑی بولی لگا کر اس کی اٹھارویں  
سالگرہ کے لیے یہ گفٹ لیا تھا۔ اپنی خوبصورتی، نایابی  
اور بڑی "بولی" کی وجہ سے یہ ہار اس کے دل کے  
بہت قریب تھا۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس  
نے ہار کو گٹھے کے ساتھ لگا لیا۔ اب وہ اسے پتھر کے  
چند ٹکڑے لگے تھے..... جو سب سے قیمتی چیز شیشے  
میں دکھائی دے رہی تھی، وہ، وہ خود تھی۔

"میں نے اپنی قیمتی گاڑیوں، گھڑیوں سے  
چھٹکارا پایا، براڈ ڈکٹروں سے بھی۔ میں نے سب  
کچھ چیر بیٹی کر دیا۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں رہی  
تھی۔" (علی بنت)

انسا پر اس نے نیلامی کا آغاز کر دیا تھا۔ سب  
سے پہلے گلابی ہیرے ہی نیلامی کے لیے پیش کیے  
گئے تھے۔ اس کے اس قیمتی اور نایاب ہار کی نیلامی کی  
خبر اس کی کینسر کی خبر سے زیادہ وائرل ہوئی تھی۔ دنیا  
اسے خریدنے کے لیے پاگل ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی  
کہ دنیا کو پاگل ہی ہونا ہے۔ کبھی وہ بھی اس پاگل  
دنیا میں شمار ہوتی تھی۔ ایک مشہور پاپ سٹار کی جیکٹ  
لینے کے لیے اس نے نیلامی کی بولی کی ساری حدیں  
بار کر لی تھیں۔ اس وقت وہ انیس سال کی تھی۔ اسی  
سٹار سے صرف تیس منٹ کی ایک ملاقات کے لیے  
پاپا نے پورے پچاس ہزار ڈالر پے کیے تھے۔ وہ اس  
سے ملنے کے لیے مری جا رہی تھی۔ اب وہ سٹار جانا  
بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی میں مر رہی ہے۔ اس کی  
جیکٹ وارڈروب میں کسی ٹرائی کی طرح لٹک رہی  
تھی، وہ نہ اسے سانس دے رہی تھی، نہ  
دوا..... پھر؟ پھر؟

عمار تیں..... چیزیں..... اور پتھر..... انسان  
نے اپنا قبرستان خود تیار کر لیا ہے اور وہ جانتا بھی نہیں  
ہے۔

ایک ایک کر کے وہ اپنی ساری چیزیں آن لائن  
بیل کر رہی تھی۔ اس بیل کو اس جی او کی ٹیم ہی ہینڈل  
کر رہی تھی۔ وہ مشہور تھی، اس کی چیزیں بھی عام نہیں  
تھیں، اس لیے قیمت اچھی مل رہی تھی۔ اس نے  
انٹرویو کے لیے رابطہ کرنے والوں کو بھی رسپانس دینا  
شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے وہ شوپس بننے کے لیے  
تیار نہیں تھی لیکن تھوڑا بہت ایڈجسٹ کر رہی تھی۔ وہ  
فنڈز کے لیے ایکٹیو ہو چکی تھی۔ یہ وہی سوشل میڈیا تھا  
جس پر اس نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت برباد کیا تھا۔  
اب بھی یہ وہی سوشل میڈیا تھا، جو زندگیوں کو بچانے  
کے لیے فنڈز جمع کرنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔  
صراطِ مستقیم (درست سمت) ہر شے کے معنی  
بدل دیتی ہے۔

اسے یہ سارے کام کرتے ہوئے پانچ مہینے  
گزر چکے تھے۔ ڈاکٹرز کا بتایا گیا "موت کا وقت"  
کب کا گزر چکا تھا۔ وہ زندہ تھی، پوری طرح سے  
ایکٹیو تھی۔ اب وہ گاہے لگا ہے ہاسپٹل سے نکل آئی  
تھی۔ پختہ دس دن میں کسی نہ کسی ایونٹ میں چلی  
جاتی تھی۔ وہ خود بھی بھول چکی تھی کہ ڈاکٹرز کا بتایا گیا  
وقت آکر چلا بھی گیا۔ ماما، بابا اس کی صحت سے خوش  
تھے۔ اس کے کالوں پر لالی نظر آنے لگی تھی۔ آنکھوں  
کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اس نے جس چیز کے ذائقے  
کا بھی مزہ نہیں چکھا تھا، اس ذائقے سے اب لطف  
اندوز ہو رہی تھی۔ زندگی کے ذائقے سے۔

تین تین گھنٹے وہ سیلون میں گزار دیا کرتی تھی۔  
اب انہی تین چار گھنٹوں میں وہ تین چار میٹنگز اینڈ  
کر لیتی تھی۔ اسے کہیں نہ کہیں فنڈ اکٹھا کرنے کے  
لیے جانا پڑتا تھا، وہ وہاں چلی جاتی تھی۔ اسے مختلف  
سوشل میڈیا ایوارڈ شووز میں بلایا جاتا تھا۔ کچھ بڑے  
جوتلو بھی اسے اپنی ایوارڈ تقریبات میں بلاتے  
تھے۔ وہ ایونٹس چارج نہیں کرتی تھی، فنڈز کی ڈیمانڈ  
کرتی تھی۔ جو ڈریس پہنتی تھی، جو بیک پکڑتی تھی،  
کانوں میں پڑے ایئر کنڈیکٹر پر اسے فنڈز مل رہے  
تھے۔ یہ وہی چیزیں تھیں جنہیں وہن کر وہ پیسہ برباد



دو دنگ رہ گئے..... چپ ہو گئے..... لا جواب ہو گئے..... عجیب سوال تھا.....

”میں مان لیتی ہوں ہمیں ہمارے کسی گناہ کی وجہ سے کوڑہ ہوا، پھر ان دو بچوں کو کیوں ہوا، جنہیں پانچ سال پہلے یہ بیماری ہوئی تھی؟ بچوں نے کیا گناہ کیا ہوگا؟“

”ان کے ماں باپ کے گناہ..... شاید ان کی سزا.....“ ان کی آوازیں کمزور پڑنے لگی تھیں، کیونکہ ان کی دلیلیں کمزور تھیں۔

”خدا کا خوف کرو، اپنے خدا کے بارے میں ایسے گمان نہ کرو۔ کیا وہ معصوم رگوں کو، ایسے گناہ کی سزا دے سکتا ہے جو انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔ ہمارے کمزور عقیدوں نے ہمیں بھٹکا دیا ہے۔ ہم نے اپنے رب کو غلط گمان سے پھینا ہے۔ ہاں مجھے کوڑہ ہوا، میں بیمار ہوئی۔ لیکن یہ کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ یہ خدا کا عذاب، خدا کی لعنت نہیں ہو سکتی۔“ اس کی آواز خوشی کے احساس سے منور تھی۔

”تم خوش گمان ہو رہی ہو، بیس! سب نشانیاں ہم پر لعنت کی ہیں۔ دیکھو ہماری شکلیں، ہمارے زخم، ہمارے جسم، مجھے تو خود سے نفرت محسوس ہوتی ہے تو کیا خدا کو نہیں ہوتی ہوگی۔ میں اپنا عکس پانی میں نہیں دیکھ سکتا، اتنا کر یہ صورت ہو چکا ہوں۔“

”تو کیا خدا خوبصورتوں کا خدا ہے؟ وہ پھول کا خدا ہے لیکن کانٹے کا نہیں؟“ سب کو سکھتہ ہو گیا تھا۔

”جواب دو مجھے؟“

ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، ان کے پاس بس ناسور تھے، بد نصیبی تھی، تڑپ اور تنہائی تھی۔

”ہم اس غلاظت کے ڈھیر پر خدا کی وجہ سے نہیں، اس زمین کے انسانوں کی وجہ سے رہنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا، ہم بیمار ہیں اور اس وقت خدا کے رحم کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔“ اس نے کامل یقین سے کہا تھا۔

”کیا رحم ایسا ہوتا ہے؟“ ایک نے اپنے جسم کے زخم کے اس کے سامنے کر دیے تھے۔

کرتی تھی، اب بھی وہ چیزیں تھیں جن سے وہ نڈر وصول کر رہی تھی..... نیت کی تبدیلی سے، چیزیں دے رہتی ہیں لیکن ان کے فائدے بدل جاتے ہیں۔

”آپ ایڈمی جیسا بڑا اثر ست کیسے چلا رہے ہیں۔ اتنے زیادہ نڈر کون دیتا ہے؟“

”زمین والوں کے لیے..... آسمان والا دیتا ہے۔“ (ایڈمی)

☆☆☆

”زمین والوں کے لیے آسمان والے کا رحم کبھی کم نہیں پڑتا۔ ہم نے یہ یقین کیسے کھو دیا؟“ دبسا پوچھ رہی تھی۔

سب چپ چاپ اسے سن رہے تھے۔ اس کی آواز کا جوش انہیں خوشی دے رہا تھا۔

”ہم نے یہ کیسے یقین کر لیا کہ وہ ہمیں چھوڑ چکا ہے۔ ہم نے کیسے مان لیا کہ اللہ کو ہم سے نفرت ہے؟“

”اس لیے کہ ہم کوڑھی ہو چکے ہیں۔ یہ بیماری ہے اس کی ناراضی کا ثبوت.....“ کسی نے کہا۔

”بس؟ صرف اس لیے کہ ہمیں کوڑہ ہو گیا؟“

صرف اس لیے کہ ہم بیمار ہو چکے ہیں۔ ہماری کھال جھڑنے لگی؟ تندرستی کے ساتھ بیماری ہے، جیسے زندگی کے ساتھ موت ہے۔ جس نے ایک کو بنایا، اس نے، اس کا جوڑ بھی بنایا۔ تو کیا ہم اس لیے دھکے مارے جائیں گے کہ ہم پر اللہ کا حکم پورا ہوا ہے؟ زندگی پر موت آتی ہے تو کیا وہ خدا کے حکم کی تکمیل نہیں ہوتی؟“

”خدا کے حکم کی تکمیل ہی ہوئی ہے۔ ہمارے گناہ پر خدا کی سزا کی صورت میں۔“

”گناہ.....؟ کون سا گناہ؟“

”کوئی ایسا گناہ جس نے خدا کے قہر کو دعوت دی تھی۔ سزا میں اس نے ہمیں یہ بیماری دے دی ہے۔“

”تو کیا روئے زمین پر ہم اکیلے ہیں جو گناہ کا رہیں؟ کیا ہم سے پہلے کوئی گناہ کا نہیں ہوا؟“







”تو اب یقین کر لو کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہے۔ اس کی عبادت پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا اس بیماری سے پاک لوگوں کا۔ ہمارے جسم کو زہ زدہ ہیں لیکن ہماری رو میں پاک ہیں۔“

”تم کیا کرنا چاہتی ہو دیسیا؟ تمہاری باتوں پر یقین کر لینے پر بھی ہمارا نصیب نہیں بدلے گا۔“

”ہمیں نصیب نہیں بدلنا، ہمیں اپنے یقین کو ام ایقین کرنا ہے۔“

”ام یقین۔“

”یقین سے بڑھ کر یقین۔ نفرت کی سب نشانیاں ملنے کے باوجود، خدا کی ”محبت“ پر یقین۔ قہر کی سب علامتیں دکھائی دینے کے باوجود اس کے رحم پر ”یقین“ ہماری بیماری بھی ٹھیک نہیں ہو سکتی، ساری دنیا کے کہنے کے باوجود ”اس کی شفا“ پر یقین۔ ”جو زمین پر نہیں ہوتا، وہ آسمان پر ہوتا ہے، صرف رب کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس شہادت پر ”یقین۔“

☆☆☆

گھاٹیوں میں آگ لگی تھی اور وہ دور شہر میں، شہر والوں کو بھی دکھائی دے رہی تھی۔ انہیں کوڑھیوں کی پرواہ نہیں تھی لیکن پھر بھی انہیں ظالمانہ سی تشویش ضرور تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا گھاٹیوں میں رہنے والے آگ جا کر اس میں کود رہے ہیں۔ آخر کار سب مر رہے ہیں؟ آگ میں مجلس کر خود کو ختم کرنے کا فیصلہ کرنے میں ان کی مدد کس نے کی ہے؟

”دیسیا غلاظت جلا رہی ہے۔ ناپاک لبادے، بستر اور استعمال کی دوسری ناکارہ چیزیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ عبادت کرنے جا رہی ہے اور عبادت کا آغاز غلاظت کی صفائی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ خدا کو پکارنے کا انتقام کر رہی ہے۔“ ان تک خبر پہنچ چکی تھی۔

”خدا..... وہ اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام کیسے لے سکتی ہے؟“

”زمین کی طرح تم نے خدا کو بھی اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے؟“ والد پوچھ رہے تھے۔ شہر والوں نے

ان کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ جس دن دیسیا شہر سے ہو کر گئی تھی، اس دن وہ لوگ ان کے گھر انکس ڈارائے دھمکانے پہنچ گئے تھے۔ والد چپ چاپ سب بٹھے رہے تھے۔ لیکن ان کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ انہیں اپنی دیسیا پر فخر تھا۔

”دیکھو اس دیوانے کو..... اولاد کے غم میں یہ خدا کی شان میں گستاخی کرنے سے بھی باز نہیں آ رہا۔ ادب و بخت کے باپ۔ شکر ادا کرو کہ ہم نے تمہیں شہر سے نکال باہر نہیں کیا۔ تم دونوں باپ بیٹی کی وجہ سے شہر پر کیسے کیسے عذاب نہیں آئے۔“

”وہ تمہارے اعمال کا پھل ہوں گے۔“ والد نے اطمینان سے کہا۔

”اچھا..... تو پھر تمہاری بیٹی نے کس عمل کا پھل کھایا ہے؟ بتاؤ، کس گناہ سے منہ کالا کیا تھا جو سارے جہان میں خدا نے اس کا منہ کالا کر دیا۔“

ذلت اور رسوائی تو بہت سوں کو نصیب ہوتی ہے پر جو کوڑھی کا نصیب بنتی ہے، اس کی تو مثال ہی نہیں ملتی۔“ قہقہہ لگایا۔

والد نے تڑپ کر کہنے والے کی گردن دبوچنی چاہی تھی۔ لیکن دوسرے لوگوں نے زوردار دھکا دے کر گرا دیا تھا۔

”جا کر کہہ دو اپنی لاڈلی سے، گناہ گاروں کی صف سے نکل کر ہم میں شامل نہ ہو۔ اگر اس نے اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام لیا تو اس کی زبان کاٹ دوں گا۔“

وہ زیر لب خدا کو یاد کر رہی تھی۔ آگ بجڑ کر رہی تھی۔ دیسیا نے ایک ایک غلیظ چیز اٹھا کر آگ میں جھونک دی تھی۔ وہ عبادت کے لیے اہتمام کر رہی تھی۔ پھر اس نے ایک بلند گھائی کی صفائی کی تھی۔ عبادت کے لیے اس نے بلندی کا انتخاب کیا تھا۔ سمندر کے پانی سے اس جگہ کو اچھی طرح سے دھویا تھا۔ گھاس پھوس کا فرش بچھا کر، ضیفے سے منگوائے کچھ پھول اس نے کنارے کنارے رکھ دیے تھے۔





”تمہاری بیٹی کی عقل کی داد دینی پڑے گی۔ ساری دنیا کو پاگل بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔ پاگل نہ ہوتی تو ساری دنیا کے کوزہ جیوں کو جمع کر کے، خدا کی عبادت پر کیسے لگاتی۔ حج الدماغوں نے تو ان کوزہ جیوں کو پتھر مار مار کر شہر سے باہر نکال دیا تھا۔ انہوں نے ان پر خدا کا نام لینا بھی حرام کر دیا تھا۔“ والد نے محل سے کہا تھا۔

”ہونہ۔۔۔۔۔ اپنی موت کا سامان کر رہی ہے۔“

”زندگی کا اہتمام تو تم سب لوگ کر رہے ہو ناں۔ تو پھر اس کی موت پر پریشان کیوں ہو؟“

”پاگل انسان!۔۔۔۔۔ بہک گیا ہے۔۔۔۔۔“

وہ بالکل نہیں جانتی تھی..... ہر رات وہ سب کے ساتھ عبادت کرتی تھی۔ خدا کو پکارتی تھی۔ وہ سب ایسا کر رہے تھے۔

اسی لیے اب انہیں پتھروں، گالیوں کے ساتھ ساتھ خدا کو پکارنے کے طے بھی ملتے تھے۔  
 ”تو کیا دیا خدا نے تمہیں؟ دوا؟ شفا؟“ کوئی کسی کو زخمی کو روک لیتا۔ اس کا مذاق اڑانے لگتا تھا۔  
 ”اپنا قرب دے تو دیا اور کیا چاہے ہمیں۔“  
 قہقہے۔

”جس کے پاس خدا ہوتا ہے، اس کے پاس کوڑھ نہیں ہوتا۔“

”اصل کوڑھ تو تمہاری روحوں کو ہو چکا ہے۔

اس کے بارے میں سوچو۔"

”تمہاری شکلیں تو اور منحوس ہو گئی ہیں۔ کیا ملا

عبادت کر کے.....؟“

”کل کیا ہو گا وہ آج نہیں بتاتا.....“

”جو کل ہو گا وہ آج مجھ سے سن لو۔ وہ کہیں

کوڑھ سے بڑی سزا دے گا۔ اپنی ناپاک زبانوں

سے اس کا نام لیتا بند کرو۔"

”اگر وہ دے گا..... اگر وہی دے گا تو میرا

اس کے رحم پر یقین رکھتے ہیں۔“ دبیسانے عبادت کو اس تعریف پر ختم کیا تھا۔

اب ہر رات وہ اسی جگہ، اسی طرح بیٹھ کر حمد  
ثناء کرنے لگے تھے۔ پہلی رات سے اگلی رات تک،  
وہ خدا کو پہلے سے بہتر جاننے لگے تھے۔ ہر رات کی  
صبح ان کا شک یقین میں بدلنے لگا تھا کہ وہ تو صرف  
بیمار تھے..... صرف بیمار..... انہوں نے اس کے علاوہ  
خود کو کچھ اور کیوں سمجھا۔ وہ جھکتے نہیں تھے۔ رات بھر  
خوش و خرم رہتے تھے۔ کسی چیز نے انہیں اتنا خوش  
نہیں کیا تھا جتنا خدا کی حمد کرنی تھی۔ کسی چیز نے  
انہیں اتنا مطمئن نہیں کیا تھا جتنا اس یقین نے کہ وہ بد  
بخت نہیں ہیں۔

آہستہ آہستہ ان کی رات کی آوازیں، ایک زبان ہو کر حمد کی کامل صورت میں فاضل گئیں اور رات کے سنانے میں گھانٹیوں میں گونجنے لگی تھیں۔ دور کھڑے والد بھی اپنی دیہا کی آواز کے ساتھ آواز ملاتے رہتے تھے۔ ان کی بیٹی بلندی پر خدا کے حضور بیٹھی تھی، وہ بچنے بچنے جوڑ کر خدا کے حضور کھڑے تھے۔

”اپنی ناپاک زبانوں سے کوڑھی خدا کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔“ یہ بات شہر کے ہر کمین کو سخت ناگوار گزری تھی۔ اور یہی بات کھانٹوں کے کوڑھیوں کی شہرت کی وجہ تھی۔ بات مسافروں کے کانوں تک پہنچی، مسافروں سے شہر سے باہر جا چکی تھی۔

”کوڑھیوں کے شہر میں ایک لڑکی شفا کی دعا  
 کروا رہی ہے۔“

یہ بات دور دور تک پھیل گئی۔ ایسے ہی جیسے کسی کو کوڑھ ہوتا تھا تو ہوا کے ساتھ اس کے کوڑھی ہونے کی خبر پھیل جاتی تھی۔ چھوٹے لوگ ہنس دے تھے، بیمار لوگ اپنا رخ کھائیوں کی طرف موڑ چکے



[illegible]

نہیں۔ ایک پیر نے پوچھا۔

دیرماتے گھرنے مرنے کی۔ "ہم اس خدا پر  
نجات لائے ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"  
دکھائی دینے کے لیے کہ تو جو اس پر ایمان نہیں لائے۔  
نجات لے کر میں آئے۔"

میں نے فوراً کہا۔  
 "نہیں، وہ تب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔  
 ان کا تعلق شہوت سے نہیں ہو رہا اس کا حصول یقیناً  
 سے ہو رہا ہے۔ یہ روح اسی طرف مائل ہے جس طرف  
 چلنی ہوتی ہے۔ کیا تماری روح میں تمہارے رب کی  
 طرف نہیں مائل ہے؟"

[illegible]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا  
 کہ میں تم سے بہتر ہوں گا۔  
 تم لوگو! تم نے مجھ کو  
 مرنے سے پہلے ہی کہہ دیا  
 کہ میں تم سے بہتر ہوں گا۔

بہت کا تو جہاں انتظار کیا ہو تو کبھی نہیں ملے گا۔  
بہت آسمان نہیں رہے تو کبھی نہیں ملے گا۔  
بہت دہلیز کے پاس نہیں گئے تو کبھی نہیں ملے گا۔  
بہت دروازے پر نہیں کھنکھائی تو کبھی نہیں ملے گا۔  
بہت دیوے بغیر دھرم نہیں چا سکتا تھا۔

”جیس۔۔۔“ وہ رو دوڑ۔ ”اچھی دولت دیکھو  
 ہے کہ عزت دیکھنا چاہتی ہوں۔ خدا کی محبت دیکھنا  
 چاہتی ہوں۔“

دیر سائے بھیگتی سے ضیفہ کے استہوا ہو گئے۔  
 ”آج رات، اس کی حمد کے بعد، ہم اس کی  
 چاہت“ کی دعا کریں گے۔“  
 ہنسنے لگی

”انسان کے حصے میں جو بے بڑی خوشی  
 ایسی آئی ہے۔ وہ ”کھٹہ کی چاہت“ کی ہے۔“



زندہ کہہ رہا تھا۔  
اللہ کی چاہت.....

اسے فرشتے کی بات یاد آگئی تھی۔ ”تم خود بھی نہیں جانتیں کہ تم کیا کچھ کر سکتی ہو۔ تم نے خود کو کھوجا ہی نہیں تھا۔“

اب وہ خود کو تلاش رہی تھی..... دکھ اور سکھ کے ساتھ۔  
خیند کا دورانیہ مختصر ہو چکا تھا۔ وہ قارغ وقت میں کتاب کے لیے نوٹس ریکارڈ کرتی رہتی تھی۔ جہاں جانی، جو کچھ کرتی، جس احساس اور کیفیت سے گزرتی، وہ ریکارڈ کر لیتی تھی۔ کار کی پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے دوران، رات کو سونے سے دس منٹ پہلے، صبح اٹھ کر بیس پچیس منٹ..... بہت تھا اتنا وقت..... وہی وقت جو موبائل چیت، پوسٹنگ، فیس مساج، باڈی مساج، مٹی کیور، پیڈی کیور میں صرف ہوتا تھا۔

ہر دور میں انسان نے جموٹے خدا بنائے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ وقت گزارتا ہے، انہیں پوجتا ہے، ان سے دل لگاتا ہے۔ ان کی ستائش کرتا ہے، ان سے طلب کرتا ہے۔ اس دور کے جموٹے خداؤں میں سے چند کے نام فیس بک، انسٹا ٹویٹر، ٹکس، موبائل، فیشن، بیوٹی، ”دکھاوا“ ہے۔ انسان یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے کہ انہیں، اس نے ”خدا“ بنالیا ہے۔ غفلت ایسی ہی بیماری ہوتی ہے، یہ حقیقت تک پہنچنے ہی نہیں دیتی، اور نقصان تک لے جاتی ہے۔

اس کے واکس نوٹس پیپر پر لکھے ہوئے اسے مل جاتے تھے۔ وہ انہیں ایڈٹ کر لیتی تھی۔ اس کی زندگی کی کتاب کا ایک باب تیار ہو چکا تھا۔ اس پہلے باب میں اس کی بیماری سے پہلے کی زندگی کا احوال درج تھا۔ چوبیس سال کی زندگی اور بس ایک باب کیونکہ اس میں ایسا کچھ تھا ہی نہیں کہ وہ ”پوری کتاب“ بننا۔ زندگی کا وہ حصہ جب وہ زندہ تو تھی لیکن ”ہڈی“ (درست سست) نہیں تھی۔

”اللہ کے ساتھ میری تجارت ٹھیک جا رہی ہے؟“ اس نے ایک دن فرشتے سے پوچھا۔

لائم وٹیر نے یونیورسٹی میں اس کے نام سے رسٹ فنڈ قائم کر لیا تھا۔ اسکول کے بچے اسے اسپورٹس ایونٹس پر بلارہے تھے۔ وہ اسے اپنے جیب خرچ سے فنڈز دے رہے تھے۔ جو اسے دو ڈالر دینے کے لیے بھی بلارہا تھا، وہ وہاں بھی جا رہی تھی، جو اسے پانچ ڈالر دے رہا تھا، وہ اسے بھی کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ ماما پاپا، فیملی فرینڈز، یونیورسٹی فیلوز، سب جتنا دے سکتے تھے، دے دیا تھا۔

سوشل میڈیا پر اسے سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا جا رہا تھا۔ اس کی چھٹی زندگی کا ریکارڈ ایسا رہا تھا کہ اس فنڈ ریزنگ کو سب اس کا ڈرامہ قرار دے رہے تھے۔ وہ بیمار نہیں ہے، سر کے بال صاف کروا کر بیماری کا ڈھونگ جا رہی ہے۔ شہرت کے لیے لوگ گردنیں کٹوا دینے کے لیے تیار تھے، وہ تو پھر بیماری کا ڈھونگ جا رہی تھی۔

جو جتنا اچھا ہوتا ہے، اسے اس سے کہیں زیادہ برائی ملتی ہے۔ یہ دنیا کا دستور ہے، روایت ہے، رواج ہے۔ بس..... یہ ہوگا، ہر حال میں ہوگا..... وہ جنت توڑ جواب دینے والوں میں سے تھی لیکن اب اس نے خاموشی اپنائی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی زبان بھی انویسٹ کر چکی تھی۔ کلام، اور بد کلامی بھی۔ اسے ویس نہیں دینی تھیں، بحث نہیں کرنا تھی۔ وہ بہت تکلیف میں بھی ہوتی تو فیم کو ہاں کہہ دیتی تھی۔ کسی تقریب، ایونٹ یا انٹرویو کے دوران اس کا سر چکرا رہا ہوتا تب بھی وہ صبر کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اسے فنڈز دیے جا رہے تھے۔ کم بہت، کمزوری، بہانے، یہ سب بھی اس نے انویسٹ کر دیے تھے۔ اسے وقت کی چھوٹ دی جاتی تھی لیکن وہ وقت کی پابندی کرنا مناسب سمجھتی تھی۔

”تمہارے پاپا کہتے ہیں، میں نے ساری زندگی اتنا کام نہیں کیا جتنا ہڈی کر رہی ہے۔“ ماما حیران تھیں۔



”ہاں..... اور اب تمہیں سب سے خاص چیز انویٹ کرنا ہے۔“

اجھاوہ کیا ہے؟

”یقین..... ام یقین.....“

☆☆☆

زندگی ایک سفر ہے..... اللہ کی پہچان کا

سفر۔

”انسان کمزور اتنا نہیں ہے، جتنا شاکی ہے۔ وہ بارہا جلدی نہیں ہے جتنی جلدی بارہا ماننا شروع کر دیتا ہے۔ دنیا کی بد نصیبی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے زندگی کو بند سوں میں قید کر لیا ہے۔ ایک سال، دو گھنٹے، پانچ منٹ، بیس سیکنڈ، ہر چیز تک پر آگئی ہے۔ اسی تک تک نے انسان کو بے صبر بنا دیا ہے۔ مشکلوں، مصیبتوں، دعاؤں کی قبولیت، معجزوں کی رونمائی کو بھی سیکنڈز کا سی الٹی میٹم دیا جاتا ہے۔

اس بیماری سے لڑتے ہوئے، اسے پورے اٹھارہ مہینے ہو چکے تھے۔ اکثر وہ خود بھی بھول جاتی تھی کہ وہ بھی ہسپتال سے باہر بھی زندگی گزار رہی تھی۔ مابں رونے لگتی۔ بابا کا دل بند ہونے لگتا تھا۔ لیکن پھر اس کی حالت خفجیل جاتی تھی، وہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ موت کا آنا اس لیے، اس کا ہونا اس لیے۔

نیشن دعاؤں کی خیر اس کے ساتھ رہی تھی۔ یقیناً وہ جانتی تھی کہ اسے کہا گیا تھا کہ وہ بمشکل سات آٹھ مہینے زندہ رہے گی اور وہ ٹریٹمنٹ شروع نہ کروانی، بہت سے کام نہ لیتی تو آج کہانی مختلف ہوتی۔ ہم اپنی زندگی کی کہانیوں کے واقعات بدل سکتے ہیں۔ انسان کے اختیارات محدود ہو سکتے ہیں لیکن اس کی کوشش بھی محدود نہیں ہوتی۔ کس نے کہا بیمار ہمیشہ بیمار رہے گا؟ کون۔ بہت کر سکتا ہے کہ مصیبت زدہ کی مصیبتیں بھی ختم نہیں ہوں گی؟ انسان کے حوصلے بلند ہونے چاہئیں، پہاڑ ہوں یا صحرا۔ سب فتح ہیں

اس کے سامنے۔

اس کی کتاب کے پانچ باب تیار ہو چکے تھے۔ ”اسے اپنی زندگی میں ہی شائع کروالو۔“

ایک بار اس کی دوست کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ ادا کی سے ہنس دی تھی۔ دوست شرمندہ تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس میں اس کی دوست کا نہیں اس اعتقاد کا قصور ہے جس نے سب کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گی۔

کامگو میں ہسپتال کی بلڈنگ بھی تیار ہو رہی تھی۔ اسے وہاں بلایا جا رہا تھا لیکن وہ فی الحال سفر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی سالگرہ آ رہی تھی اور اسے دعوت دی جا رہی تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ آکر منائے۔ وہ چھبیس سال کی ہونے والی تھی۔ لیکن اگر کوئی اس سے اس کی اصل عمر پوچھتا تو وہ کہتی ہے کہ ”دو سو سال، اور شاید کچھ مہینے۔“ دو سالوں میں اس نے دو سو سال کی زندگی جی لی تھی۔ زندگی مندرج کا نام نہیں ہے، بچپن، جوانی، بڑھاپا..... یہ منازل کا نام ہے، شعور، آگاہی، زندہ دلی، روحانی بے داری اور اطمینان۔

زندگی ایسی کہانی ہے جو ہر روز کہی جاتی ہے اور مسلسل کہی جا رہی ہے۔ اپنی کہانی وہ کہتی رہی اور دوسروں کی سنتی رہی۔ اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملتی رہی۔ ٹرائی روم میں کپڑے ٹرائی کرتی رہی، لپ اسٹک کے شیڈز اور جوتوں کے اسٹاکل بھی دیکھتی رہی۔ لیکن اب وہ برائے پرستی تھی، اب وہ بھی ”انوروز“ نہیں کر سکتی کہہ کر چیزیں ایک طرف کر دیتی تھی۔ وہ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتی تھی، ایسے اپنے کھانے سے چھپی زیادہ فنڈز کی فکر رہتی تھی۔ وہ فنڈز خرچی سے ”فلاحی خرچ“ کی طرف آگئی تھی۔ یہ اس کی روحانی ترقی، اور شعور کی آگاہی کی وجہ سے ہوا تھا۔

دو روز ٹریپس پر لائٹ وغیرہ کے ساتھ گئی تھی۔ ”کلاس فیلوز کی شادیاں بھی اینڈ کی تھیں۔ چھوٹے سے ایک ایکسڈنٹ میں ایک دوست کے ”دھڑ



دانتوں مفارقت دے گئے تھے، ان کا افسوس کرنے کے لیے بھی جانا پڑا تھا۔ چونکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ دنیا کی بد صورت ترین لڑکی بن چکی ہے اور معنوی دانت بھی اس کی بد صورتی کم کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکے، تو وہ اسے اس کی بد صورتی یا بد دلانے لگی تھی۔ تین دن تک کمرہ بند کر کے روئے کے بعد وہ ڈپریشن میں چلی گئی تھی۔ اس کا دنا تھا کہ معنوی دانتوں کی مسکراہٹ بہت "ٹیک" لگتی ہے۔ ان میں وہ بات نہیں۔

بات بس اتنی سی ہے کہ ہم نے خود کو اتنا زیادہ پرفیکٹ بنا لیا ہے، کہ ذرا سا نقص ہماری نیندیں اڑا دیتا ہے، سکون تباہ کر دیتا ہے، ہمیں ڈپریشن کا مریض بنا دیتا ہے۔ پریکشن اور خوبصورتی کے بھوت نے اصل زندگی کا خون پینا اور گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔

اس دو سو سالہ زندگی میں اس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ زندگی اور موت ہمیشہ برابری کا سلوک کرتی ہیں۔ دنیا کا نظام کسی "عام" انسان کے مرنے پر نہیں دکتا تو "خاص" کے مرنے پر بھی چلتا رہتا ہے۔ برابری.....

سورج ہر روز اپنے وقت پر لکھتا رہتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ڈھلتی ہے، رات چھا جاتی ہے۔ چاند ستارے، ہوا، دھوپ، پانی، درخت، جنگل، پہاڑ، پرندے، ہر چیز اپنی ڈیوٹی دیتی رہتی ہے۔ کوئی ایک بھی، ایک دن کی چھٹی نہیں کرتا۔ یہ سب نشانیاں انسان کو یہ سبق دیتی ہیں کہ گمراہ نہیں۔ ہمارے ساتھ زندہ رہو۔ دیکھو ہم اپنے کام سے، اپنے مقصد سے ایک بھی دن کی چھٹی نہیں لیتے۔ ہم ہمیشہ اپنا کام کرتے رہے ہیں، تم انسان ہو، تمہارے پاس سب سے خاص کام ہیں کرنے کے لیے، تم وہ کرتے رہو، زندگی کو تم کے سہارے نہ گزارو، زندگی کو زندگی بنا کر نہ۔ کتنا روؤ گے، کتنا دکھی ہو گے؟ کتنا یاد کرو گے؟ کتنا بچھاؤ گے؟ رہنے دو۔ آگے بڑھ جاؤ۔

آگے بڑھ کر وہ ہر اس شے سے مکمل چکی تھی

جو "زندگی" تھی۔

"تو تمہارے فرشتے کا کیا نام ہے؟" وہ سب لائٹ کے دادا کے گاؤں آئے تھے۔ کھانا وہ کھا چکے تھے اور اب آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے کافی لی رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے فرشتے کی کہانی سنا چکی تھی۔

"نام.....؟ میں نے اس کا نام نہیں پوچھا۔ مجھے لگا کہ فرشتہ صرف فرشتہ ہی ہوتا ہے۔"

"جیسے انسان صرف انسان؟ ہر انسان کا ایک نام ہے تو فرشتوں کا کیوں نہیں؟" لائٹ اسے کم عقل ثابت کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔

وہ ہنس دی۔ اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ "اگر میں اسے نام دوں تو شاید ہدایت کا نام دوں۔" "یعنی گائیڈنس.....؟"

"خاص اللہ کی طرف سے ملنے والی "ہدایت"۔ یہ لفظ بہت گہرا ہے۔ گائیڈنس اس کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ میں اس کے معنی نہیں سمجھا سکوں گی..... ابھی بہت کم عقل ہوں میں۔"

"شکر ہے تم نے اپنے فرشتہ کا نام کسی براٹر سے متاثر ہو کر نہیں رکھ دیا۔"

پہلے وہ دھیسے سے اُسی اور پھر قہقہہ لگا دیا۔ "تم لوگ تجھے سات خون معاف کر دو گے لیکن میری فیشن ہسٹری معاف نہیں کرو گے؟"

"فیشن کوئی انسان ہوتا، تو اس وقت تمہارے پیچھے کھوار لے کر لگا ہوتا۔ تمہارا سر قلم کر کے ہی دم لیتا۔ کیسے کیسے تم نے اس بے چارے فیشن کی گردن نہیں مروڑی..... حال سے بے حال کر دیا۔ کسی جوگا نہیں چھوڑا ہے۔"

وہ ہنستی ہی رہی۔ آگ کا الاؤ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ یہ تو آج کا رواج ہے کہ وہی آئی پی لوگوں کو جان کی حفاظت کے لیے گارڈ رکھنے پڑتے ہیں۔ جبکہ یہ انسان کے زمین پر آنے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ اس کے ساتھ فرشتوں کو گارڈ



کیا میرا ہے..... کتنی بڑی گفٹوری حاصل ہے ہر انسان کو۔ اللہ کے لیے ہر انسان وی دی آئی نیا ہے۔

دو سال دو ہفتے گزر چکے ہیں۔۔۔۔۔  
ڈاکٹرز مایوس نہیں تھے لیکن۔۔۔۔۔ رپورٹس،  
دسٹج، جسم، ری ایکشن، ان کا کسی چیز پر بس نہیں  
تھا۔ اتنا کچھ جان کر بھی تو کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ ماما،  
بابا دونوں سو لی پر لٹکے رہتے تھے۔ جہاں وہ پڑی تھی  
تو پیچھے وہ بھی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے کوئی ایسی  
ترکیب نہیں چھوڑی تھی جو ان کی اولاد کی جان بچا  
سکتی۔ دنیا کے بازار میں ایک زعمی ہی تو نہیں تھی۔  
یہ اول بدل سے بھی نہیں ملتی، اور نہ ہی تلاش سے۔ یہ  
مجزرہ صرف اوپر سے ہوتا ہے۔

دوسرا ایک مہینہ گزر چکا ہے۔  
 "امید" یہ ایک ہری بھری شاہراہ ہے لیکن کبھی  
 امید جب ناامیدی میں بدلتی ہے تو تیز دھار کو اور میں  
 بدل جاتی ہے، کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی  
 ہے۔ یہ صرف بیماری ہی تو نہیں جیسا کہ اس کے  
 سانچہ آنے والے ہزاروں خدشے، خوف، بدلتے  
 انسانی رویے، بے بسی، چنی دباؤ بھی جھیلتا ہے۔  
 ایک جسم سے، ایک دماغ سے، ایک روح سے۔ دو  
 تین محاذوں پر اکیلا لڑ رہا ہوتا ہے۔  
 اس کے تینوں محاذ گزردہ پڑنے لگے تھے۔  
 مرنی اور پھر سے رودی تھی۔

دو اس کا صرف کرش تھا۔ صرف ایک کرش۔

چونکہ محبت کرنا جان جو سکھ کا کام ہے، اور کرش  
ہر کوئی برداشت کر سکتا ہے۔ اس لیے کچھ کرشن دہ بھی  
دکھتی تھی۔ "اس پر میرا کرش ہے۔" فریڈز رہا ہے تو  
ظاہر ہے یہ فریڈز اس نے بھی قہر لکھ لیا تھا۔ آٹھ دس پہلی  
وا سیر دہ پر، جس پانچس پاپ سکرز دہ چار ماڈلز، چند  
فٹ ہارن، کچھ آئی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی  
اس کے فریڈز سرکل میں سے تھا۔ جس کی شادی کی  
تصویریں دہ دیکھ رہی تھی۔ دہ جانتا بھی نہیں تھا کہ دہ

اسے پسند کرتی ہے۔ ایک بار وہ اس سے ملنے  
ہاسپٹل بھی آیا تھا۔ کردہ بیان نہ ہونی تو شاید اس سے  
اب.....

اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ یہ سہی  
کہ ہر چیز، ہر شخص پر سے اس کا حق ختم ہو چکا ہے  
اسے رلا رہی تھی۔ ساری دنیا اپنی اپنی پلاننگ پر چل  
رہی ہے، ایک اسی کی پلاننگ دھڑکی کی جہی ہوئی  
ہے، نے اسے پھر سے پرانی بدنی دنیا قلمبند  
بھر روتی رہی، رات بھر جاتی رہی۔ ایک ایک کسے  
ہر چیز ہی اس سے چھن چکی ہے۔

”تو کیا جو چیزیں تم سے چھن گئیں ان کے  
بدلے میں تمہیں ان سے بہتر چیزیں نہیں ملیں؟“  
فرشتہ پوچھ رہا تھا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا اور وہ بھی بند۔  
باتوں کے جواب نہیں ہوتے بدایت! وہ بس ہوتا  
ہیں۔ اور اس کر دیتی ہیں۔ دل تو زرد دیتی ہیں۔“

”تم پھر سے گزرتی رہی ہو بدنی دنیا میں؟“  
تمہیں لائنٹ لائن پر لٹ گیا ہے، اس دل شکنی سے  
کو دل بدل نہ سکنے دو۔“

”تمہیں اپنی محنت کے نتائج جاننے کا کمر  
ہو گیا؟“ اس نے طنز کیا۔ اس نے ایک لمبے عرصے  
کے بعد یہ رویہ اپنایا تھا۔

”میں تمہارا گارڈ ہوں۔ مجھے تم سے زیادہ  
کون عزیز ہو گا؟ تم سے زیادہ کس کی فکر ہوتی؟“

ہڈی نے گھر اس میں خینچا۔ ”سرسر خور رہا ہوں؟“  
ہوں۔ میں ہر وقت تمہیں گھسیٹ سکتی۔  
نے پڑ کر کہا۔

”ہڈی! تم ٹھیک ہو رہی ہو۔ تم کو زیادہ  
ہمت۔ بس تم کوئی سی اور۔“

پہلے تو وہ جھپٹی رہی اور پھر ایک دم سے  
اٹھی۔ مجھے جھوٹی امید نہ دو۔ میں کرو۔“

”ہو جاؤ۔“

فرشتہ دنگ اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔  
میری کچی سب باتیں بھلا کر دے۔“



زبان غنی شروع کر دی؟“  
 ”سر قہام کر بیٹھ چکی تھی۔“ نہیں..... لیکن مجھے  
 یہ مان لینے دو کہ میں اس بیماری سے نہیں نکل سکتی۔“  
 ”تم اس بیماری سے کیوں نہیں نکل سکتیں؟ تم  
 نے ایسا کیوں سوچا؟“

”کیونکہ اس کا علاج نہیں ہے..... مجھے دماغ  
 کا کینسر ہے، میرا کینسر اپنی نوعیت میں پیچیدہ ہے۔“  
 ”شفا سائنس کی زبان پر جتنی ہے نہ میڈیکل  
 رپورٹس کی۔ وہ بس کہتی ہے۔ واقع ہوتی ہے۔ آسمان  
 سے اترتی ہے۔ حکم بر عمل درآمد کرتی ہے۔“ اس نے  
 ایک درد بھرا سانس کھینچا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا  
 یقین رکھو۔“

”میں نے یقین رکھا ہے.....“ اس کی آواز تیز  
 تھی۔ ”رکھا ہے، لیکن پھر بھی..... یہ بہلاوا لگتا  
 ہے۔“

”جب انسان یقین کھو دیتا ہے تو وہ سسٹم کو  
 ریورس گیر (الٹا چلانا) پر چھوڑ دیتا ہے۔ پھر ہر شے،  
 ہر کام، ہر چیز انہی چال چلنے لگتا ہے۔“ مایوسی  
 کھڑے۔ ”یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ ریورس گیر سے  
 بچو۔ ایسا سمجھ لو کہ یہ انہی چال روحانی طاقت کو کھا جاتی  
 ہے، جیسے آگ سوکھی لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔ دنیا بھر  
 کے ڈاکٹر ز کا اس حقیقت پر یقین ہے کہ دوا، صرف  
 پانچ یا دس فیصد کام کرتی ہے، باقی انسان کی انرجی  
 کام کرتی ہے۔ اگر تم یقین رکھتی ہو کہ تم ٹھیک ہو جاؤ  
 گی تو دوا اپنا اثر بڑھانے لگتی ہے کیونکہ تمہارا سسٹم  
 ٹھیک کام کرنے لگتا ہے۔ تمہیں ہوا چاہیے تو تم فین  
 آن کرو گی، روشنی چاہیے تو لائٹ آن کرو گی، انسان کو  
 تندرستی چاہیے ہو تو وہ ”میں ٹھیک ہو جاؤں گا“ کا جن  
 آن کرے۔ اپنی طاقت کو بیدار رکھے۔ دوا اور اس  
 کی امید یہ دونوں مل کر اسے ٹھیک کر دیتے ہیں۔“

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ سسک رہی  
 تھی۔ وہ لمبے عرصے بعد اس حالت میں آئی تھی۔  
 ”میری کنڈیشن، رپورٹس۔“

”بیماریاں ہر زمانے میں لا علاج رہی ہیں

بدی اہر بیماری، ہر دور میں..... یہ تو آنے والے  
 وقت کے لوگوں کو قابل علاج لگنے لگی ہیں۔ فلو..... کیا  
 تم جانتی ہو کبھی یہ بیماری انسان کو خوفزدہ کر دیا کرتی  
 تھی؟ یہ وبا کی طرح پھیلی تھی اور اس نے لسٹوں کی  
 تسلیں ختم کر دی تھی۔ انفلوینزا..... کیا تم آج اس سے  
 خوفزدہ ہو؟“

”نہیں.....“ فرشتہ اسے حیران کر رہا تھا۔  
 ”کتنا ذہین گارڈ ہے میرا؟“ وہ سوچ رہی تھی۔

”اس پر یہ بیماری میڈیسن یا ویکسین سے ٹھیک  
 ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ بیماری موت کی دہشت تھی۔ یہ  
 میں ایک صدی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر میں چند  
 صدیاں اور پیچھے جاؤں تو ”گردن توڑ بخار“ یا سرخ  
 بخار انسان کی جان لے لیتا تھا۔ نمونیا، ٹی بی، پیٹ کا  
 درد، طاعون..... کیا آج تم ان بیماریوں سے خوف  
 زدہ ہو؟ یہ بیماریاں تب کینسر سے زیادہ خوفزدہ کر  
 دینے والی تھیں۔“

اس وقت کے انسان کو بھی یہی لگتا تھا کہ ان  
 بیماریوں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ مر جائے گا، کبھی  
 ٹھیک نہیں ہو گا۔ لیکن جو اس نظریے پر یقین نہیں  
 رکھتے تھے، وہ اس کی دوا ڈھونڈ رہے تھے۔ شفا ڈھونڈ  
 رہے تھے۔“

”نہ میں کوئی دوا بنا سکتی ہوں نہ شفا ڈھونڈ سکتی  
 ہوں۔ میں مریض ہوں۔ ڈاکٹر یا سائنس دان  
 نہیں۔“

”بیمار تو ہو۔ یہ بیمار ہے جو اپنے لیے شفا  
 منگواتا ہے۔ تم اللہ سے شفا مانگتے ہوئے اس کا  
 اختیار دیکھو، اپنی بیماری کی اسج نہیں۔ اپنی رائی کے  
 دانے سے بھی چھوٹی عقل سے، اپنے رب کی عظمت  
 کو نہ پرکھو۔ تمہارا شعور محدود ہے، اس کا اختیار  
 لامحدود۔“

سائنس نے ہمیشہ ثبوتوں کی زبان بولی ہے،  
 ثبوت..... پہلے زمین چٹنی (فلیٹ) تھی، لیکن جب  
 آلات بنے تو زمین بیضوی نکلی،..... کیوں؟ کیونکہ جو  
 اسے چٹنی مانتے تھے ان کے پاس آلات نہیں تھے۔



موت نہیں تھے، بس ایک جاہلانہ نظریہ تھا۔ جو عقل مند تھے وہ یقین رکھتے تھے کہ زمین کیا ہے، اللہ کا کیا ہے، کارخانہ خدا کیا ہے۔

عقل مندوں کے پاس موت نہیں ہوتے۔ پٹی ان کے پاس بس یقین ہوتا ہے۔ یاد رکھنا، یقین ہمیشہ عقل والے کے پاس ہوگا، جس کا شعور جاگتا ہے، وہ نشانیوں سے حقیقت کو پالیں گے۔ ہائی لوگ موت ہی اوسط تے رہ جائیں گے۔ جن کے پاس شعور نہیں تھا ان کے خدا سورج، چاند، ستارے تھے۔ جن کے پاس شعور تھا، ان کا خدا ”سچا“ تھا۔ یقین اسے ہی کہتے ہیں کہ جو دکھائی نہ دے، لیکن موجود ہو۔ جو وہ نہ سکے لیکن ”ہو“۔

اگر انسان کچھ کرنا چاہتا ہے، تو اللہ اس سے وہ کروانا چاہتا ہے پٹی انسان سے پہلے یہ چاہت، اللہ کی چاہت ہوتی ہے۔ پھر یہ چاہت زمین پر پہنچی جاتی ہے۔ یہ منتخب لوگوں کو سونپی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو حوصلہ نہیں ہارتے، ہار نہیں مانتے، اور یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ نہیں ہو سکا، دراصل وہی تو ”ہوتا“ ہے۔

تمہاری بیماری کے لیے بھی خدا کی چاہت موجود ہے..... کیا تم وہ زمین چلا سکتی ہو؟

خدا کی چاہت..... یہ انسان کے نفع کے سوا کیا ہو سکتی ہے بھلا؟

کوئی نہیں جانتا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ انہوں نے دن گئے تھے نہ مہینے۔ رات کی تنہائی، یا دن کے داویلے انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی توجہ آسمان والے کی مرضی سے ہٹنے نہیں دی تھی۔ شہر میں رزق کی تلاش میں، رات میں شفا کی پکار میں، انہوں نے اپنے دلوں کو شک، وہم اور وسوسوں سے پاک رکھا تھا۔

آج کی رات انہوں نے حمد کے بعد خدا کی چاہت کی بات کر لے کا عزم رکھا۔ ان کے ہاتھ بلند تھے، آنکھوں سے آنکھ رواں تھے، ان کی رو میں

نہ پڑ رہی تھیں، اور وہ خدا کی چاہت کو سن رہے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ساری دنیا ہٹا کر، اپنے لیے اپنا شک، منار، صرف ایک ذات کا ہاتھ بٹھائے تھے۔ دعا کر رہے تھے۔

”ہم بھی یہ جان نہیں پاتے کہ آسمان کی جیلا دکھائی دیتا ہے وہ رات کو، دلوں کے لیے گناہ کا اچھا یہ وہ راز ہے جسے سب رات کہتے ہیں، انہوں نے جتنی بھی تار یک ہو، کتنی بھی لپی ہو، وہ دونوں کی رکتی ہے۔ وہ دن کی نوید بھی رکتی ہے، کیونکہ کھائی بھی شے کو حاصل نہیں۔ پھر کوڑھ کو بیگنی کے ماس ہو سکتی ہے؟ یہ بھی جلد مٹ جائے گا۔ کیا خدا اشارہ ہے اور یہی اس کی چاہت۔ سورج، چاند، روشنی جیسا دیتی ہے، لیکن جلائی نہیں، مٹا دیتی ہے، ایسی عقل، پر حیران ہوں جو پکار پیاں صرف کر نہیں سکتی ہے۔

روشنی..... یہ کائنات کا اندھروں کے انزلام ہے۔ پھر ہماری ذات کے اندھروں کے لیے کیسے محروم رہ سکتے ہیں؟ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہماری روشنی موجود ہے۔ وہ ہم تک آ رہی ہے۔ خدا کی چاہت ہے۔

”وہ ہم تک آ رہی ہے۔ وہ ہم تک آ چکا ہے۔ وہ کامل یقین سے ہار ہار کہہ رہے تھے۔ دور ہے غم، ہم نے شک کیا اور یقین کو بے نیچو لیا۔ ہم تجھ سے دور ہو گئے، غیر حاضر رہے۔ ہمیشہ قریب رہا اور موجود رہا۔ یہ حیرت انگیز پیار بھی۔ ہمارے ہاتھ بلند ہیں اور یہ صرف حیرت کی طرف بلند ہیں۔ آسمان کی سب چیزیں زمین چیزوں سے افضل ہیں، ہمیں بھی آسمانوں سے زمین پر بھیجا گیا، ہماری عزت بھی دیں سے آ والی ہے۔ زمین کے اس عارضی بڑاؤ کے لیے آسمان سے اپنے لیے سب سے ”افضل“ چیز کی دیاں لگتے ہیں۔ حیرت چاہت کی۔ اے عظیم رب اگر یہ کوڑھ حیرت چاہت ہے۔



میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا سب کوڑھیوں نے اپنی قبریں کھود کر خود کو دفنایا ہے۔  
”پہاڑ کیوں توڑے گی، اپنے لیے آسمان کے دروازے کھولے گی۔“

والد سمجھ نہیں پارے تھے کہ دیسا سے لوگوں کی نفرت کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ جرات مند ہے؟ یا اس لیے کہ وہ عقل مند اور باشعور ہے؟ یا اس لیے کہ اس نے کوڑھی ہونے پر بھی کوڑھیوں جیسی زندگی نہیں گزاری۔ اس نے لوگوں سے بھگ اور ان سے ان کا رحم نہیں مانگا۔ وہ بد صورت ہو کر بھی بہادر رہی۔ وہ زخم خوردہ ہو کر بھی زخمی نہیں ہوئی۔ ہر انسان اپنا عروج اور دوسرے کا زوال ہی کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟ ہر انسان۔ لفظوں میں ”لغت“ اور اعمال میں ”کوڑھ“ کا انتخاب ہی کیوں کرتا ہے؟

وہ لوگ جو بھی کسی کوڑھی کی خبر لینے کے لیے گھائیوں میں نہیں گئے تھے وہ لوگ اب نوہ لینے کے لیے گئے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ سب بیمار خانہ میں بند ہو کر، رات دن عبادت کر رہے ہیں۔ بھوکے، پیاسے، تکلیف سے تر پڑے، پاگل، بیکے ہوئے، لعنتی، بد بخت۔ آخر کس چیز نے انہیں اتنا یقین دلا دیا ہے کہ وہ ضرور کچھ پائی لیں گے، ضرور کچھ لے کر ہی انھیں گے۔ کیا چاہیے انہیں؟ جو بھی چاہیے..... وہ انہیں بھی نہیں مل سکتا۔

”تم نے ہر حال میں اپنی بیٹی کا دفاع کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔“

”بھی ڈھال کو تلواریں بننے دیکھا ہے؟“ والد نے پوچھا۔ ”باپ ہوں اس کا، تمہیں اس کی خوش نصیبی پر شک ہو سکتا ہے، مجھے نہیں۔“

”تم دونوں خوش نصیب باپ بیٹی! یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ خدا کے لیے کوڑھی کیسی کسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ خدا ان سے پوچھے۔ ایک کوڑھی کہہ رہا تھا کہ ہم اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہیں یہ سکھار ہی تمہاری بیٹی انہیں۔“

”جو ٹھیک ہے..... وہی سکھار ہی ہے..... مجھے

بہن قبول ہے، اگر یہ کوڑھ ہماری سزا ہے، تو ہمیں سہائی اور اگر یہ ہماری آزمائش ہے تو ہمیں آسانی مطلوب ہے۔ لیکن اے رب! اگر اس پر تیری مرضی یکجہ اور ہے تو ہمیں وہ مرضی مقصود ہے۔“ وہ سسک رہی تھی۔

”ہمیں وہ مرضی مطلوب ہے۔“ وہ سب ایک زبان کہہ رہے تھے۔ ان کے زونگنے کی آواز نہیں تھی، بس آہیں تھیں۔ ان کے غلیظ جیسوں کے اندر، بدبو دار زخموں کی تہہ میں، اندھیروں میں روشنی ہو رہی تھی۔

”کائنات کے تمام امور خدا کے حکم سے انجام پاتے ہیں، یہ بیماری، اس کی شفا پر اپنا حکم واجب کر دے۔ انسان کی ساری حقیقت بس یہی ہے کہ اس کا ”ایک رب“ ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے اور یہی اس کا نفع۔ اے رب! اگر تو راستہ نہ دے تو ہماری جانوں کا بچنا محال ہے۔ جیسے اگر مینا کی نصیب نہ ہو تو دیکھنا محال ہے۔ ہم دانا نہیں، ہم پینا بھی نہیں، ہم تو طلب گار ہیں، اس چاہت کہ جو تیرے پاس ہے، اور جو ہمارا نصیب، ہمارا مقصود ہے۔ وہ جو ہمارا نفع ہے، اور ہمیں ہی دیا جانے والا ہے۔ یہی ہماری طلب ہے، اور یہی ہماری ”دعا“ ہے۔“

اللہ کو کوئی چیز اتنی عزیز نہیں جتنی دعا۔

وہ رات بھر روتی رہی۔ وہ دن بھر کہتی رہی۔

یہی دعا جو دیسا نے کہی، یہی دعا بدی نے کہی۔

اللہ کو کوئی آواز اتنی محبوب نہیں..... جتنی طلب گار کی صدا۔

دن کی روشنی میں، رات کے اندھیروں میں، ان سب نے رب سے بس یہی کلام کیا۔ اپنا ارتکاز ٹوٹے نہیں دیا۔ اپنا مطلوب چھوٹے نہیں دیا۔ ان کی چاہت، اللہ کی چاہت وہ ایک ہو جانے کو کہ.....

”تو اب ایسے غاروں میں بیٹھ کر تمہاری بیٹی کیا پہاڑ توڑے گی؟ دیکھو ذرا اس کے تماشے ہی ختم نہیں اور ہے۔“ تین دن گزر گئے تھے انہیں کوئی کوڑھی شہر



ہو سکتا ہے یہ۔“

”وہ ہاتھ لگاتے ہیں اور۔۔۔“

اور والد۔۔۔۔۔ وہ پوری شدت سے جلا وطن تھے۔ ”میں یقین رکھتا ہوں، یہ ایسے ہی ہو گا۔ میں یقین رکھتا ہوں۔“ وہ ایک دم سے بھونک پھوٹ کر رو دیے۔ سارا ہجوم ان کی ہچکیاں سننے لگا۔ ”میری تو یقین کروں گا۔ اس معجزے پر، اس شفا پر۔۔۔۔۔“

اس رات دیسا کے کوڑھ کا سن کر اس کا بھائی شہر میں دیسا، دیسا پکارتا، روتا، مچلتا، بھاگتا پھرتا تھا۔ اس دن دیسا کے والد۔۔۔۔۔ دیسا۔۔۔۔۔ دیسا چلاتے ہوئے شہر سے باہر، گھائیوں کی طرف بھاگے جانے لگے۔ وہ رو دتے جاتے تھے، اور کہتے جاتے تھے۔ ”دیسا۔۔۔۔۔ میری دیسا۔۔۔۔۔ تمہارا معجزہ۔۔۔۔۔ تمہاری شفا۔۔۔۔۔ زمین پر آ چکی ہے۔“

”اللہ کی مرضی۔۔۔۔۔ اس کی چاہت، وہ تم سب کی جھولیوں میں ڈال دی گئی ہے۔“

اس دن گھائیوں میں یہ آوازیں دن بھر گونجتی رہیں۔ والد جوش مسرت سے چلاتے رہے، روئے رہے، اور مسکراتے رہے۔ گھائیوں سے باہر نکلتے ہوئے سندرست انسان کو اس معجزے پر یقین نہیں تھا۔ شہر تھا تو صرف کوڑھیوں کو ہی تھا۔ وہی تھے اس معجزے پر سب سے پہلے ”ایمان“ لانے والے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ”یقین“ کسے کہتے ہیں۔ اور وہ جانتے تھے کہ ”معجزے“ کن کے لیے ہوتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

”کیونکہ میں جان گئی ہوں کہ یقین کے لیے جتے ہیں اور معجزے کن کے لیے ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ہر انسان کے لیے۔ اللہ کی طرف سے میرے لیے۔“ روتے ہوئے بدی نے اپنی دعا مکمل کی۔

دو سال چار مہینے گزر چکے ہیں۔ یقین ”کتاب عمل“ ہو چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

”نہ ہے اس پر۔“

”جاؤ اور ہا کر اس سے کہو ٹیل دو گلوے ہو سکتا ہے لیکن کوڑھی شفا یاب نہیں ہو سکتا۔ وہ پتھروں سے اپنا سر پھوڑ پھوڑ کر مر جائے گی لیکن اپنے ایک زخم سے بھی جان نہیں چھڑا پائے گی۔ میرے بس میں ہو تو میں سب کوڑھیوں کو اٹھا اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں۔ ساری زمین کو غلاظت سے بھر دیا ہے۔ اب نگے ہیں شور شرابا کرنے۔ داویلا چانے۔“

والد کی آنکھیں یکدم نم ہو گئیں۔ انہیں دیسا کی بیماری کا ایسا غم نہیں تھا، جتنا ان باتوں کا تھا۔ اس کے زخم ایسے بد صورت نہیں تھے، جتنے لوگوں کے لفظ تھے۔ وہ کس کس کا منہ توڑتے۔ کس کس سے جا کر کہتے کہ جب ہو جاؤ، وہ میرے دل کا سکون ہے، اسے کچھ نہ کہو۔ وہ بیمار ہو گئی ہے، شہر بدر ہو چکی ہے، خدا کو راضی کر رہی ہے۔۔۔۔۔ اب تو چپ رہو۔۔۔۔۔ کچھ تو رحم کرو۔

بلند گھائیوں میں سجدے میں گر کر روتی دیسا۔ بلند گھائیوں سے پرے۔۔۔۔۔ شہر کے ہجوم میں

سکتے والد۔۔۔۔۔

اس کی چاہت کہ وہ عرش ہلا دے۔۔۔۔۔ ان کی تڑپ کہ وہ زمین والوں کو دکھادیں کہ۔۔۔۔۔

”کوڑھ۔۔۔۔۔ کیا اس شہر میں بھی کوئی کوڑھی ہے؟“ مسافر گھڑ سوار نے ان کی باتیں سن لی تھیں شاید۔

والد نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا۔ ”اسی شہر میں تو سب سے زیادہ ہیں۔ کیوں؟“ ان کی آواز کا پتہ لگی تھی۔

”اس شہر تک خبر نہیں پہنچی؟ ان کے ہاتھوں میں کوڑھ کی شفا دی ہے اللہ نے۔۔۔۔۔ معجزہ۔۔۔۔۔ ایسا کہتا ہے مسیح کا۔ اللہ کے نبی کا۔“

ہجوم کو سانپ سوگتے گیا تھا۔ چند لوگ ہنس دے تھے۔ چند نے گردنیں جھٹکی تھیں۔ ”کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہے ہو، کوڑھ لا علاج مرض ہے، کیسے ٹھیک



ہوں گے۔“

والد خاموش رہے۔۔۔۔۔ دنیا سے پھول بھی ختم نہیں ہو سکتے۔ ایسے ہی جیسے کانٹے بھی ختم نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

دبیسہ کی دعا، ہڈی کی دعا، دبیسہ کا یقین، ہڈی کا یقین۔۔۔۔۔ وہ جو کچھ دے سکتی تھی، وہ دے کر اس نے۔

وہ ہاسپٹل کی زیر تعمیر عمارت دیکھنے کے لیے کانٹو آئی تھی۔ اسے سفر کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح سے ڈاکٹر کو بہلا کر آ گئی تھی۔ ماما، بابا اور اس کے سب دوست اس کے ساتھ تھے۔

اسکول کے بچوں اور بیمار بچوں نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی خوش نہیں ہوئی تھی، جتنی وہاں جا کر، بچوں سے مل کر، ان کی مسکراہٹیں دیکھ کر ہوئی تھی۔ عمارتیں، ہاسپٹل، فلاحی ادارے۔۔۔۔۔ یہ بنتے ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔ انسان بس ذریعہ ہوتا ہے، اصل کام تو آسمان سے ہوتا ہے۔ لیکن انسانیت۔۔۔۔۔ انسانیت کی عمارت۔۔۔۔۔ یہ انسان کو خود تعمیر کرنا پڑتی ہے۔ کبھی اس کا درجہ اور تہ بلند ہوتا ہے۔

وہ سکون کی اس بلندی پر تھی کہ خود بھی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ انہوں نے بچوں کے ساتھ کیک کاٹے، اپنی بھدی آوازوں میں گانے گا کر سنائے اور بے کار کے ڈراپے پیش کیے۔ بچے ہنستے رہے، وہ بھی ہنستے رہے۔ دو تیس ہٹا کر انہوں نے فٹ بال کا میچ کھیلا شروع کیا تھا اور۔۔۔۔۔ جب وہ فٹ بال کو کلک لگانے کی کوشش کر رہی تھی تبھی اسے آسمان گھومتا ہوئی دکھائی دیا۔۔۔۔۔ وہ چکر اکر گر گئی۔

وہ پندرہ دن سے ہاسپٹل میں ہے۔ یہ کانٹو کا ہی ایک فلاحی اسپتال تھا۔ اسے واپس نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔ کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ موت کی اس قسم۔۔۔۔۔ نیند کی اس سنگ دلی ہے وہ کب لوٹے گی۔

وہ بار بار کومہ میں جا رہی تھی۔ اس کا ہوش میں آنا بھی گہری نیند کی ہی قسم تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا سکون تھا، جو اسی فیض کو حاصل ہو سکتا ہے، جس نے

سمندر کی وسعت میں، کشتی کے بادبان کے ساتھ کھڑے ہو کر دبیسہ نے دور کنارے پر کھڑے والد کو دیکھا۔ وہ خوشی سے رو دی تھی۔ اس کے سر پر اس کا پرندہ چل رہا تھا۔ اس کی طرح وہ بھی خوش تھا۔ یہ پرندہ ہی ان سب کو آگے کا راستہ دکھانے والا تھا۔ وہ سب ایک لمبے سفر پر جا رہے تھے۔ وہ اپنے میسا سے اپنی شفا لینے جا رہے تھے۔

سمندر کے پانیوں پر اڑتا پرندہ۔۔۔۔۔ وہ سبز شاخ لے کر آنے والا تھا۔

”ایک لمبا سفر ہے جو انہیں کرنا ہو گا۔“ کنارے پر کھڑے والد بڑبڑائے۔ ”کھنکھن اور مشکل۔ درد ناک اور مصیبت زدہ۔ یہ گریں گے، روئیں گے، طوفان ان سے ٹکرائیں گے، سرد ہوائیں انہیں بے حال کر س گی، لوگوں کے طعنے اور ان سے دھکار پائیں گے لیکن یہ یقیناً چلتے رہیں گے۔ اپنا سفر روکیں گے نہیں کیونکہ یہ جان چکے ہیں کہ روشنی انہیں ہی ملتی ہے، جو اندھیروں سے ٹپکنے کی ٹیک دو کرتے ہیں۔“

کشتی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ کوڑھی۔۔۔۔۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے جا رہے تھے۔ ان کی واپسی کے انتظار میں والد پھولوں سے بھری نوکری شہر کے دروازے پر رکھ کر انتظار کرتے تھے۔ وہ بلندی پر چڑھ کر بیٹھ جاتے اور اپنی دبیسہ کی راہ دیکھتے۔۔۔۔۔ ایک سال تین مہینے گزر چکے تھے۔ ایک صدی بھی گزر جاتی تو کبھی وہ مایوس نہ ہوتے۔ سمندر کی وسعت، زمین کا پھیلاؤ، یہ باپ کی محبت کو مات نہیں دے سکتا تھا۔

یہ قصہ بھی پرانا ہو چکا تھا کہ کبھی ان گھائیوں میں کوڑھی رہتے تھے۔ پھر وہ اللہ کے نبی کی تلاش میں نکلے۔ نہ پہلے کسی کو ان کی پروا تھی، نہ اب بھی۔ نہ پہلے انہیں یقین تھا کہ یہ بیماری ٹھیک بھی ہو سکتی ہے اور نہ اب تھا۔

”پھول تو زلزلہ کرتے ہیں دنیا جہاں کے سارے بار اُجاڑ دیے۔ اب تک تو وہ سب مرکب چکے



زندگی کے فسون کو دل سے اتار پھینکا ہو۔ جس نے  
فکروے شکایتوں کو آگ لگا دی ہو۔ جس نے حقیقی زندگی  
کے معنی سمجھ لیے ہوں۔ جس نے جان لیا ہو کہ زندگی  
بیشہ جاری رہتی ہے۔ زندگی کے ساتھ بھی اگر نہیں  
لگتا۔ اس جہاں اور اس جہاں، اور اس سے پہلے کہ  
جہاں۔ زندگی کے ساتھ بھی اگر نہیں لگا۔

موت۔۔۔۔۔ یہ تو بس ایک مرتبہ کا قصہ ہے۔  
باقی ساری کمائی تو بس زندگی ہی کی ہے۔  
یہ زندگی۔۔۔۔۔ انکی زندگی۔

ماں نے آسمان کی طرف دیکھا، اور باپ نے  
اس کی تھید کی۔۔۔۔۔ دل پر پتھر رکھ کر، دنیا جہاں کے  
خوف اور خدشات میں گھر کر انہوں نے انجکشن کی  
اجازت دے دی۔۔۔۔۔

ہو ہو ہو

”دیرسا۔۔۔۔۔“ بلندی پر بیٹھے والد نے، دور  
سمندر میں دکھائی دینے والی کشتی کو دیکھ کر چلا کر  
پکارا۔ کشتی تو ابھی بہت دور تھی۔

”ہڈی۔۔۔۔۔“ اس نے اس کے گل پر اپنا ہاتھ  
رکھ کر اسے تھپکا۔ اسے پکارا۔۔۔۔۔ ہڈی تو ابھی بہت  
دور تھی۔۔۔۔۔

دیرسا۔۔۔۔۔ میری جان۔۔۔۔۔ میرا پھول۔۔۔۔۔“  
والد چلاتے ہوئے اس کی طرف بھاگے۔ شہر والے  
متوجہ ہوئے بغیر نہیں رو سکے تھے۔

”ہڈی۔۔۔۔۔“ اسے مسلسل تھپک رہی  
تھی۔۔۔۔۔ آنکھیں کھلو۔۔۔۔۔“

ماں کی سانس اس کی سانس میں انکی تھی، باپ  
کی جان اس کی جان میں تھی۔۔۔۔۔

ہڈی۔۔۔۔۔ وہ پکار رہی تھی۔۔۔۔۔

”دیرسا۔۔۔۔۔“ والد کی پکار، والد کا پیار، والد کا  
جہاں۔۔۔۔۔ وہ کشتی کے ہاڈاں کے ساتھ کھڑی  
تھی۔ وہ نوکری سے پھولوں کو لال لال کر سمندر کی  
واڑوں کے سپرد کر رہے تھے۔ وہ سارے سمندر کو  
پھول کر دیں گے، وہ سارے جہاں سے کاٹے جن  
پیس گے۔ اس کے سارے بہن بھائی، اس کا نام پکار

پکار کر دیوانے ہو رہے تھے۔ ماں آتی تھی، مانی جاتی  
چلتی تھی۔ اسے آتی تھی، ہوش نہیں رہا تھا۔  
اپنی آنکھیں رگڑتی دیرسا۔۔۔۔۔ وہ سوجھی کے  
کتھارے پر کھٹے سے پہلے ہی، کھڑک پر چابی میں  
چھٹا تھیں ماری، والد کے سینے سے جا لگی تھی۔ اس کا  
حسن بے مثال تھا، اس کا تھال باکمال تھا۔

”میری آنکھیں کانور۔۔۔۔۔ میری دیرسا۔۔۔۔۔“  
ہڈی نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔۔۔ اسے وہ تجلی  
آنکھیں دکھائی دیں۔ وہ یہ آنکھیں پہلے بھی ہو چکی  
تھی۔۔۔۔۔ یہ آنکھیں۔۔۔۔۔

”میں اور میری ٹیم جھپٹے دو سال سے اس  
میڈسن پر کام کر رہے تھے۔ آپ بیمار ہیں، میری  
جس جس پر یہ میڈسن اپلائی کی جا رہی ہے۔ آنکھیں  
کھول دیں، پوری طرح سے ہوش میں آنے کو  
کوشش کریں۔“

ماں فرط جذبات سے اس پر جھک گئی۔ ”جڑنا  
ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم ہوش میں آ سکتی ہو۔ تو۔۔۔۔۔“  
اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔

”ہڈی! بہت دیر سے سو رہی ہیں آپ۔  
کیوں جاگ جائیں؟ آپ کو اچھا لگے گا۔ سر جھپٹے  
ہوں۔ ہیک شیٹے۔۔۔۔۔ مجھے بتایا گیا کہ سر آپ سے  
پہلے بھی مل چکی ہوں، آپ کو پھول لڑتی رقی ہو رہی  
آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔ آج سر آپ کا  
زندگی کی نوید دیتی ہوں۔ خوش آمدید۔“

اس کی آنکھیں کھل گئی۔ پوری طرح سے  
سامنے اس کا فریضہ کھڑا سر اٹھا ہاتھ، وہ فرما  
اس کا پرندہ خوشی سے ٹپک رہا تھا۔

دیرسا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھ لیا۔ ہڈی نے  
کھڑکی سے جھانکتے آسمان کو اپنے قریب ہوا  
”ہو زمین سے نہیں ہو جا، وہ آسمان سے  
ہوتا ہے۔ زمین نہیں۔۔۔۔۔ ضرور ہو جا ہے۔“





# حکایت

تالیہ خواب میں قانع کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عمرو سے پتا چلتا ہے کہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلکہ کر کے سرکھٹو آگتی ہے، مگر سکھ اس کے ہاتھ میں نہینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

قارض صاحب کے ذریعے قانع کو عالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے عالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور منصوبے میں قانع کو بھی شامل کرتا ہے۔ قانع اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اثر ہے۔ عالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

صبح تالیہ کو بلکہ میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، صبح کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ عالم جان پہ کھیل کے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چھو کر لاد لیتا ہے۔ قانع، عالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پر نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عمرو کو قانع اور اشعر دونوں آتے ہیں۔ قانع سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عمرو، تالیہ کی فرمائش پر اسے بھی بلا لیتی ہے۔ قانع سن باؤ کے گھر کی کہانی سنا رہا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کتوں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ قانع سے

PakiBooks.Site





کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ مگر وہ اسے پہچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ مصر وادوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے دل سے ہوسے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ حراحت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفن دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کیچڑی بتاتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کر لیا تھا۔

ایڈم ملای کہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم ملک میں ہر راستے میں فاتح کو پہنچاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر ہلندہ ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ وہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ چند ہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تھکے اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر مکمل جانتا ہے کہ تالیہ ہی عالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھارہی ہے اور اس نے تالیہ کے کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا قہقہہ ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مرادو بارہ چابی بنادے گا تو وہ اسے اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ماما کہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کسانے کی یہ خوشبود قدیم ماما کہ کے لوگوں کو توجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح ایڈم اور چابی کے زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ماما کہ کے ایک حیم خانے میں جاتے ہیں۔ تالیہ کو کئی ماما کہ کی انپارچ مسز ماریہ نے اس کا بریسلٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ بڑے

لے بدلتی لایا تھا۔ وہ مکمل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم کے تالیہ پر چوری کا لالہ الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسز ڈو لالہ آتے ہیں جو قصور اوقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا سن بچے لایا ہٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزارتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر کل کا اسٹج بناتی ہے۔ ذرا

اسے پہاڑ کا باب اور بک کا ایک شعبہ دیکھا کر متاثر کرتے ہیں۔ ڈو لالہ ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ لایا ہٹ کرنے نہیں آتا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھتا تھا اور موقع ملنے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسٹج بنوالی ہے۔ تو وہ لالہ اسٹج بنا کر اسے چھینتی ہے۔

تالیہ کو ہمارے یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا براسلوک یاد آتا ہے۔ اسے لا اور کے ایک گھر میں لے جاتا ہے۔ جہاں اس پر اس کی لاش کے نقل کا مجسمہ الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ

مالیہ کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے ہلا خروڈو لالہ کو ڈھونڈ لگا لیا تھا اور احسان مندی کے طور پر ڈو لالہ نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو "ابراہیم" نامی آدمی کے کارندے ایک منجر ہے میں قید کر کے محوڑا گاڑی کے ذریعے قید



مالک کے قتلے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کرنا چاہتی ہے۔ مگر قلعہ کو آزاد کرانے سے پہلے انوکا روٹ لے کر جاتا ہے۔ وہ دونوں قلعہ کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ قلعہ کو ایک قیدی خانے میں کھل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں ایک "لیڈ" تھری کے ساتھ برسلوگ کیا جاتا ہے۔

قیدی میں قلعہ کو اور ایک لائن بہت کم دور ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود دو حالات کے درمیان ہے۔ پھرنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی فیہانت سے وہ دونوں اپنے انوکا روٹ لے کر جاتے ہیں۔ یہاں تالیہ یہ افشانی لکھتا ہے کہ وہ خود اپنے انوکا روٹ لے کر جاتا ہے اور پھر اپنی بیٹی ہے۔ پھر اپنا امر اور اپنے ساتھیوں سے فراری کر کے ان کے پاس چلا رہا ہے اور خود باوجود اس کے کہ وہ انوکا روٹ لے کر جاتا ہے۔ تالیہ صدمہ سے چیر رہی ہے۔ اس کی چابی حاصل کر سکتی ہے اور وقت کا دورہ انداز دیا کر جاتی ہے۔ لیڈ مراد تالیہ کو اپنی بیٹی کا شریک حیثیت ہے۔

ایڈم، ان قلعہ کو ایڈم کی غلامی میں کام کرتے ہوئے موقع پر تالیہ کے پاس سے ملتا ہے۔ قلعہ تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلعہ کے کنہ اثر اور جن میں ایڈم بھی شامل ہے کو قتل کر کے مختلف مزارات سے ایڈم کو شادی کی سب سے کم کرنے کی ہرجائی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر جھکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چاہتی ہے کہ وہ اپنے باپ کی جگہ پر آجائے۔ لیڈ مراد کے خلاف طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خود قتل کر دیتا ہے۔ لیڈ مراد کو قتل کرنے کے بعد اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مراد تالیہ اس کی مکرر قتل ہوا چلا کر اس کی وفات اور قتل ہو جاتی ہے۔

مکہ یاں سینٹر جیٹس، بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مراد کی بیٹی ہے۔ مکہ کو ایک طاقتور عورت ہے اور اس کے ساتھ تالیہ پھر اپنا مراد ہے۔ جیٹس بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان قلعہ کو ایڈم اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ دیتا ہے۔ وہ اسے اچھی لگاؤ میں رکھتا ہے اور جیسے کہ سڑکی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، قلعہ سے طاقت کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جتنا چاہتی ہے کہ تالیہ اس میں اسے کہہ دے کہ وہ سب سے تھوڑے تھے مگر قلعہ نہیں دے۔ ایڈم "یڈم کا لیا ملا" کے نام سے کھانا کھاتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب کھلی شریوں میں اسے تالیہ کو تحصیل کرتی ہے۔

ایڈم شادی خواہی بنا جاتا ہے وہ بادشاہ کی زوجیت کرتا ہے۔ جہاں مکہ اور لیڈ مراد بھی جوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے ستر ہو جاتا ہے۔ مکہ یاں سو فو "وانگ" کی "کی شادی خواہی بنا جاتا ہے۔ مراد، لیڈ اور ایڈم۔ وان قلعہ جسٹس باؤ کے وانگ لی سے ستر ہے۔ موت میں من باؤ وانگ لی بھی سوچو رہا ہے۔ لیڈ اور ایڈم اس سے خطرہ محسوس کر کے قلعہ کے ہاتھوں سے زبردستی اسے مرقعہ وانگ لی کو خیردار کر دیتا ہے۔

قلعہ وانگ لی سے بے حد ستر ہے اور اسے خواہی دیکھتا جاتا ہے۔ مراد، لیڈ اور ایڈم کو خواہی دیکھنے کی ستر کر دیتی ہے۔ قلعہ کو یہ بات چو کر گزرتی ہے۔ تالیہ، ایڈم کو شادی سے ستر کر دیتی ہے۔ قلعہ تمام غلاموں میں اس کو اس کی جگہ چننا ہے اور اپنے ساتھ کا لیتا ہے۔ لیڈ مراد تمام ایڈم جوتوں پر بادشاہ کو قلعہ کے لیے آدھی قیمت کر دیتا ہے اور ہر دور اسے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شادی سے ستر ہے اپنی جھوٹی قریش کھوٹی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی حفاظت لیتی ہے تو اس پر افشانی ہو جاتی ہے کہ وہ بھڑکھڑا ہو کر کالی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، سجد کے نام پر ہر سال حاصل کرنے کے لیے روٹ لیتا ہے۔ راجہ مراد کہتی ہے۔ قلعہ کو ہاتھ مل جاتا ہے۔ وہ ہرجائی ہو جاتا ہے اور بڑائی میں وانگ لی کا مقام بنے کو ترجیح دیتا ہے۔ قلعہ جسٹس کی باتیں تاکر وانگ لی کو ستر کر دیتا ہے۔

یان سو فو کے والد کو بادشاہ مراد کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستقل قلعہ کا پانی چاہتی ہے۔ مگر شادی طیب آنا کافی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کر کے طیب کو مکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مکہ، تالیہ کی جاسوسی



کروا جاتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔  
 قاری کے کہنے پر محمود مرنی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی فضا  
 کابت قاری کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔  
 رجبہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر قاری کا دماغ  
 مگھوم جاتا ہے۔ رجبہ مراد کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کر داتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات  
 بجانب مکتی ہے اور فاتحہ کو خبردار کرتی ہے۔ رجبہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔

ملکہ یان سو فو کی کنیر یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔  
 تالیہ، عصر کو نیلائی والے دن گھاس غزال کی نقلی پینٹنگ کے اسکیڈل سے بچا لیتی ہے اور سن باد والے گھر کو کرائے  
 پر حاصل کرنے کی بات کرتی ہے۔ وان قاری ایڈم سے اس رات کی بابت دریافت کرتا ہے۔  
 تالیہ کے گھر سمجھ آتا ہے اور اسے دھمکا تا ہے۔ تالیہ اسے کہتی ہے کہ وہ اب اس سے ڈرتی نہیں ہے۔  
 وان قاری حاکم (تالیہ) کو فون کرتا ہے اور اس سے اس رات کے بارے میں معلومات کے لیے کہتا ہے۔  
 اشعرنا شتے پر تالیہ سے ملنے جاتا ہے وہاں رمی اس سے کہتا ہے کہ نقلی خریدار پینٹنگ کے پیسے مانگ رہا ہے۔ اشعر  
 اسے سخت ست کرتا ہے۔ تالیہ اشعر کو ہنسی ہنسی میں بہت کچھ جتا دیتی ہے۔ اشعر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا کر اس کی بات سنتا  
 ہے۔ تالیہ وان قاری کے آفس میں اس سے نوکری دلوانے کا کہتی ہے۔  
 ایڈم کی ماں اس سے کہتی ہے کہ وہ جلد از جلد نوکری ڈھونڈے ورنہ اس کی مستقبل ختم ہو جائے گی۔  
 تالیہ وان قاری کے آفس جاتی ہے وہاں سمجھ اسے بلیک میل کرتا ہے تو وہ واٹس روم میں اسے بلا کر اپنے ہیرے کے  
 تپس دے دیتی ہے۔  
 عصر کے بچے وان قاری کے کمرے سے چرائی فائل کے بارے میں جانتے ہیں۔ عصر خوف زدہ ہو جاتی ہے۔  
 بچوں کو دھمکا تی ہے۔

اب آگے پڑھیے۔

PakiBooks.Site

## انیسویں قسط

گیلے بالوں اور کپڑوں کے ساتھ گھرے  
 گھرے سانس لیتے ہوئے وہ اب ایک بھر پور چٹنی  
 انجوائے کرنا نظر آ رہا تھا۔

”قاری صاحب.... وان قاری!“

آوازوں سے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ  
 رپورٹرز نے اسے ڈھونڈ لیا ہے۔ اس نے بس مسکرا  
 کے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ مکھڑوں کی طرح اطراف سے اس  
 پہ جھپٹے۔ پل بھر میں سامنے پانچ چھ افراد جمع ہو گئے تھے۔  
 ایک دو نے چھتریاں تان کے باقی سب کو بھی بارش سے  
 بچا لیا تھا۔ کچھ چھترے آگے تھے۔  
 ”آپ نے کاغذات نامزدگی جمع کروا دیے“

حکام سے فون پہ بات کرتے ہوئے سرک پہ  
 تیز تیز چل رہا تھا جب بارش شروع ہوئی۔ ٹریک  
 سوٹ میں ملبوس کانوں میں وینڈز فری لگائے، اس

نے چہرہ اٹھا کے آسمان کو دیکھا، پھر قدم تیز کر دیے۔  
 قریب میں بس اسٹینڈ کا چھپر بنا تھا۔ قاری نے بات  
 جاری رکھتے ہوئے، جیب سے پانی کی گھیسی بوتل  
 نکالی اور شینڈ کی طرف آگیا۔

حاکم نے ایک دم سے کال کاٹ دی تو اس نے  
 برامانے بغیر وینڈز فری کانوں سے نکالے اور بیچ آ  
 بیٹھا۔ پھر بوتل لبوں سے لگائی اور موبائل کھول کر  
 دیکھنے لگا۔



ہے اور پھر الیکشن سے پہلے بہت سے کاغذات جمع کروائے جاتے ہیں۔“

ہینڈ زفری کانوں میں ڈالنا وہ فٹ پاتھ پہ آگے بڑھا تو رپورٹرز اپنے مائیک اس کی طرف بڑھائے لے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔

”آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اشعر صاحب صرف کورنگ امیدوار ہیں؟ اور وہ بعد میں کاغذات واپس لے لیں گے؟“ ایک لڑکے نے بلند آواز میں پوچھا۔ (کورنگ امیدوار دراصل امیدوار کا حامی ہوتا ہے اور اس لیے کاغذات جمع کروانا ہے تاکہ اگر اصل کے کاغذات مسترد ہو جائیں تو اس کا گروپ اس کو کھڑا کر سکے۔ مسترد کیے جانے کے فیصلے کے آنے تک کاغذات نامزد کی جمع کروانے کا وقت ختم ہو چکا ہوتا ہے۔)

”مگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنی جاکل مکمل کر لوں کیونکہ میرے سامنے ایک لمبا دن

ہیں۔ کیا آپ خود کو بی این کا اگلا حیر میں بننے دیکھ رہے ہیں جبکہ کچھ عرصہ پہلے تک آپ کے استعفیٰ کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔“

کسی نے مائیک اس کے چہرے کی طرف کیے سوال جھاڑا۔ وہ مسکرا کے پیچھے ہوا، ایک بازو شیخ کی پشت پر پھیلا یا اور ٹانگ سے ٹانگ جمالی۔

”وان فاتح استعفیٰ نہیں دے رہا... نہ دے گا۔ میں الیکشن لڑ رہا ہوں اور بالکل لڑ رہا ہوں۔“

”مگر کچھ عرصہ پہلے تک لوگ آپ سے یہ سوال پوچھتے تھے تو آپ جواب گول کر جاتے تھے۔ اب آپ بہت دھڑلے سے الیکشن لڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ کیا جب آپ کو لگتا تھا کہ آپ کو مخالفتوں کے باعث الیکشن سے دستبردار ہونا پڑے گا؟“

”دیکھیں الیکشن لڑنا تو میں اس دن چھوڑ دوں گا جس دن آپ کو اطلاع ملے گی کہ بعد نماز عصر دان

فاتح کا جنازہ ہے۔ ورنہ اس زندگی میں سیاست میں ایک دفعہ اتر جانے والا اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔“

بارش میں کھڑے رپورٹرز کا تہہ بہہ گونجا۔

”مگر فاتح صاحب..... جب سے آپ کی دکانیں جلی تھیں اور آپ کی انوسٹیٹ ڈوبی تھی عام تاثر یہ بن گیا تھا کہ آپ کے پاس الیکشن لڑنے کا پیسہ نہیں ہے۔ تو اب آپ کے مالی حالات کیسے ہیں؟“

”اب مصوفیہ زمین کی طرح میرے باپ نے بھی کرپشن کر کے لامحدود دولت اکٹھی کی ہوئی تو میرے مالی حالات کو اس آگ سے فرق نہ پڑتا مگر خیر.... میں الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں ہوں۔“

”فاتح صاحب یہ بتائیے۔“ دوسرے رپورٹر نے سانس لیے بغیر پوچھا۔ ”تازہ اطلاع ہے کہ کل اشعر محمود بھی حیر میں شب الیکشن کے لیے کاغذات جمع کرانے جا رہے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

فاتح نے جیب سے ہینڈ زفری نکالے اور ان کی گردہ کھولنا اٹھا۔ ”کاغذات جمع کروانا ہر ایک کا حق

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سچی ہنگر کی دہائی



وحشیہ جمیل

قیمت - 350/- روپے

مکتبہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، لدا ہار، کراچی



جھٹ مخر و ملی تھی۔

”آپ اندر آئیے۔ میں اسے جانی ہوں۔“  
ایسا اسکرٹ سے بندھے رد مال سے ہاتھ مٹا کر کھینچ کر  
اندروں کو لے گئیں۔

”ایڈم — ایڈم؟“ ہاں ایڈم کے گھر سے  
دروازہ تیزی سے کھول کے اندر داخل ہوئی تو دیکھا  
وہ اسٹڈی ٹیبل پر جھکا کچھ لکھتے میں مصروف تھا۔  
چیک والی سرنگی سرٹ پہنے، وہ سارے صحنے میں نور  
ہاں کود کچھ کے چہرہ موڑا اور بجائی روکی۔

”میں تاشتے کے لیے آئی رہا تھا۔“

”وہ باہر آئی ہے۔ کہہ رہی ہے ایڈم سے بات  
کرتی ہے۔“

”کون؟“ وہ چونکا۔ ”قادر؟“ بے یقینی سے رقم  
رکھا۔

”نہیں۔ وہ لڑکی جس نے تمہارے تیار کیا  
خواب سن کے آئین کہا تھا۔“

ایڈم بن محمد کی چند جانے سمجھ میں ہی نہیں آیا۔  
ہونٹوں کی طرح ہاں کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”کون؟“

”وہ جو اشعر صاحب کی پارٹی میں موجود تھو۔  
سنہرے بالوں والی۔“

ایڈم اتنی تیزی سے بوکھلا کے کھڑا ہوا کہ اس کی  
ہڈیاں جھنجھنے کی آواز آئی۔

”چے تالیہ؟“

”ہاں۔ یہ وہی ہے نا جو کسی کی نوکرانی تھی اور  
اب خاندانی رئیس بننے کی اداکاری کرتی ہے؟“

نے یاد کیا۔

”وہ کوئی نوکرانی وغیرہ نہیں ہے۔ وہ ایک کے  
اعلیٰ ترین شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔“

شہزادیوں سے بھی اعلیٰ ہے وہ۔ وہ بزرگ کے جلدی  
جلدی بولا تھا۔

تالیہ گیٹ کی طرف پٹے کئے کمز کی تھی جب  
وہ دوڑتا ہوا باہر آیا۔ اس کا لہجہ سرخ فرائی، سرخ  
ہیٹ اور بیچھے کرتے سنہری ہال یہاں سے دکھائی

ہے۔“ اس نے جواب دیے بغیر فون جیب میں ڈالا  
اور سنڈز فرمی کانوں میں لگاتے ہوئے قدم تیز کر  
دیے۔ صحافی مزید سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگے مگر وہ  
جلد ہی ان کے درمیان سے راستہ بنا تا۔ آہستہ  
آہستہ بھاگتا آگے نکل گیا۔

اور ایسے میں اس کے ذہن میں ایک خیال  
گردش کرنے لگا تھا۔

معطوم نہیں عالم نامی اس انویسٹی گیٹر کا کیا  
مسئلہ ہوگا؟

بار بار ذہن بھٹک کے اس ہی کی طرف جا رہا  
تھا۔

ہلہ ہلہ

ایڈم کے چھوٹے سے گھر کا باغیچہ اتوار کی صبح  
پھولوں سے مہک رہا تھا۔ مرغی گھاس پر چونچ مار رہی  
تھی اور چوڑے چوں چوں کرتے اس کے پیچھے  
بھاگ رہے تھے۔ دیوار پہ لوہے کی پارگی بھی جس کے  
باعث اب اب وہاں دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایڈم کی ہاں  
برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی تھالی میں میدہ لیے  
بیڑے بنا رہی تھی۔ بارش ختم ہوئے گھنٹہ بھر ہونے کو  
آیا تھا اور موسم خوشگوار تھا۔

اطلاعی خفیہ جی تو ہاں نے چونک کے سر اٹھایا۔  
بیڑے بناتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ سامنے گئے  
چھوٹے سے جنگلے نما گیٹ کے پار کمز لڑکی صاف  
دکھائی دیتی تھی۔ پاؤں کو چھو تا سرخ فرائی پہنے کبھی پہ  
بیک ڈالے، سر پہ ترچھا سفید ہیٹ رکھے ”وہ سنہرے  
بالوں والی لڑکی شناسما۔“

”سلام!“ سر کو خم دے کر سلام کیا تو ابو تھالی  
رکھ کے آنے سے تسخیر ہاتھوں کے ساتھ انھیں۔

”ہے۔۔۔“ دور کیں۔ اس کا نام کیا تھا؟ ذہن میں  
گڈمڈسا ہور رہا تھا۔ مگر وہ جلدی سے آگے آئیں اور مسکرا

کے دروازہ کھولا۔

”میں ایڈم سے ملنے آئی ہوں۔“ وہ ہانپکا کے  
بولی۔ ساتھ ہی نظروں سے ہانپے کا سناڑہ لیا۔ گھاس  
کے انعام پہ ماہی کی اہلی جیسا تھا سا کمر تھا جس کی



دیتے تھے۔ ایڈم نے شرمندگی سے اپنے چھوٹے  
بائیچے کو دیکھا، پھر ہاتھوں سے شرم کی نادیہ  
نہیں درست کیں اور کنگھارتا ہوا قریب آیا۔  
”پہنالیہ!“

وہ اس کی طرف کھوی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔  
تالیہ نے سفید ہیٹ ترچھا کیا تو اس کا چہرہ پورا نظر  
آیا۔ اس چہرے پہ صرف سادگی تھی۔  
”اندرا..... اندرا آئیے۔“

وہ گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ یعنی سڑک پہ۔  
ارد گرد چھوٹے گھروں کی قطار تھی اور لوگ آ جا رہے  
تھے۔ ایک لڑکی پر ام دھلیاتی آرہی تھی۔ ایک فربہ  
مانگل عورت سبزی و غیرہ کے تھیلے اٹھائے سامنے جا  
رہی تھی۔ ایک بوڑھا جوڑا خوش گوشت موسم کے باعث  
چہل قدمی کرتے نکلا ہوا تھا۔

”یہ عورت کبھی اس لڑکی جیسی ہوگی۔“ اس نے  
ایرو سے سامان اٹھائے چلتی عورت کی طرف اشارہ کیا  
تو ایڈم نے اس کی نکاہوں کے تعاقب میں پہلے اس  
موتی عورت کو دیکھا پھر اس نوجوان لڑکی کو۔ ”کبھی یہ  
اتنی پتلی ہوگی لیکن اپنی شادی کے تین چار سال بعد یہ  
ایسی ہوگی ہوگی۔ تقریباً بیس کلو وزن بڑھا ہوگا جس کو  
یہ گھٹانے سکی ہوگی۔“

ایڈم غور سے اسے بولتے ہوئے دیکھ رہا  
تھا۔ اپنے گھر پہ شرمندگی اپنا رخ حلیہ ’ساری فکریں  
ذہن سے محو ہونے لگیں۔

”جانتے ہو پتلے لوگ مونے کیوں ہو جاتے  
ہیں؟“ تالیہ گردن مونے پتلی لڑکی کو پر ام دھلیاتے دیکھ  
رہی تھی۔

”کیونکہ وہ بہت کھاتے ہیں۔“  
”مگر کتنا کھاتے ہیں؟ پتا ہے ایک تحقیق ہوگی  
اس بارے میں کہ پتلے لوگوں اور مونے لوگوں کی  
روزانہ کی خوراک میں کتنا فرق ہے؟“  
وہ ذہم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہی تھی۔

”مونے اور پتلے لوگوں کی سال بھر کی خوراک  
کا موازنہ کیا گیا تو معلوم ہے ’شاہی مورخ‘ ہر روز

مونے لوگ پتلے لوگوں سے کتنا زیادہ کھاتے ہیں؟“  
اس نے چہرہ موز کر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔  
”صرف ایک نوالہ زیادہ!“

ایڈم نے بے یقینی سے ایہہ اٹھائے۔  
”ایک نوالہ؟ صرف ایک نوالے سے کون مونے  
ہوتا ہے؟“

”بالکل۔ یہ عورت بھی یہی سمجھتی ہوگی کہ روز کا  
ایک نوالہ زائد کھانے سے میں موتی کہاں ہو سکتی  
ہوں۔ مگر ہر روز کا ایک زائد نوالہ جو اندر جاتا ہے وہ  
جمع ہوتا جاتا ہے اور سال بھر میں چار پانچ کلو وزن  
بڑھ جاتا ہے۔ شادی کے چوتھے پانچویں سال تک  
لڑکیاں پندرہ بیس کلو بڑھا کر موتی مرغیوں جیسی بن  
جاتی ہیں کیونکہ ان اب کو لگتا ہے کہ ایک نوالہ.....  
ذرا سی چینیٹنگ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

پھر وہ پوری اس کی طرف کھوی اور اس  
مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”لیکن فرق پڑتا ہے۔ روز کے چھوٹے  
چھوٹے جھوٹ اور چھوٹی چھوٹی خیانتیں جمع ہو کر  
بہت بڑا ڈھیر لگا دیتی ہیں اور ان سے جان چھڑانا اتنا  
ہی مشکل ہوتا ہے جیسے بڑھا ہوا وزن کم کرنا۔ ان  
دونوں کاموں کے لیے بہت سامبر اور پرہیز کرنا ہوتا  
ہے۔ پلیٹ میں پیش کی گئی نعمتوں کو دیکھ کے بھی انکار  
میں سر ہلانا پڑتا ہے۔“

”آپ نے فیصلہ کر لیا ہے؟“  
”ہاں..... میری کار میں کھدائی کا سامان پڑا  
ہے۔ میرے ساتھ ملا کہ چلو۔ ہم اپنا خزانہ کھود کے  
نکالیں گے اور پھر ہم فوراً ڈسٹرکٹ آفیسر کو خبر دیں  
گے۔ ہم اسے پوری ایمانداری سے سرکار کے حوالے  
کر دیں گے۔“

ایڈم نے اسے چٹلیاں سکڑ کے مشکوک نظروں  
سے اسے دیکھا۔ ”میں کیسے یقین کروں کہ آپ خزانہ  
دیکھتے ہی کدال میرے سر پہ نہیں دے ماریں گی؟ اور  
کھودے ہوئے گڑھے میں میری لاش دفن کر کے  
سارے ثبوت نہیں مٹا دیں گی؟“



”ہاں اور جب ہم سرکار سے خزانے کی ذیل کریں گے تو ان سے عہد لیں گے کہ انعام خزانے کا پرسنٹ اتج ہونا چاہیے۔ کروڑوں کے خزانے کا معمولی حصہ بھی بہت ہی ہوگا۔ حکومت بہت آرام سے چند نوادرات ہمیں دے دے گی جس کو میں بھلا کر پروموشن کے بعد کروڑوں میں بیچوں گی۔ ہاں ہم اس رقم سے بہت امیر نہیں ہو جائیں گے مگر ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اتنی رقم کافی ہے اور پھر میرے پاس ملاکہ سے لایا گیا قیمتی زیور بھی ہے اور وان فاتح مجھے لی این میں اعلیٰ پائے کی جاب بھی دلا دیں گے۔ یہ بھی کم نہیں ہے۔“

”اور میں سمجھا چے تالیہ اپنے سارے خواب بھلا کر درویشانہ زندگی گزارنے جا رہی ہیں مگر آپ نہیں بدلیں گی۔“ وہ مصنوعی غفلت سے بولا تو تالیہ نے کندھے اچکائے۔

”خوابوں پر شہزادی تالیہ کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی۔ گستاخ مورخ۔“ پھر اس کے دائیں ہاتھ کو دیکھا جسے ایڈم نے سرعت سے پیچھے کر لیا۔ ”میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں، آپ نہیں رکھیں۔“

وہ جیسے ہی اندر آیا ابو پیچھے پیچھے چلتی آئیں۔ ”تم دونوں کسی خزانے کی بات کر رہے تھے ایڈم مجھے بتاؤ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ایڈم بن محمد کو زمین میں چھپے خزانے کا راز ملے والا ہے، ماں۔ تایا کی دعا قبول ہونے والی ہے۔“ وہ الماری میں ہنگر زادہ کر کرتے ہوئے غلت میں بتانے لگا۔ چہرہ جوش سے تھمتار ہاتھا۔

چوکھٹ میں کھڑی ایبو نے گہری سانس لی۔ ”اور اس روز تم دنیا کے بادشاہوں سے زیادہ طاقتور بن جاؤ گے۔ یہ بات بھی اس خواب میں شامل تھی۔ ایڈم کے ہاتھ رکے۔ وہ ٹھٹکا۔ بے اختیار کبوتر ڈورین کی لاش اور وہ غاریا دیا جو سونے سے بھرا تھا۔

(ایک خزانے کا راز اسے پہلے بھی ملا تھا مگر اس نے کسی مقام پر خود کو بادشاہ سے زیادہ طاقتور تصور نہیں

تالیہ نے جھکی ہوئی سانس بھری۔ ”اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو تمہیں ساتھ کیوں لے کر جاتی؟ اسکے ہی سارے خزانہ نکال کے غائب ہو جاتی۔ تم نے پولیس کو نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔“

”واقعی مجھے ساتھ لے کر جا کیوں رہی ہیں آپ؟“

”تاکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ تالیہ بہت مراد اپنے باپ جیسی نہیں ہے۔ وہ اس خزانے کو نہیں لوٹے گی جو اس کے ملک کے لوگوں کی امانت ہے۔ اور میرے خواب کے مطابق ہم دونوں اکٹھا خزانہ نکالنے کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک خزانہ ہم نے پہلے بھی ایک ساتھ ڈھونڈا تھا۔ جیسے تم نے اس خزانے کی حفاظت کی تھی آج مجھے اس کی کرنے دو۔“

ایڈم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ماتھے کے ٹیل غائب ہو گئے۔ وہ پورے دل سے مسکرایا۔

”آپ واقعی بدلنا چاہتی ہیں؟“

”ہاں مجھے اچھائی کی طاقت پر اتنا بھروسہ تھا تو ہے ہی۔“ بیٹ والی لڑکی مسکرا رہی تھی۔ ایڈم کا دل خوشی سے بھر گیا۔

”لیکن آپ کے امیر ہونے کا خواب اور راز وہ جائے گا۔“

تالیہ مراد نے بیٹ ترچھی کی اور معنی خیزی سے مسکرائی۔ ”کس نے کہا؟“

ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ”ایک منٹ..... آپ نے ابھی کہا کہ آپ خزانے کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔“

”ہرگز نہیں... میں نے یہ کہا کہ ہم ڈسٹرکٹ آفیسر کو اطلاع دیں گے اور خزانہ حکومت کے حوالے کر دیں گے مگر یہ نوادرات ایڈم۔ تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ تم بہت سیدھے ہو۔ میں نہیں ہوں۔ میں نے فریڈرک کو ایکٹ پڑھا ہے۔ اس کے مطابق حکومت کو خزانہ ڈھونڈنے والوں کو انعام بھی دینا ہوتا ہے۔“

”انعام؟“ ایڈم کا منہ مکمل گیا۔



کیا ہے، اور حقیقت تو وہ اب بھی نہیں ہے کہ ۔  
خیر۔ اس نے سر ہلکا کر پڑے نکالے گا۔

☆ ☆ ☆

اس مصروف مزدک کے دونوں اطراف میں  
ڈیزائنر شاپس بنی تھیں۔ شاؤچنگ کرتے لوگ مزدک  
کھارے ٹبل رہے تھے۔ دکان کے اندر بھی اشیاء دور  
سے چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک جیولری اسٹور  
کے دروازے سے سمج اندر داخل ہو رہا تھا۔  
سمج کے بال مناسب کئے تھے اور آنکھوں پر  
میتھے فریم والا نظر کا چشمہ تھا۔ ڈیزائنر کوٹ پہنے آٹلی  
میں سونے کی قیمتی آٹھویں کلائی میں سنہری گھڑی  
باندھے وہ چھابرو کوئی مال دار آدمی لگتا تھا۔ سانولے  
چہرے پر بے نیاز مسکراہٹ تھی اور عقب جیسی  
آنکھیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔  
منیجر اس کو دیکھ کے فوراً اٹھا۔ وہ مسکرائے قریب  
آیا اور زیورات سے بچے شوکیس کے ساتھ رچی کرسی  
پر بیٹھا۔

”بتائیے سر کیا دیکھنا چاہیں گے؟“ یہ درمیانے  
درجے کا اسٹور تھا اور اس میں ڈیزائنر جیولری تو نہ تھی  
لیکن منیجر بھی اس کا شمار قابل مجرور سا جیولر میں ہوتا تھا۔  
مینجر منیجر نے نگاہوں سے اس آدمی کی مالی  
حیثیت کا اندازہ کرنا چاہا۔ وہ کوئی دنر و شاپر نہیں لگتا تھا۔  
ظاہر ہے وہ اس بات سے واقف نہ تھا کہ سمج  
نے ادھار کی چیزیں پہن رکھی تھیں۔ اس کے مالی  
حالات خراب تھے آج کل اور کام ٹھنڈا تھا۔ قرض  
الگ چڑھے تھے۔ ایسے میں تالیہ کے ٹاپس اس  
کا واحد ہتھیار تھے۔ ہاں مگر وہ بے وقوف نہ تھا کہ  
ٹاپس بیچنے کی کوشش کرتا۔ اس نے اپنے سنار دوست  
سے ہیرے نکلوائے تھے اور ان ہیروں کی پرانی  
تارنوں میں کسی درمیانے درجے کے اسٹور کی  
رسیدیں بھی بنوائی تھیں۔ ایسے اسٹور کے جیولر مالکان  
اپنے جاننے والے چوروں اور نو سر بازوں کو چوری  
شدہ زیورات کی رسیدیں بنادیتے تھے تاکہ انہیں بیچنا

بیوقوفی بکس کا تیار کیا۔

# سوہنی میسرائل

SOHNI HAIR OIL



- کتے سے مراد ہوتے
  - بے باک ہوتے
  - دوسرے خیمہ دار ہوتے
  - میں ہوتے ہرگز نہ
  - تیار ہوتے
  - دوسرے مسئلہ یہ کہ
- قیمت - ۱۵۵/- روپے

سوانحی میسرائل 252 ڈیڑھ لٹر ہر گز بے ہوش نہ چلتا  
کے حوالے سے ملنے پر نہ کہ توڑی ہوئی چار ہفتے پہلے  
ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔  
ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔  
ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔  
ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔

- 2 ہتوں کے لئے ..... لٹر ۱۵۵/- روپے
- 3 ہتوں کے لئے ..... لٹر ۱۵۵/- روپے
- 5 ہتوں کے لئے ..... لٹر ۲۵۵/- روپے

نوٹ: اس سر ڈاک فرم کے ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔

ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔

ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔  
ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔  
ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔  
ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔  
ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔ ہر گز بے ہوش نہ چلتا۔



آسان ہو۔ اس کے سارے دوست نے ہیرے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ بہت قیمتی ہیں۔ وہ واپس بلیو ڈائمنڈ کے تھے اور ڈیزائنرز جیولری معلوم ہوتے تھے یقیناً تیلہ کو اس کے کسی چاہنے والے نے دیے ہوں گے۔

”موتی والدہ کے ڈائمنڈز کو میں اتونٹی میں جڑوانا چاہتا ہوں۔ دراصل میری شادی ہو رہی ہے گا وہ سکران کے بیٹا رہا تھا۔ ساتھ ہی جیب سے ایک باکس نکالا اور اسے کھولا۔ اس کے اندر وہ دونوں ہیرے ایک سونے کے لاکٹ کے ساتھ پڑے دکھائی دیتے تھے۔ لاکٹ پرانا تھا اور ایسا لگتا تھا اندر سے ہیرے اتارے گئے ہیں۔

”میں نے ایک جیولر سے ان کو اتروایا مگر اس نے اتونٹی کے جو ڈیزائن دکھائے وہ مجھے پسند نہیں آئے۔ میں اسے آپ کے پاس لے آیا۔“

”شیدر سر... آپ کے ذہن میں کوئی ڈیزائن ہے؟“

اس نے فوراً باکس قریب کیا اور فوٹو میز سے ایک ہیرا اٹھا کے دیکھا۔ اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

”میں یہ ڈیزائن چاہ رہا تھا۔ میری مکتبہ کو یہ پسند ہے مگر سر پرانہ دینا ہے تو اس لیے۔“ وہ موبائل پر ایک ڈیزائن دکھانے لگا۔

”آپ کے پاس رسید ہے نا اس کی؟ دراصل سسٹم ایسا ہے کہ...“ فیجر وضاحت دینے لگا۔ بظاہر شک کرنے کی جہت تو نہ بنتی تھی مگر وہ مجبور تھا۔

”آف کورس ہے۔“ اس نے جیب سے فوراً کانڈیکٹل کے دکھائے۔ ”والدہ نے قریباً پانچ برس پہلے یہ لاکٹ بنوایا تھا۔ ان کی وفات کے بعد سے ایسی ہی پڑا ہے۔“ اب دورنی رہائی کہانی سن رہا تھا۔

”بہت قیمتی ہیرا ہے یہ۔“ فیجر متاثر کن نظروں سے ہیرے کی حالت پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے احتیاط سے دونوں ہیروں کو ذی میں ڈالا۔

”میں ان کو چیک کر لوں، پھر بتاتا ہوں کہ کیا

کرنا ہے۔“ خوش اخلاقی سے کہتا فیجر بیوی کو پہلے شوکیس کے سرے تک آیا جہاں نیچے چند مٹینیں رکھی تھیں۔ اس نے مائیکرو اسکوپ کی طرح کی مٹین میں ایک ہیرا رکھا اور آنکھ مقررہ جگہ پر لگا کر اسے ہر کھتے لگا۔

اسٹور کے قیمتی ہیروں اور سونے کی ہمک سمج کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اسے سی کے ٹھکانے اور خنک ماحول میں وہ خود کو بہت آرام دہ محسوس کر رہا تھا جب فیجر واپس اس تک آیا۔

”آپ کے ہیرے بالکل اصلی ہیں۔ اچھا اب میں آپ کو چند فریش ڈیزائن دکھا دیتا ہوں جو آپ کی خوش قسمت وائف کو بہت پسند آئیں گے۔“ فیجر خوش دلی سے چند کیمرز نکال لایا۔ پھر ایک ایک اتونٹی نکال کے دکھائی۔ اپنی چرب زبانی سے وہ ہر اتونٹی کے ڈیزائن کی شان میں غلابے مار رہا تھا۔

”سمج کچھ دیر ان کو دیکھتا رہا، یوں ظاہر کیا جیسے اسے ڈیزائن پسند نہ آ رہے ہوں۔

”شاید ہیرے بہت بڑے ہیں۔ ان کو کوچے میں چھوٹے ہیرے خرید کے اگر انہیں یوں بنوائیں تو...“ وہ ایک ڈیزائن پر انگلی رکھ کے بولا تو جیولر گہری سانس لیتے ہوئے پیچھے ہوا۔

”نو پھتس جناب۔“ تجھے آپ کے چورنی کے ہیرے نہیں خریدنے۔“ جیولر کا لہجہ ایک دم روکھو ہو تو سمج نے چونک کے اسے دیکھا جو سمج کے پیچھے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

”سمج ایک دم گھوما۔ کرسی بھی ساتھ ہی گھومی۔ دکان کے دروازے سے تین پولیس آفیسر داخل ہو رہے تھے۔

”ایک منٹ۔ میرے ہیرے چورنی کے نہیں ہیں۔“ اس نے بوکھلا کر فیجر کو پکارا۔ ”آپ نے پولیس کیوں بلائی ہے؟“

”کہانی اچھی گھڑی آپ نے جذب۔“ جیولر رکھائی سے کہتا اٹھا اور اسے کیمرز سمیٹنے لگا۔ پولیس والے اس کے گرد گھیرا پٹے گھڑے ہو گئے۔ ”کچھ



میں نے تھک جاتا تھا۔ ان پریشان کن باتوں کا

میں نے آپ کی کہانی میں آنکھیں کھلیں  
میں نے ہیرا ہون کو چنگ کر لیا۔ جس مناسبت آپ نے  
چھٹی رسید میں بنوائی تھی۔ اس کے پاس۔ یہ بات  
تجربہ نہیں ہوئی ورنہ تھک جاتا کہ ان ہیرا ہون پر لیٹر  
ہٹا کر چٹن کی کٹی ہے جس میں ان کا سر بیٹھتا ہے۔ ہیرا  
ہے۔ یہ آپ کی واحد کٹے نہیں ہیں جناب۔ یہ  
ہیرے Joyalukkas کے ہٹے ہیں۔ ہمارے  
گھر میں ہیں اور یہ ایک سال پہلے ایک سنگاپور میں قانون  
کے پاس سے چوری کیے گئے تھے اور ان کا مشقیت  
نمبر پولیس نے تمام ڈائمنڈ ڈیلرز کو بھیج رکھا تھا۔ آپ  
کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ ڈیزائنرز جیولری جب بھی  
چوری ہوئی ہے، اس کے مالکان اس کا لیٹر ہٹا کر ہیرا  
نمبر پولیس کو دے دیتے ہیں۔ ”وہ ٹھک ٹھک  
اتھوٹھوں کے ڈبوں کے ڈھکن بند کر رہا تھا اور سب  
کے قدموں سے زمین سرک رہی تھی۔

”یہ میں نے نہیں چرائے۔ مجھے میری بیوی  
نے دیے تھے۔“

”یہ ہیرے صرف چوری شدہ نہیں ہیں مسٹر۔“  
افرنے اس کے ہاتھ پیچھے لے جا کر ہتھکڑی لگاتے  
کہا۔ ”یہ ہیرے ایک ٹل کے کیس سے چرائے گئے  
تھے۔ اب تم تھانے چل کے ہمیں یہ بتاؤ گے کہ اس ٹل  
سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”اف!“ سچ نے کرب سے آنکھیں پجھ لیں۔

وہ اسے جان بوجھ کے ہاتھ روزنک لائی تھی  
کیونکہ وہاں کیمرے نہیں لگے تھے۔ اس نے جان  
بوجھ کے اس وقت صرف موٹے موٹے ٹاپس پہن  
رکھے تھے تاکہ وہ ان کے لالچ میں آجائے۔ اس کا  
وہ ڈرنا وہ غصہ کرنا وہ سب۔ سب اداکاری تھا۔ اس  
نے اسے بہت برا پھنسا ہوا تھا۔

اف! اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

ملا کہ شہر میں سن باؤ کا گھر ویسا ہی تھا جیسا وہ  
ہفتہ بھر پہلے رات کو چھوڑ کے گئے تھے۔ وہی سرخ

جوتے سیٹھی کھول۔ سبق تہذیب سے اور سبق لال  
لٹیکوں والا کھین۔ مجھے بھی ویسے ہی نظر سے سر ہٹنے کے  
کھڑا تھا۔ اس کی پتھری آنکھیں سنجیدگی سے سامنے  
دال دیا کرتی تھیں۔

اس حالت ان کو کھانی کرتے کٹی تھکے ہوتے تھے  
تھکے مجھے کے قریب آئیں۔ آخری پڑتی تھیں اور  
گھومتی جگہ کھاتی بہت تھیں۔ شام ہو چکی تھی اور وہ  
دو دوں مٹی سے اپنے بچڑوں کے ساتھ دستے  
چمکے، دال پلاسٹک کیپ سر ڈھانکے، کدالیں  
پکڑے نہ مڑتے ہوئے سر لگے تھے۔

جب تک کہ یہ جگہ کھاتی چاہے تھی۔  
نیم سانس لینے کو رکھتا تھا کہ اس کا  
چروٹنی سے ہاتھ اور کپڑے بھی لیے ہوئے تھے۔  
تالیہ نے کدال کا پھل زمیں میں بگاڑا اور اس  
پر دونوں ہاتھ بڑا کے ذرا دیر کو سستے رکھے۔

”اچھا! ویسے کام کرنا تھا۔ ورنہ سارے بازار  
کو اصرار مل جاتی کہ یہ لال کھاتی ہو رہی ہے۔“  
”آؤ! اس کو اب بھی مٹی ہوں گی۔“

”اسی لیے آتے وقت اس پاس بتا دیا تھا کہ جی  
کرائے دار ہوں اور گھر کی رتی ماڈلنگ کروا رہی  
ہوں۔ بے فکر رہو۔ کوئی شک نہیں کرے گا۔“ اس  
نے پھر سے کدال اٹھائی اور زمین کھودنے لگی۔

چھ سو سال نے اس جگہ کو بدل کے رکھ دیا تھا۔  
مجھ سے ویسا نہ تھا جیسا اس نے بنایا تھا۔ جگہ جگہ سے وہ  
ٹوڑ ہوا لگتا تھا گویا بعد میں مرمت کی گئی ہو۔ مٹی بھی  
کٹی دفعہ بنایا گیا تھا گھر زمین پرانی تھی۔

جیسے آسمان پرانا تھا۔ جیسے ملا کہ کا بوڑھا سمندر  
پرانا تھا۔

بس ہوا میں cesium کی ملاوٹ تھی۔  
کدال کی ہر ضرب کے ساتھ مٹی نکلتی جا رہی تھی  
اور وہ اپنے مطلوبہ صندوق کے قریب پہنچتے جا رہے  
تھے۔ مٹی پہ نظریں جمائے، کدال اس میں مارتے،  
اس کے ذہن کے پردے پر ایک سرمئی شام اترنے  
لگی۔



ہمارے دل کے ساتھ ساتھ ہمارے دل کے ساتھ ساتھ

[illegible]

تھا۔ ”آواز پہ وہ چونک کے کھڑے ہوئے۔

قالہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور مستکرا کر  
"تو اکبر!"

”شہزادی!“ قاتل نے مرکوم خم دیا۔ خوب میاں  
بھی پہلا قمر بند ہی تھا۔

”آپ کے کمر میں جو مجسید نصب ہے، اس پر جگہ جگہ نوٹ پھوٹ — خیر آتی ہے۔ مجھے یاد ہے

ہمارے وقت میں سردیوں کے روزوں کے سحر و جادو کے عجیب و غریب کھیل

درٹے کی حفاظت کے شوقین لوگ اس کی مرمت  
کرواتے رہتے ہیں۔ آخری دفعہ غصہ کرنے لگا

نوک پلک سنواری تھی۔ ”وہ زینے اترتے ہوئے نیچے آیا تو ساتھ ہی بولتا جا رہا تھا۔ دو گارے سر

تحریر باتھ لے اس کو دیکھ کئی۔  
سفید چھوٹے کرتے اور پاجامے میں دو صاف

رحمت والا اور نچا لمبا غلام سگراتے ہوئے قریب آ رہا تھا۔ ملائشیامیں دو ایک اشارہ سلیم پھر جی تھا اور یہاں وہ

ایک نام۔  
مکروذوں جگہوں پر دو اس کا تھا۔  
"کسا سو جن گیم" دو نام کے لکے ہوئے تھے۔



جیسے پلٹ کے اسے دیکھا۔

”اور اگر مجھے آپ کے قریب رہنا ہو تو میں کیا کروں؟“

”سرمئی شام ابھی تک روشن تھی اور سن باؤ کا گھر خاموش تھا۔ ایسے میں آدھے بنے مجھے کے ساتھ وہ دونوں یوں کھڑے تھے کہ قہر مجھے کو کچھ رہا تھا اور وہ اسے۔“

”تم کئی دفعہ کہہ چکی ہو کہ تم یہاں سے دور چلی جاؤ گی۔ امریکہ وغیرہ۔“

”چلی تو میں جاؤں گی۔ اپنی کچھ چیزیں لے کر۔“ اس نے نظریں جوڑا کے مجھے کے قدموں کو دیکھا جہاں زمین پر ابھی گھر منوں مٹی تھے اس کا خزانہ چھپا تھا۔ ”لیکن اگر بھی ارادہ بدل دوں اور آپ کے ساتھ رہنا چاہوں تو کیسے رہوں؟“

وہ آہستہ سے اس کی طرف گھوما۔ ایسے کہ چٹلیاں سیکڑے اس کی بات پہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

”میرے آفس میں جا کر لیٹو۔“  
”مگر آپ کو تو میری ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”ہاں وہ تو نہیں ہے، لیکن میری زندگی تالیہ، صرف کام کے گرد گھومتی ہے۔ اگر کہیں میرے قریب رہتا ہے تو تمہیں میرے آفس میں جا کر رہنا پڑے گی۔“ پھر سے کندھے اچکائے۔ سدا کا بے نیاز اور مطمئن آدمی۔

”آپ کے آفس میں مجھے کون سی جا بٹل سکتی ہے؟“ پھر پھر کے بولی۔ ”آپ کے آفس میں کون سی جا بٹل اعلیٰ ترین ہے اور کون سی ادنیٰ ترین؟“  
”اعلیٰ ترین تو ممبرز پارلیمنٹ ہوتے ہیں۔“  
”وہ تو میں بن نہیں سکتی۔ ادنیٰ ترین کون ہوتے ہیں؟“

”سب سے ادنیٰ اور معمولی جا بٹل سیکورٹی ورکرز کی ہوتی ہے مگر نہیں، وہ آفس کے باہر ہوتے ہیں۔ پھر وہ گمیا لفٹ والا آدمی۔ انہوں۔ وہ بھی ہمارے فلور پہ نہیں ہوتا۔“ وہ ٹھوڑی کھباتے ہوئے

سوچنے لگا۔ ”ہاں۔ سب سے کم فلوئور والے کمرے میں ایسا یا باڈی میں ہی ہوتے ہیں۔ اور سب سے اعلیٰ جا بٹل پارلیمنٹ ہوتی ہے۔ لیکن سب سے اعلیٰ کمرے اور ڈائری کی جگہ سے دباؤ نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن سوشل میڈیا کا ماحول ہے تو میں سوشل میڈیا کے ماحول کا بیڑہ، مگر اصل یہ لوگ کتنے کم ہوتے ہیں۔“

”تو سب سے اعلیٰ جا بٹل کتنے کم ہوتے ہیں۔“ اس کی آنکھیں پھٹیں۔  
”بالکل۔“ پھر اسے دیکھ کے مسکرایا۔ ”میرے ہم سے دھڑ بھڑ ہے۔ تم جب بھی مجھ سے جا بٹل ملنے کو کہتی ہو، میں تمہیں اپنے کتنے میکرے ہیں۔ سب سے کم جگہ پر بھی ہو وہ کتنے میکرے کا عہدہ دیتی ہو گی۔“

”اور اگر شہرت اور طاقت کی چکا چوند میں آپ اپنا دھڑ بھول گئے تو؟“ اسے دھڑ بھول

”بھول بھی گیا تو تم اتنی قابل ہو کہ کسی بھی سیاسی جماعت میں بہت جلد میرٹ اور محنت سے کتنے میکرے مل جائیں۔“ پھر وہ پھر۔ ”لیکن یاد رکھو۔“  
”راہبہ نہیں کی کوئی مجھے نہیں سمجھتے۔“ تیسرے کے ہاتھ کے ابرو اٹھنے سے اٹھنے ہوئے۔

”راہبہ نہیں کون؟“  
”روٹی، بادشاہ، کولیس کا سلطان سرتو۔ ویسے تو وہ کولیس کے بیڑے اور بیڑے، لیکن سرتو کا سرتو اور سرتو تھا، لیکن بادشاہ کا اصل ہم راز اور شیر بھی تھا۔ بادشاہ ہر فیصلہ اپنے اسی روحانی مشوا سے پوچھ کے کرتا تھا۔ لیکن سرتو اور راہبہ نہیں، ان دونوں کے غلط مشوروں سے کولیس کو نقصان پہنچا تھا۔ دونوں سے عوام شدید نفرت کرتے تھے۔ آخر میں راہبہ نہیں کو ایک دوسرے شہزادے نے دعوت کے بہانے گھر بلا کے قتل کر دیا تھا۔“

الفاظ کی سنجائی نے سرخ گھن کو اور اس کو روکا۔  
”عوام سلطان سازوں سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟“

”کیونکہ وہ اپنے لیڈر کو اپنے علاوہ کسی کی خواہش پہ چلنا نہیں دیکھ سکتے۔ آزاد لیڈر کسی سلطان



سازد، کسی مشیر کی خواہش پہ چلتا بھی نہیں ہے۔ وہ  
اسوہوں پہ چلتا ہے اور صرف درست طور و قیاس کرتا  
ہے۔ مگر سنے کی بات یہ ہے کہ مومنانہ کسی اپنے لیڈر کو  
تسلیم و ارغی نہیں ٹھہراتے۔ وہ راسخ و متین ہیں، سلطان  
سازوں اور الیکٹریڈز جیسی ناقابلِ اعتماد شخصیات کو  
سے نفرت کرتے ہیں۔ لیڈر آخر تک ہمیں روکتا ہے۔  
وہ دلوں کے لیے کے ساتھ سخن میں کھڑے نہیں  
آواز میں بات کر رہے تھے۔

اور آخر میں سارے طاقتور سلطان ساز قتل  
کیوں ہو جاتے ہیں؟

”کیونکہ اگر وہ بادشاہ کے ساتھ وفادار نہ رہیں تو بادشاہ کو مار کے تخت پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر وفادار رہیں تو بادشاہ کا ان سے احتیاط کوئی نہیں ہوتا۔ کوئی سازش کوئی چال ان کا مقام نہیں کھٹا سکتی تو ماسد رقیب ان کی جان لے لیتے ہیں۔ سلطان ساز جنت آسان نہیں ہے۔ اور کوکہ میں نہیں جاب دینے کا وعدہ کرتا ہوں، لیکن میں دل سے کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم میرے آفس میں میرے ساتھ اس طرح کام کرو۔“

”کیوں؟“ وہ چونکی۔

”کیونکہ۔“ وہ چند قدم آگے بڑھ آیا اور ماما سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”یہ ایسی دلدل ہے جس میں کچڑ ہی کچڑ ہے۔ یہ جہیں اپنے اندر دھنسا لے لی۔ اور اگر دھنسانے سکی تو لباس داغ و آلودہ کر دے گی۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ صرف میرے ساتھ رہنے کے لیے تم اس دلدل میں قدم رکھو۔“ وہ غرور مند لگتا تھا۔ تالیہ مسکرا دی۔

”ہیے آپ کو میری ضرورت نہیں، ویسے ہی مجھے بھی آپ کی ضرورت نہیں۔ میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی۔“ پھر شہزادی نے کھمبند کی انداز میں سر ہچکا اور بے نیازی سے واپس کمرے کی طرف پلاٹ گئی۔

فون کی گھنٹی نے اسے ہٹا دیا تو وہ سال میں  
واپس آئی۔

ایم اور دوزخا نے کے قریب کافی جگہ چھوڑ  
اس کا فون بیچ رہا تھا۔ تالیہ نے کہا کہ میں اس فون  
پیسے سے نکالا۔ دوستانہ اشارے ہوئے پیغام دیکھا۔  
پھر منکر ادبی اور فون والہ پس رکھ دیا۔

”کیا ہمارا ایمم نے زمین کھودتے ہوئے  
تثویلیں سے سیر اٹھایا۔“

”نمبر ایکس۔۔۔۔۔“

تھا۔ ابھی اطلاع ملی ہے کہ اسے پولیس پکڑ لے گئی ہے۔“

”اور آپ تو اتنی مہموم ہیں کہ اس میں آپ  
ہاتھ نہیں بٹوکا۔“

”ہاتھ نہیں، دماغ ہے۔ دماغ۔“ مسکراتے ہوئے دوستانہ چہ خاتے اس نے واپس کدال اٹھائی

”میرا اور ادا تن کا ایک چور دوست ہے آصف  
اس نے مجھے ایسی ڈیزائنز دی ہیں کہ بندوبست کر کے

دیا جوئل کے کیس سے تعلق رکھتی تھی اور بیچنے والے نے کوڑیوں کے مول بیچ کے جان چھڑائی تھی۔ سچ نے وہ ہیرے مجھ سے لیے اور انہیں بیچنے کی کوشش کرتے پکڑا لیا۔ پوچھو کیسے؟

”ان ہیروں سے یہ کہنا

inscription کی کئی ہوگی جو کہ سرٹیفیکٹ  
ڈائنمڈز پر ہوتی ہے۔"

"اور... تمہیں کیسے پتا؟"

"کیونکہ میں کتابیں پڑھتا ہوں۔" اس نے

زور سے کدال کی ضرب لگائی۔ بالآخر لوہے کے صندوق کا کنارہ نظر آ رہا تھا۔



تالیہ کا ہاتھ اٹھکا۔ یہ شکاف کیوں ہے؟  
 گرکس۔۔۔ اس نے سارے واہموں کو ذہن  
 سے جھٹکا اور پتھیلیوں سے مٹی ہٹانے لگی۔۔۔ ان  
 دونوں کی زبانیں ساکت تھیں اور ہاتھ تیز تیز کام کر  
 رہے تھے۔

یہاں تک کہ صندوق کی ساری مٹی انہوں نے  
 باہر نکال دی۔۔۔۔۔

اور۔۔۔ دو صندوق خالی تھا۔ خزانہ وہاں نہیں تھا۔  
 تالیہ کا مٹی سے اچھرو ساکت ہو گیا۔ ایڈم بھی  
 شش رو گیا۔

دو ٹخن اٹا پکا اور قدیم تھا کہ یوں لگتا تھا، برسوں  
 سے کسی نے ایک اینٹ بھی نہیں ہلائی تھی۔ مجسہ بھی  
 اپنی جگہ پہ موجود تھا۔ تو پھر خزانہ کہاں گیا؟

صندوق اٹا مضبوطی سے فٹ کیا گیا تھا کہ  
 خزانہ نکالنے والے نے اس کو دیسے ہی چھوڑ دیا اور  
 صرف اس کے ڈھکن میں شکاف کر کے ساری  
 چیزیں نکال لی تھیں۔ گرکس نے اور کب؟  
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔ جے تالیہ یہ ناممکن ہے!“

اب حالت یہ تھی کہ ٹخن کے درمیان میں گڑھا  
 کھدا ہوا تھا اور اس کے دہانے پہ دو دونوں مٹی مٹی  
 ہوئے پھر لٹکائے بیٹھے تھے۔  
 ”ہمارا خزانہ کہاں گیا ایڈم؟“ دو سرگوشتی میں  
 بولی۔ ششدر نظریں ٹوٹے ہوئے صندوق پہ جمی تھیں۔  
 ”کسی نے ہم سے پہلے خزانہ نکال لیا ہے۔ گر  
 کس نے؟“

”نوب ہمیں حکومت کا انعام نہیں ملے گا۔“  
 ”اور میری شادی کے پیسے بھی اکٹھے نہیں ہو  
 پائیں گے۔“

”یعنی ہم وہیں پہ آگئے ہیں جہاں سے شروع  
 ہوئے تھے۔ ہمارا خزانہ چوری ہو گیا ہے۔“ وہ کھوٹی  
 کھوٹی سی بولی۔ ”اور ہم پھر خالی ہاتھ ہیں۔“

دو دونوں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ شش۔  
 ماؤف دماغ لپے۔ سب کچھ جیسے تم ہو گیا تھا۔  
 ”ہم نے کیوں سوچ لیا تھا ہے تالیہ کہ جو سو سال

گزرنے کے بعد بھی خزانہ اپنی جگہ پہ موجود ہوگا۔“  
 وہ ابھی تک بنا پلٹیں جھکے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔  
 ”پانچ سو ستاون سال ایڈم۔“

اور ان دونوں میں سے کوئی نہ ہنسا۔ وہ چپ  
 چاپ گم صم سے بیٹھے رہے۔

سن باؤ واٹنگ لی کا مجسہ اپنی پتھر لی آنکھوں  
 میں صدیوں پرانے راز چھپائے خاموشی سے دورا فٹ  
 کو دیکھتا رہا۔

صرف وہی جانتا تھا کہ خزانہ کس نے نکالا تھا۔  
 مگر بند لہارا کی بیٹی نے اس کا پتھر چھ چھوڑ  
 بناتے وقت اندر زبان۔ نہیں رکھی تھی جس کو بلا کے  
 وہ انہیں حقیقت بتا سکتا۔

اس کی صرف آنکھیں تھیں جن میں سارے سارے  
 پتھر ہو چکے تھے۔

\*\*\*

سوموار کی صبح کے ایل کے پتھروں میں کام  
 شروع ہو چکا تھا۔ مندرے مارنگ کسی کو پسند نہیں  
 تھی مگر بھائیوں روکے اتوار کے۔ بیٹا سوں کو  
 بھلانے کی سعی کرتے ملازم کام میں لگے تھے۔ پترا  
 ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے اس قہور پہ بارہن پتھروں کا پتھر بھی  
 معمول کی مصروفیات کا شکار دکھائی دیتا تھا۔

دن قح کے آفس کے سامنے بے چھوٹے  
 سے سٹک ایریا میں تالیہ مرلہ پتھری نظر آتی تھی۔ بالوں  
 کا جوڑا بٹائے، وہ بھوری اسکرٹ بڑاؤ پہ سفید کوسٹ  
 پہنے کوئی ایگزیکٹو لگ رہی تھی۔

وہ ابھی ابھی آکے بیٹھی تھی اور اسے دیکھتے ہی  
 قح کا سیکرٹری عثمان فوراً اُپڑا آیا تھا۔

”ہم آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ میں قح  
 صاحب سے آپ کے ہاپسٹوڈ لیکز کا پوچھ کے آ رہی  
 ہوں۔“ وہ شائستگی سے بولا تو جیسے نے بے نیازی  
 سے گردن ہلا دی اور باور و حرج جیسے غور۔

عثمان چڑ گیا تو اس کا نور بجلا۔ اس نے سر ہٹا  
 نکال کے اسکرین روشن کر دی۔

”میں نے ساری جگہ کھود کے دیکھ لی کہ شہید



”جہاں آسمانوں کی آواز آتی ہے“ اس نے غور سے  
 سے بھلا۔  
 ”جس آپ نے ان کو اپنی ترین عہدہ دینے کا  
 وعدہ کیا تھا۔“

”نظر میں نے وہ جاب دینے کا وعدہ جو وہ  
 دینے والا تھا ہے۔ تم جیسا کہ عہدہ تھا کہ جو جوں اس  
 نے کیوں دینا چاہتی تھی۔ یہاں جس دن میں یہ نظر کر  
 لے۔ یہ لیکن اول تو اس جاب کو اپنی تو دینا تجھے کے  
 لینے سے انتظار کرتے کی اور اس فحول کرنا تب بھی  
 زیادہ دینا ہے مجھے یہنا شیت جس کر پائے کی۔ روز کے  
 چند سولہ گھنٹے دن قات کے ساتھ رست آسان جس  
 جوتہ ہو گیا مسئلہ علی عثمان؟ اب مجھے کام کرنے دیر۔“  
 اس نے سرد انداز میں کہتے ہوئے جیکب اٹھائی  
 اور اسے آنکھوں پہ جلاتے ہوئے قات کی کھول لی۔  
 آستینیں موڑے کبھی اس میز پہ جلاتے اب وہ قات  
 کے مطالعے میں مصروف ہو گیا تھا۔

”عبداللہ کی جگہ جاب؟“ عثمان حق دق رہ گیا۔  
 ”سر۔ شاعر صاحب بہت خفا ہوں گے۔“  
 ”تو اور بھی اچھا ہوگا۔“ ساتھ ہی دو انگلیوں  
 سے اسے نکل جانے کا اشارہ کیا۔

عثمان کے کان سننا اٹھے۔ ٹائی کی ٹاٹ کسی  
 تھوک نکلا اور ہمت جمع کرتے ہوئے وہ دروازے کا  
 طرف بڑھا۔

اب اسے باہر جا کے چے تالیہ کو یہ بتانا تھا کہ  
 اس کے پاس نے اسے آفس کا سب سے ادنیٰ ترین  
 عہدہ دیا تھا۔

ایسے تالیہ مراد کو بتانا تھا کہ... آج سے... وہ  
 وان فاح بن رامل کی باڈی وومن ہوگی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ  
 سڑک پہ ٹریفک تیز رفتاری سے گزر رہا ہے۔  
 زیر اگر اسنگ عبور کرتے لوگوں کی دائیں  
 بائیں مڑنی گردنیں....  
 ڈرائیو کرتے لوگوں کے کانوں سے گئے ہنڈ

”جہاں آسمانوں کی آواز آتی ہے“ اس نے غور سے  
 سے بھلا۔  
 ”جس آپ نے ان کو اپنی ترین عہدہ دینے کا  
 وعدہ کیا تھا۔“

”نظر میں نے وہ جاب دینے کا وعدہ جو وہ  
 دینے والا تھا ہے۔ تم جیسا کہ عہدہ تھا کہ جو جوں اس  
 نے کیوں دینا چاہتی تھی۔ یہاں جس دن میں یہ نظر کر  
 لے۔ یہ لیکن اول تو اس جاب کو اپنی تو دینا تجھے کے  
 لینے سے انتظار کرتے کی اور اس فحول کرنا تب بھی  
 زیادہ دینا ہے مجھے یہنا شیت جس کر پائے کی۔ روز کے  
 چند سولہ گھنٹے دن قات کے ساتھ رست آسان جس  
 جوتہ ہو گیا مسئلہ علی عثمان؟ اب مجھے کام کرنے دیر۔“

اس نے سرد انداز میں کہتے ہوئے جیکب اٹھائی  
 اور اسے آنکھوں پہ جلاتے ہوئے قات کی کھول لی۔  
 آستینیں موڑے کبھی اس میز پہ جلاتے اب وہ قات  
 کے مطالعے میں مصروف ہو گیا تھا۔

”عبداللہ کی جگہ جاب؟“ عثمان حق دق رہ گیا۔  
 ”سر۔ شاعر صاحب بہت خفا ہوں گے۔“  
 ”تو اور بھی اچھا ہوگا۔“ ساتھ ہی دو انگلیوں  
 سے اسے نکل جانے کا اشارہ کیا۔

عثمان کے کان سننا اٹھے۔ ٹائی کی ٹاٹ کسی  
 تھوک نکلا اور ہمت جمع کرتے ہوئے وہ دروازے کا  
 طرف بڑھا۔

اب اسے باہر جا کے چے تالیہ کو یہ بتانا تھا کہ  
 اس کے پاس نے اسے آفس کا سب سے ادنیٰ ترین  
 عہدہ دیا تھا۔

ایسے تالیہ مراد کو بتانا تھا کہ... آج سے... وہ  
 وان فاح بن رامل کی باڈی وومن ہوگی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ  
 سڑک پہ ٹریفک تیز رفتاری سے گزر رہا ہے۔  
 زیر اگر اسنگ عبور کرتے لوگوں کی دائیں  
 بائیں مڑنی گردنیں....  
 ڈرائیو کرتے لوگوں کے کانوں سے گئے ہنڈ



فری اور ان کے ہلنے لب....  
 سڑک کنارے اخبار کھولے بیٹھے ممبر لوگ....  
 خواب روز روشن کی طرح واضح تھا۔  
 ایسے میں وہ سڑک عبور کرتی ہے  
 اور اندر ایک گلی کی طرف مڑ جاتی ہے۔  
 پھر تین سوڑ مزید مڑتی ہے....  
 گلی آگے جا کے تنگ ہونے لگتی ہے....  
 اس کی دیواریں نیلی اینٹوں کی بنی ہیں....  
 وہ قدم بڑھاتے ہوئے اینٹوں پہ ہاتھ بھیر  
 رہی ہے....

”دروازہ کھلتے ہی یہ ہر گزرتے پل بھاری  
 ہوتی جائے گی یہاں تک کہ تم اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکو  
 گے۔ اور آخر کار تم اس کو گردن سے فوج پھینکو گے۔“  
 ”تقریباً کتنی دیر بعد؟“ اس نے دہرایا۔ ”کتنا  
 وقت ہوگا میرے پاس؟“

”تقریباً ایک پوری رات۔ اس سے زیادہ  
 نہیں۔ کیوں؟ تم اس ایک رات میں کیا کرنا چاہتے  
 ہو؟“ مراد نے غور سے اسے دیکھا۔

”ایک رات تو بہت طویل عرصہ ہے رجب۔  
 یہاں تو ایک لمحے میں دنیا بدل جاتی ہے۔ زمانہ پلٹ  
 جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا تم مجھے نہیں جانتے۔ اور۔“  
 نرسی دھکیل کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تاثرات  
 پتھر جیسے بھرے تھے۔

”میرے مجھے معلوم ہے کہ میں یہ کیوں کر رہا  
 ہوں۔“  
 ”کیوں کر رہے ہو؟“ مراد رجب نے گردن اٹھا  
 کے استہزاء سے اسے دیکھا۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہر جادو کا توڑ ہوتا  
 ہے۔ یادداشت کا کھودیرا مستقل نہیں ہوگا۔ اس کا  
 کوئی حل بھی ہوگا۔“

مراد رجب نے لمحے بھر کو ٹنگ رہ گیا۔ گردن میں  
 تھوک ننگے سے گھٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔  
 ”تمہاری یادداشت واپس نہیں آئے گی غلام  
 قاسم۔“

قاسم جو بابا کھر سے مسکرایا۔  
 ”غلط۔ بابا۔ کی یادداشت کھڑوں کی صورت  
 میں واپس آتی تھی۔ اسے قدیم ملاک میں اپنے بھین  
 چہ لمحے کے لیے قدیم ملاک کی اس شام میں  
 واپس جاتے ہیں جب مراد رجب کے سامنے بیٹھے غلام  
 قاسم نے وہ بے رنگ بے ذائقہ شروب پی کے چابی



کے کچھ حصے یاد ہیں۔ مجھے بھی قدیم ماکہ میں گزرے یہ چار ماہ یاد آ جائیں گے مگر سوال یہ ہے کہ کیسے؟

مراد راجہ کے ماتھے پہ تل پڑے۔

”تم سمجھتے ہو کہ یہ آسان ہے؟“

”وان فاتح نے زندگی میں آسان کام کبھی نہیں کئے کیونکہ وہ سب کر لیتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ وہ کیا مشکل کام ہے جسے میں کروں تو میری یادداشت واپس آ جائے گی؟“

راجہ چند لمبے لمبے بھینچے اسے کھورتا رہا۔

”میں تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا۔“

”تمہارے پیارے میں تاریخ کی کتابوں میں ایک حکایت پڑھی تھی میں نے۔“ فاتح نے ہتھیلیاں میز پر رکھیں اور جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ایک لڑائی کے دوران تمہارے مد مقابل شخص کا تلوار والا ہاتھ کٹ گیا۔ ہاتھ بھی گیا اور تلوار بھی۔ تو تم نے اپنی تلوار پھینک دی اور اپنا ایک ہاتھ کمر کے پیچھے کر کے نہتے وہ لڑائی لڑی اور اسے مار گرایا۔ یہ غیرت مند مردوں کا طریقہ ہوتا ہے راجہ! وہ مقابلہ برابری کی سطح پہ کرتے ہیں۔ مجھے نہتا کر کے ہرانے میں کیا مزا ہے؟“ وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ”یا شاید تمہیں ڈر ہے کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا؟“

”تم کچھ بھی کر لو۔ میری بیٹی میرے پاس واپس ضرور آئے گی۔“

وہ تیزی سے بولا پھر خاموش ہو گیا۔

”تم کہہ کے تو دیکھو۔“

مراد راجہ چند لمبے اس کی آنکھوں کی ہٹ دھری دیکھتا رہا پھر گہری سانس بھری۔

”ہم شکار باز صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ ہم زمانوں کے مسافر ہیں۔ وقت میں سفر کرتے ہیں۔ ہر زمانے میں شکار بازوں کا ایک راہبر ہوتا ہے۔ ان کا سربراہ۔ تمہاری یادیں اگر کوئی لوٹا سکتا

نہا دو دن ہے۔“

”اور وہ کون ہے؟“

”وہی جو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور وہ مجھے کبھی تمہاری یادیں لوٹا سکتا ہے۔“ وہ دھم سے منہ میں تلوار سے بولا۔ ”لیکن شاید تمہاری یادیں لوٹا سکتے ہیں۔ تم پر رحم کھالے۔“

”تمہاری دنیا کا شکار باز؟“ وہ چمکا۔ ”تمہارے ڈھیلے پڑ گئے۔ آہستہ سے سیدھا ہوا۔“ تو فیروز باغ میں نہیں ہوں گے۔ وہ نسل در نسل اپنے علم کو منتقل کر رہے جائیں گے اور ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔“

”ہم زمانے کے مسافر ہیں۔ ہم بھی ختم نہیں ہوں گے۔“ وہ تقاضے سے مسکرایا۔ ”تمہارے پاس ایک رات ہوگی وان فاتح۔ تمہیں اپنا دنیا کے شکار باز راہبر سے ملنا ہوگا۔ وہ تم سے تین سوال پوچھے گا۔ اگر تم ان کا جواب دے سکو تو تمہارے لیے امید نکل سکتی ہے۔“

”کیسے سوال؟“

مراد راجہ نے لباس شانوں سے جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ کمر پہ باندھ لیے۔

”معلوم نہیں۔ ہر زمانے کے اصول اور سوال مختلف ہوتے ہیں۔ وقت کا چکر مکمل ہونے پہ جب بھی چابی تحلیل ہوتی ہے وہ شکار باز راہبر کے پاس چلی جاتی ہے۔ تاہم جب بچپن میں تمہاری دنیا میں گئی تھی تو وقت کا چکر مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے وہ چابی ٹوٹ گئی اور کئی برس تحلیل نہ ہوئی۔ تم نے میری دنیا میں آتے وقت دروازہ کھول ڈالا جس سے چابی تحلیل ہوتے ہی میرے پاس تو آ گئی لیکن وہ ناکارہ ہو چکی تھی کیونکہ تم نے وقت کا چکر خراب کر دیا ہے۔“ وہ سانس لینے کو رکھا۔ فاتح غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

”اب جو چابی میں تمہیں دے رہا ہوں یہ تحلیل ہوتے ہی تمہارے زمانے کے شکار باز کے پاس چلی جائے گی۔ اس چابی میں تمہاری یادیں قید



”کون؟“

”وقت کا مسافر ہوں اور اپنی یادیں واپس لے آ رہے ہیں۔“

دوسری طرف جاسوشی چھا گئی۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھلا۔ وان قانع نے چہرہ اٹھایا تو اپنے سامنے چوکھٹ پہ ایک اوجڑ عمر آدمی کو کھڑے پایا۔ اس نے کرتے پا جاسے کے اوپر ناف کے گرد کپڑا باندھ رکھا تھا اور سر پہ جینز کپڑے ٹوٹی تھی۔ ٹھوڑی پہ ہلکی سی ڈاڑھی تھی۔ آنکھیں سیکڑ کے قانع کو دیکھا اور مسکرایا۔

”خوش آمدید۔“ پھر راستہ چھوڑ دیا۔

اس نے جوتے چوکھٹ پہ اتارے اور اندر داخل ہوا۔ وہ آدمی آگے بڑھتا گیا۔ صاف ستھری چھوٹی سی راہداری عبور کر کے ایک دیوان خانے میں اسے لے آیا جہاں فرش نشست چھٹی تھی۔ دیوار پہ فلیٹ بنے تھے جن کے خانوں میں کاج کی بہت سی بوتلیں رکھی تھیں۔ اگر مٹی اور خوشبودار موسمیوں نے فضا کو مضر کر رکھا تھا۔

وہ دونوں آمنے سامنے چٹائی پہ دوڑانو ہو کے بیٹھ گئے تو اس آدمی نے غور سے قانع کو دیکھا۔

”وقت کے مسافر ہو؟“

”اپنی خوشی سے نہیں گیا تھا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”غلطی سے دروازہ مار کیا تھا۔ صبح اس چابی کے تحلیل ہوتے ہی قدیم ملاکہ میں گزرے پل بھول جاؤں گا۔“

”یاد رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ وہ نرمی سے مسکرایا۔

”میں فرار ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جو کیا ہے اس کو یاد رکھ کے اس کا سامنا کرنے والوں میں سے ہوں۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں جو اس جادو کا توڑ ہو سکے اور صبح پہری یادداشت نہ کھوئے۔“ اس آدمی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں قانع کی گردن میں پڑی زنجیر پہ جمی تھیں۔

”یادداشت تو کھو جائے گی لیکن ایک صورت

ہی ہے۔ اگر تم اس راہ کو نہ چھوڑنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنی اس کارِ مست خور کو کھائے کی سب میں نے تمہیں سب سے زیادہ سب ہم اس مقابلے میں مدد دیں۔ تمہاری یادداشت واپس آئے یا نہ آئے میری جی ڈاڑھی ضرور آئے گی۔“

”دیکھتے ہیں۔“ وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

ہم چاہتے ہیں

سولہ جولائی کی رات تالہ اور ایم کے اہل کے لیے نکل پڑے تو وہ پولیس اسٹیشن چلا آیا۔ اپنا بیان ریکارڈ کروایا مگر یہاں سے وہ گھر نہیں گیا۔ اس نے گردن میں پڑی چابی کو ہاتھ میں اٹھا کے دیکھا۔

”مجھے اپنے وقت کے شکار باز سے ملنا ہے۔“

پھر اس کے پاس لے چلو۔

چابی سے سنہری سا پنکھ نکلا اور فضا میں اڑنے لگا۔ قانع نے گاڑی وہیں چھوڑی اور اس سنہری پنکھ کے پیچھے قدم۔ قدم چلتے لگا۔ اس پنکھ کو اس کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ہوا میں تیرتا پر صرف قانع کو راستہ دکھانے کے لیے تھا۔

وہ مٹی میں دویران سڑکوں پہ چلتا رہا۔ چابی ہر گزرتے پل کے ساتھ بھاری ہوتی جا رہی تھی مگر وہ اس وزن کو برداشت کیے ہوئے تھا۔ پنکھ اڑتا چلا جا رہا تھا۔

ملاکہ کے ایک مہمان آباد علاقے میں وہ اسے کھینچ لایا۔ وہاں مقام میں ایک منزلہ گھر بنے تھے جن کی خروچی چھٹیں تھیں اور دیواریں سرمئی نیلی اینٹوں کی بنی تھیں۔ وہ درمیانے درجے کا علاقہ تھا اور رات کے اس وقت سنسان پڑا تھا۔

پنکھ ایک دروازے کے پائیدان پہ جاگرا اور ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ منزل آچکی تھی۔

وان قانع نے ہسٹلی سے دستک دی۔ پھر کھنٹی بجائی۔

دھنک قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کسی نے اندازے کے پیچھے سے سوال کیا۔



ہے اس کے واپس آپنے کی۔“

”بتائیے۔“ وہ محل سے بولا۔ گردن میں پڑی زنجیر بھاری ہو رہی تھی۔

”اگر تم وقت کے تین سوالوں کا جواب پالو تو تمہاری یادیں وقت تمہیں خود لوٹا دے گا۔“

”یوچھیے۔ وہ تین سوال کیا ہیں۔“

شکار باز کی نظریں زنجیر سے اٹھ کے اس کے چہرے پر جا رکیں۔

”تو پھر بتاؤ۔ پہلا سوال، کوئی کام شروع کرنے کے لیے سب سے اہم وقت کون سا ہے؟

دوسرا سوال۔ انسان کی زندگی کا سب سے اہم کام کون سا ہوتا ہے؟

تیسرا سوال انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہونا چاہیے؟“

چند ثانیے کے لیے اس دیوان خانے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں نے ہلکے سے ہنسی کی۔

”اور اگر میں کہوں کہ مجھے ان تینوں سوالوں کے جواب معلوم ہیں تو؟“

”تو میں یہ کہوں گا کہ اکثر کہتے ہیں لیکن ان کا جواب دینا کافی نہیں ہے۔ تمہیں ان کا جواب

”پانا“ پڑے گا۔ کل جب تمہاری یادداشت کھو جائے گی تو تمہارا امتحان شروع ہوگا۔ جس دن تم ان

جوابات کا، دل کے اطمینان سے اقرار کر لو گے تو وقت تمہیں تمہاری یادداشت لوٹا دے گا۔ لیکن ایک

شرط ہے۔“

”کبھی۔“ وہ بدقت بولا۔ چابی بھاری ہو رہی تھی۔ شاید وہ دیکھنے بھی لگی تھی کیونکہ اسے گردن پہ

گرمانش محسوس ہو رہی تھی۔

”تم کسی سے بالواسطہ مدد نہیں مانگ سکتے۔ تم اپنے لیے کوئی تحریر یا اشارہ چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ تم

اس امتحان میں نفل کر کے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تم ان سوالوں کے بارے میں کسی کو بالواسطہ کچھ نہیں بتا

سکتے ورنہ تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ تمہیں ان کا

جواب فطری طریقے سے خود حاصل کرنا ہوگا۔“

”اگر کوئی اپنے طور پر میری مدد کرنا چاہے تو؟“

”تم ان تین سوالوں کے بارے میں کسی کو بتا

سکتے ہو لیکن اس سے مدد نہیں مانگ سکتے۔ اس کے علاوہ جو کہو اس کے لیے تم آزاد ہو۔ کوئی خود سے

تمہاری مدد کرنے وہ اس کے لیے آزاد ہے۔“

ادویہ عمر آدمی دھیرے دھیرے کمر ہاتھ۔

”یہ سوال تم سے کل کے بعد اگر کوئی زبانی

کلامی پوچھ بھی لے تو بھی ان کا جواب دینا درکار نہیں۔ تمہیں اپنے عمل سے ان کا جواب خود کو دینا

ہوگا۔ جس دن تمہاری زندگی میں یہ جوابات شامل ہو جائیں گے تمہاری یادیں میں تمہیں لوٹا دوں گا۔“

رات پچھلتی جا رہی تھی اور شکار باز کی آواز جھج جھج رہی تھی۔ وہ بڑھتے ہوئے بوجھ کے ساتھ کمر

رہا تھا۔

”یعنی میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”شہزادی تاشہ کو؟ ہرگز نہیں۔ اگر تم نے اسے

چھوڑ دیا تو آخری سوال کا جواب کیسے دھڑپاؤ گے۔“

”آپ اسے جانتے ہیں؟“ قانع نے اردو

اٹھائی۔ پراسرار آدمی مسکرایا اور شلیف کی طرف اشارہ کیا جہاں کالج کی خفیہ صراحیاں رکھی تھیں۔

”ان میں سے تیسرے نمبر والی میں تابلہ کی

یادداشتیں ہیں۔ اس کو ایک سوال کا جواب مل گیا تھا اس لیے کچھ یادیں واپس چلی گئیں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ بھری ہوئی نہیں ہے۔ اور وہ جو خالی صراحی ہے وہ تمہاری ہے۔ صبح یہ بھر جائے گی۔“

قانع نے کپٹی کو چھوا۔ چابی کا وزن بڑھتا جا رہا تھا۔

”اگر اسے میرے ساتھ رہنا ہے تو اسے ایک

بات کا علم ہونا ضروری ہے۔“ قانع نے قریبی میز پر

دھرا قلم کاغذ اٹھایا اور صفحے پہ چند ہندسے لکھنے لگا۔

”وہ میرے قدموں کے نشانات کا پچھا کرتے

یہاں ضرور آئے گی۔ جب وہ آئے تو اس کو یہ



بندے دے دیجیے گا۔“ صفحہ پھاڑ کے اس کی طرف  
دھمکیاں دیکھ کر باز نے اس کا غد کو تہ کیا اور جیب میں  
رکھا۔ ”درست وقت اور درست جگہ پر میں اسے یہ  
پہنچاؤں گا۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔“  
وان فارغ نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور  
اندھ کھڑا ہوا۔

”مجھے واقعی جانا چاہیے۔ ایک ادھوری ای میل  
کو مکمل کرنا ہے مجھے۔“  
واپس کا راستہ طویل تھا مگر کٹ گیا۔ جیب میں  
کچھ سکے تھے جن سے اس نے رک کے ایک فون  
بوٹھ سے عثمان کو کال کی اور ایک رقم ایڈم کے اکاؤنٹ  
میں ڈلوانے کو کہا۔ ساتھ ہی اپنے لیے نئے موبائل کا  
بندوبست کرنے کا حکم دیا۔

واپس گھر آ کر اس نے ای میل کی آخری سطور  
مٹائیں اور اسے دوبارہ سے لکھا۔ پھر ایڈم کو ایک ای  
میل الگ سے لکھی۔ وہ چاہتا تھا کہ تالیہ کو ان پیسوں  
سے ایڈم چاہلیس اور کو کو بچل بھیجا کرے۔  
وہ سب کچھ بھول بھی جائے تو بھی تالیہ نہ  
بھولے کہ وہ دونوں ابھی تک مکمل طور پہ وقت کی  
غلامی سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔

☆☆☆

واپس جالیہ دن میں آتے ہیں۔  
وان فارغ کے آفس کے باہر سیکرٹری کا کیمین  
تھا۔ اس کے آگے چھوٹا سا لالچ ہا تھا۔ لالچ کے  
صوفے پہ براعتان تالیہ اس کیمین کے ساتھ کھڑے  
سرگوشیوں میں بات کرتے عثمان (سیکرٹری) اور  
عبداللہ (باڈی مین) کو صاف دیکھ سکتی تھی۔

عثمان اب دونوں ہاتھ اٹھا کے تسلی دینے والے  
انماز میں اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ عبداللہ کا چہرہ بچھ گیا۔  
سر اثبات میں ہلایا۔ شکوہ کتنا انماز میں تالیہ کی  
طرف دیکھ کے کچھ کہہ بھی ڈالا۔ عثمان اس کے  
کنڈے کو چھپتا مڑا ہائی کی ناٹ درست کی اور  
چندے پہ مسکراہٹ سجائے تالیہ کی طرف آیا۔

”چے تالیہ۔“ خوشامدی انداز میں کہتا اس کے  
قریب صوفے پہ بیٹھا۔  
وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی ناقدانہ انداز  
میں اسے دیکھنے لگی۔  
”کیا تجھے جاب دینے سے انکار کر دیا ہے فارغ  
صاحب نے؟“

”نہیں نہیں... اصل میں... ابھی کوئی دیکھنی  
خالی نہیں تھی لیکن عبداللہ کچھ دن سے چھٹی مانگ رہا  
تھا تو کیوں نہ کچھ دن آپ عبداللہ کی جگہ پہ کام کر  
لیں۔“

تالیہ نے ٹانگ دوسری ٹانگ سے ہٹائی اور  
سیدھی ہوئی۔ تاثرات بدلے۔ ”باڈی وومن کی  
جاب؟“

”بس کچھ دن کے لیے... عبداللہ جیسے ہی  
واپس...“

”عبداللہ ابھی تو چھٹی سے واپس آیا تھا۔ غالباً  
آپ اسے چند دن کے لیے چھٹی پہ بھیج رہے ہیں  
کیونکہ باس کو لگتا ہے کہ (بندہ دروازے کو دیکھا) چے  
تالیہ چند دن سے زیادہ نہیں نکلتے گی۔“

”ہرگز نہیں، میم....“ عثمان شرمندہ ہوا۔ تالیہ  
نے ماتھے پہ ہل ڈالے، ہنکارا بھرا۔

”خیر... آپ باس کو جا کے بتائیں کہ تالیہ مراد کو  
یہ جاب منظور ہے۔ کب سے کام شروع کروں؟“ وہ  
ایک دم طنز اسکرا کے بولی۔

عثمان کو شاید توقع نہ تھی۔ لمبے بھر کو چپ ہو گیا۔  
پھر مسکراہٹ لیوں پہ واپس لے آیا۔

”کل سے۔ آج آپ پورا دن خود کو کو ذہنی طور پہ  
تیار کر لیں۔“

وہ اٹھنے لگا تو وہ بولی۔ ”وہے مجھے کیا کرنا ہوگا؟  
کیا وان فارغ کی حفاظت کرنی ہوگی؟“

”وہ تو باڈی کارڈز کا کام ہے۔“ عثمان جھینپ  
کے ہنسا۔ ”یہ باڈی وومن کی جاب ہے۔ ہر سیاست  
دان کے ساتھ ایک سیکرٹری اور چند کارڈز ہوتے ہی  
ہیں مگر ایک پرسنل ایڈ بھی ہوتا ہے جو باڈی مین کہلاتا



ہے۔ وہ بالکل بھی ہادی کارڈ جیسا نہیں ہوتا۔  
 ”اور اس کا کام کیا ہوتا ہے؟“ وہ گردن اٹھا  
 کے سامنے کھڑے عثمان سے پوچھ رہی تھی۔  
 ”باس کے کھانے پینے اور کپڑوں کا خیال  
 رکھنا۔ چیزیں پکڑانا، کوٹ، داغ لگا ہے تو اسے  
 صاف کرنا۔ ان کی صحت کا خیال رکھنا۔ کام کی زیادتی  
 باس کو اپنا آپ بھلا دیتی ہے تو آپ ان کو ازنی بارز  
 اور کافی لا کے دیتی رہیں گی۔ وہ کار سے ٹپکس تو ان  
 کے ہاتھ سے خالی کپ لے لیتا وغیرہ وغیرہ۔“  
 ”پندرہویں صدی کے ملاکہ میں یہ کام غلام کیا  
 کرتے تھے۔ وان قارح مجھے غلام بنانا چاہتے ہیں؟“  
 وہ اداسی سے مسکرائی۔

”نہیں ہے تالیہ۔ یہ جاب بہت قابل مہروسا  
 لوگوں کو دی جاتی ہے۔“  
 عثمان کے جانے کے بعد وہ انھی اور کرسی پہ  
 خاموش بیٹھے عبداللہ کی طرف آئی۔  
 ”میں امید کرتی ہوں آپ کو مجھ پہ غصہ نہیں آ  
 رہا ہوگا کیونکہ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے آپ کی  
 جاب لے لی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی تو  
 وہ جلدی سے کھڑا ہوا۔

”ہرگز نہیں“ ہے تالیہ۔ مجھے شرمندہ مت  
 کریں۔“ وہ جھینپ گیا۔  
 ”میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو آپ کی  
 جاب واپس مل جائے گی۔ آپ میری طرف سے دل  
 برداشت کیجیے گا۔“

”اگلی کوئی بات نہیں ہے۔ باس کبھی بھی مجھے  
 یوں ضائع نہیں کریں گے میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے  
 نہیں اور ایڈجسٹ کر دیں گے۔“ وہ خوش دلی سے  
 مسکرا کے بولا تو تالیہ نے بند دروازے کو دیکھا۔  
 ”عبداللہ؟“ آواز دھیمی کی۔ ”کیا آپ مجھے  
 میری جاب سکرپشن لکھ کے دے سکتے ہیں؟“  
 ”بے ذی؟“ عبداللہ نے سوالیہ ایموڈا کیا۔  
 تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”تھانک صاحب کو آپ سے بہتر کون جانتا ہو

کا۔ اگر آپ مجھے قبول کر لیں تو میں اس کا بدلہ  
 کے اندر کیا لیا شامل ہے۔“ وہ اس کا بدلہ  
 کا۔  
 ”آپ کو دل ہے تالیہ۔ میں اس کو  
 ہوں۔ آپ نے کتنی جاب کی تالیہ؟“ وہ  
 جانتا تھا کہ باس کو مشکل نہ ہوئے ان نے فوراً  
 سے چھوٹی ڈائری نکالی اور قلم مولا۔ چار  
 اور جلدی جلدی کا نقشہ لکھا تو کہنے لگا۔ ”جوتھا  
 سمجھاتا بھی جا رہا تھا۔ وہ تین کمرے کا ہے۔“  
 کئی۔

یاد دینی میں کو آفس تک نہ جاتا تھا۔ یہ تالیہ  
 کرسی پر تھی۔ ہنسنے۔

”کیا پڑھ رہی ہو؟“ وہ پہرے میں وہ اپنے  
 کے برآمدے کے زینے پہ بیٹھی مہربانہ کے  
 کاغذات کو پڑھ رہی تھی جب حاتق سے تھکا کے بیٹھے  
 تالیہ چمکی پھر کاغذات کی طرف بڑھ گیا۔  
 ”مجھے وان قارح نے پرسنل ایڈجسٹ جاب  
 دی ہے۔ یہ میری ہے ذی (جاب ڈسپوٹنگ  
 ہے۔

اب وہ سامنے گھاس پہ جمی خشتی دھوپ کے  
 دیکھ رہی تھی۔ حاتق نے ٹیگ ڈاک پہ تکیا  
 کاغذات کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔  
 ”یہ اس کے آفس کی اگلی ترین جاب ہے۔“  
 ”جانتی ہوں۔“

”جانتی ہوتی قبول کیس کی؟“ یہ تھا بیٹے۔  
 ”مجھے خزانے سے بہت امید تھی۔“ حاتق  
 خزانہ وہاں نہیں تھا۔ خزانہ کھوپڑی کا ہے۔ یہ وہاں  
 میں دیکھ کر لگی ہوں۔ چھوٹی لبراری کے سامنے  
 پاس کچھ نہیں ہے۔ میں دن قمار کے قریب رہتا  
 چاہتی ہوں۔ ایسا ہے تو ایسے ہی کھی۔  
 ”کیا ان کو معلوم ہے کہ تم ہی عالم ہو۔“  
 چمکی۔

”عالم؟“ اسے یاد آئی۔ ”نہیں مگر اس نے



عام ایک کام کیا تھا۔ "اتن" تم ایک کام کرو۔ تم ہمارے  
ہاں اور معلوم کرو کہ سولہ اور سترہ ہلالی کی درمیانی  
نصف دان لاس کے ساتھ وہاں کیا ہوا تھا۔ ان کو ہمارے  
چوبیس آئی ہیں اور وہ یاد نہیں کر پا رہے کہ ان کے  
ساتھ یہ کیسے ہوا۔

"تم خود یہ کیوں نہیں معلوم کریں؟"  
"کیونکہ میں ہانتی ہوں ان کے ساتھ کیا ہوا تھا  
لیکن جو میں ہانتی ہوں وہ ان کی عقل سے آویز ہے۔  
تم ایک عام انسان کے طور پر جو بھی معلوم کرو کی وہ  
ان کی عقل میں آجائے گا۔ مگر داتن کی عقل نہیں  
ہوئی تھی۔"

"اگرچہ میں سب معلوم ہے تو ان کو آسان الفاظ  
میں بتا کیوں نہیں دیتیں؟"  
تالیہ اسے دیکھ کر رو گئی۔  
"وہ یقین نہیں کریں گے۔ کوئی یقین نہیں  
کرے گا۔"

"تو پھر میرے جانے کا فائدہ؟"  
"جو کام انہوں نے سوچا ہے اور جس کے چہرے  
وہ دیں گے اس کو ایمان داری سے کرنے کے لیے  
جسمیں وہاں جا کر اس رات کو نہیں کرنا ہوا۔"  
"اور اس رات ہوا کیا تھا؟" داتن غور سے  
اسے دیکھ رہی تھی۔ "اس رات کے بعد سے تم بدلی  
بدلی ہی ہو تالیہ۔"

"میرے ساتھ کیا ہوا تھا اسے جانے دو۔ لیکن  
ان کے ساتھ جو بھی ہوا تھا وہ کسی سی سی ٹی وی فوٹیج پر  
نہیں ملے گا۔ زیادہ سے زیادہ ہمیں یہی معلوم ہوگا  
کہ وہ ایڈم کے ساتھ سوا گیا وہ کے قریب کمر میں  
داخل ہوئے اور پھر ساڑھے گیارہ بجے ایڈم اور  
میرے جانے کے بعد وہ وہاں سے نہیں نکلے۔ یہ  
بات شیجوں کے ساتھ میں ان کو سمجھا دوں گی تو وہ اس  
رات کا چچا چھوڑ دیں گے۔"

وہ داتن کے ہاتھ سے کافیات لیتی تھی۔  
"اب میں اپنی نئی جاب کی تیاری کر لوں۔"  
"اودو ٹرکی... تم کیسے ایک سیاسی پارٹی میں کام

کر کی؟ تم اگر اپنے دل سے اتنا کہہ رہے ہو

تالیہ نے ہوا سے منہ کے لٹائی ہمارے دل کی  
اور گرائے داتن کو بٹھا۔

داتن (بہت سچے چہرے پر) میں نے اس کے قریب  
سے دھوپ آ رہی تھی۔ تالیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں  
اور اس نے ہاتھ ہاتھ کا بھرا ہوا۔

"وہ کون ہوتا ہے جو دوسرے کے دل کی اس  
کے ظالم استعمال کر کے... اسے... اسے...  
ہمارا دل سے کر لیا ہے اور ہمارے دل میں بھرتا ہے  
اگر اس کا کاربائو ہمارا ہوتا ہے تو ہمارے دل میں  
سکنا کیونکہ... ہمارے دل میں ہے کہ اس کا دل اپنی اس تھا۔  
کون ہوتا ہے وہ بھلا؟"

"ایک کام۔"  
"ہاں اور کیا سب داتن بھی۔"  
آنکھیں بند ہو کر اس کے تاریک نگر آتی داتن کو  
دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"ہر ایک شخص نے بعد محام ہاتھ ملاتے ہیں اور اس  
کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو ووٹ کیا دیا۔ یہ تو  
ہمیں ووٹ کے لیے گئے مگر یہ تو کیا سب داتن کا  
اسلام ہے۔ وہ لوگوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کو  
ووٹ دینا محام کا اپنا آئیڈیا تھا۔ لہذا داتن پوچھا۔  
نہلا۔

ایکشن ایک لمبا اسلام بہت ہے۔ ایک خوب  
صورت کون گیم۔ محام ووٹ نہیں دیتی۔ سب استمال  
محام کے خواہوں کون کا لافنی کا استعمال کرتے ہیں  
وہ اتنے دل فریب دے کرتے ہیں کہ محام مجبور ہو  
جاتی ہے۔ محام سے ووٹ لیا جاتا ہے۔ اور یہی  
میں... تو میں اس دفتر میں اس لیے کام کر سکتی ہوں  
کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اسلام کیسے کھیلے جاتے ہیں  
اور ان کا توڑ کیا بہت ہے۔"

"دان قانع کے اتنے قریب کام کرنے کے  
بعد یاد رکھنا کہ تجھے یہ چھپو ہو جائے گی۔"  
"تالیہ کی ہمت اب کوئی چھپو نہیں توڑ



سکتی۔“ پھر لیوں تک دو انگلیاں لے جا کر ان کو پھونک مار کے ہوا کے حوالے کیا اور مسکرا کے ہاتھ بلاتی اندر چلی گئی۔

”تالیہ کو کیا ہو گیا ہے!“ داتن پدوکا کی پریشانوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اتنی ٹڈر اور بے خوف تو کبھی نہیں تھی۔ آخر اس رات کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

جدید ملاکہ کے خوب صورت شہر پہ بارش پوری دو پہر دل کھول کے پری اور پھر صبحی تو شام اترنے لگی۔ سن باد کے گھر کا صحن گیا تھا اور بجسے کے قریب ایڈم زمین پہ بیٹھا دستانے چڑھائے اینٹوں کو جوڑ رہا تھا۔ کانٹوں میں چند زفری لگا رکھا تھا۔

”جی جے تالیہ! صبح تک سارا صحن برابر کر دیا تھا میں نے مگر کیاری والا حصہ بارش نے پھر سے خراب کر دیا۔ جی..... جی اب دوبارہ اسے جوڑ رہا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جینز کے گھٹنے کچھ آلود تھے اور دستانے کارے میں لتھڑے تھے۔ سر پہ ٹوپی تھی اور چہرے پہ مسکراہٹ۔

”آپ بتائیں، آپ کی جاب کا پہلا دن کیسا رہا؟“

دوسری طرف سے چلا بھٹا جواب موصول ہوا۔ ”باڈی دو من بنا دیا مجھے اس غلام نے، جس کی ایک زمانے میں میں نے بھری منڈی میں بولی لگائی تھی۔“ شہزادی تاشہ نے ساتھ میں ”ہونہہ“ بھی کیا تھا۔

”باڈی دو من؟“ اےٹ اٹھاتے ہوئے ایڈم ہنس دیا۔ ”یعنی کہ پرسنل ایڈ؟ اوہ جے تالیہ! مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ شہزادی کو غلام کی چاکری کرنی پڑے گی۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے اےٹ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گارا زیادہ ڈال دیا تھا اےٹ برابر نہیں بیٹھ رہی تھی۔

”خود جاب لیس ہو اور مجھ پہ ہنس رہے ہو۔ ارے جی نہیں تو کوئی باڈی مین تک نہیں رکھتا۔ ایک میں جی جس نے شاعری مورخ بنادیا تھا۔“

ایڈم رکا اور دائیں ہاتھ سے دستانہ اہلر کے اسے الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ”اور یہ معجزہ ہی ہے کہ آپ کی غلامی کے بعد بھی یہ ہاتھ سلامت ہے۔“

”اگر ہاتھ سلامت ہے تو ایک جاب ہے تمہارے لیے۔“

”تھم سمجھے، شہزادی۔“ اےٹ کو زور سے دیا۔ وہ اندر فٹ بیٹھ ہی نہیں رہی تھی۔ کچھ تھا جو غلط تھا۔

”قدیم ملاکہ میں تم شاعری مورخ تھے۔ تمام حالات حاضرہ کو رقم کرتے تھے۔ جانتے ہو ایسے شخص کو جدید زمانے میں کیا کہا جاتا ہے؟“

”کیا ہے تالیہ؟“ جھنجھلا کر اےٹ نکالی اور کیاری کے شکاف کو دیکھا۔ برابر سطح میں ایک اسی اےٹ کا خانہ خالی تھا۔ اس نے مٹی سے مزید اےٹ نکالی۔

”رپورٹر!“

”رپورٹر؟“ ایڈم حیران ہوا۔ ساتھ ہی مٹیوں سے مٹی بھی نکالے جا رہا تھا۔

”ہاں ایڈم۔ تم لکھنا چاہتے ہو؟ وہ بھی سچ؟ تو تم رپورٹرنگ کی طرف چلے جاؤ اور یہ مت کہنا کہ نہیں جاب کون دے گا۔ میرا ایک کلائنٹ ایک اخبار چلاتا ہے۔ اس سے تمہارے لیے وقت لیا ہے۔ دو دن بعد تم انٹرویو دینے پہنچ جانا۔“

”آپ اور اتنی مہربان؟“

”اور سنو، کوئی اچھی سی تحریر لکھ کے لے جاؤ۔“

تحریر تمہاری سی وی ہوگی۔ اس کو پڑھ کر ہی وہ سمجھیں

نو کر دیں یا نہ دینے کا فیصلہ کریں گے۔“ اس کی بات کو نظر انداز کر کے وہ کہے جا رہی تھی جب ایڈم

ایک دم کراہا۔ ”آؤ ج۔“

”یا اللہ! ایڈم.... کیا ہوا؟“

”جی جے تالیہ.... میں انٹرویو دینے ضرور جاؤں گا۔ اچھا میں ٹھہر کے کال کرتا ہوں۔“ اس نے

فون بند کیا اور ٹارچ جلا کے مٹی پہ روشنی پھینکی۔ ویسے شام کی روشنی پھیلی تھی مگر وہ کافی نہ تھی۔ ایڈم نے چہرہ


جھکایا اور تعجب سے چٹلیاں سکڑ کے دیکھا۔ اس کے



10/10/10

فلا يتركوا منكم

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے یہ سب کیا ہے۔  
میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے یہ سب کیا ہے۔



وہ آفتاب کی روشنی سے اس چراغ کی روشنی پر  
(پتہ لگا رہا ہے؟)

تار کیاری میں دنیٰ ہوا تھا وہاں سے تلی سے کھینچی  
کے نکالتا کیا دہری کے سرے تک آیا، جہاں وہ زمین  
کے نصف باہوا تھا وہ کہاں تک جا رہا تھا؟ یہ عجیب سا  
تار سن بانڈ کے جن میں کیوں دھن تھا؟  
ذہن کے کسی تہہ خانے میں حالیہ مراد کی آواز  
سکونگی۔

”سن باز کا گھر۔۔۔ تین خزانوں کا گھر۔۔۔“  
 پہلا خزانہ وقت کا تھا۔ جس کا نقل جھٹے سے  
 دل خالی ہو گیا تھا۔

دوسرا خزانہ انہوں نے مجھے ملنے لے کر ہاتھوں سے دیا تھا.... جسے کھودنے کے بعد بھی ہاتھ خالی رو گئے تھے۔

ایک دفعہ مذاق مذاق میں تالیے نے کہا تھا کہ اس گھر میں ایک تیسرا خزانہ بھی ہوتا چاہیے۔ کیا سن پاؤ گے گھر میں کوئی تیسرا خزانہ بھی دبا تھا جس سے کوئی واقف نہ تھا؟

ایڈم بن محمد یک ٹک اس بار کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی گردن کے بال کھڑے ہونے لگے تھے۔

☆☆☆

اس صبح عصرہ بہت محمودناشتے کی میز کی طرف جا رہی تھی، جب لاؤنج کی کھڑکی کے جالی دار پردے کو دیکھ کے رکی۔ وہاں سے لان اور پورچ دکھائی دے رہا تھا۔ وان فارغ کے گاڑ زکار کے قریب مستعد کھڑے تھے۔ صبح ہی صبح یہ عمل پہنچ جاتا تھا اور رات تک اس کے ساتھ رہتا تھا۔ عصرہ کو ہر صبح عثمان دو گاڑ ز اور عبداللہ کو اس جگہ دیکھنے کی عادت تھی مگر آج

[illegible]

”صبح تھے مہر مصر و...“ جالبہ شعلہ سے مستغرائی  
 اور فوج تھی پانچواں اٹھائے تھے سے لیدر، بیک میں  
 قال۔

آشہرہ صاحب سے جا ب کا کہا تو انہوں نے  
بچے فتح صاحب کے اسٹاف میں بطور باڈی وورک  
جا ب دیا۔ ”کہہ دیا چکا کے بولی۔ عہدہ  
میرے حق تک ایک تہا نھر میں اس کا جائزہ لے لیا۔

وہ عام دنیا کے برعکس ساوا و تیار ہوئی تھی۔  
 پانچویں چالیسویں فراراک گروہ میں پھول دار  
 دیہاتوں کی لڑائی پونی پتھر میں کیے ہوئے شہزادہ  
 واپسی ایک پرستار ایڈلک دہی تھی۔ وہ ایک بڑے بڑے  
 کوٹ و ہوتی لباس سب سارے تھا۔ ہاں انکی کی سرخ  
 آنسو شکل انھوں اور بالوں میں لگا منہرے ہرن کے  
 چہرے والے ٹکپ و یہی تھا۔

”باڈی ووڈ من۔ اوو اچھا۔ اچھا۔“ عصرہ سنبھل کے مسکرا دی۔ پھر ادھر ادھر سارے عملے کو دیکھا جو قلعہ کے انتظام میں کھڑے تھے۔

”مجھے نہیں معلوم تھا تم سیاسی عزائم بھی رکھتی ہو۔“

”عزائتم کا تو علم نہیں، البتہ وہ تمام خوبیاں میرے اندر موجود ہیں جو بی این میں کام کرنے کے لیے درکار ہیں۔“

”گنڈ“۔ ”عصرو نے مسکرا کے شانے اچکا دیے“  
البتہ ایک گہری نظر اس پہ ضرور ڈالی جو کارے ٹیک  
لگائے بے نیازی سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

عصرہ کے جانے کے بعد گیٹ کھلا اور وہ اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ لی شرت ٹراؤزر میں ملبوس



پیسے سے ترچہ لے کر کمرے کمرے سانس لیتا وہ  
 اندر آیا تو وہ فوراً سیدھی کمری ہوئی۔ ایک ہاتھ بیک  
 میں چلا گیا۔  
 ”آپ کی پوسٹ ورک آؤٹ ڈرنک۔ سر“  
 آگے آئی اور ادب سے ہوس نکال کے پیش کی۔ ہوسل  
 سلور رنگ کی تھی اور عبد اللہ نے سامان کے ساتھ  
 حوالے کی تھی۔ فاتح نے ہوسل پکڑتے اسے ایک نظر  
 دیکھا۔

”تم آگئیں ناشا“ ہوسل منہ سے نکالی۔  
 کمرنٹ بھرا۔ پھر منہ ہاتھ کے ہوسل پیچکی۔  
 ”گناہ ہے تم نے اپنی ساری کڑواہٹ بھی  
 میری ڈرنک میں کھول دی ہے۔“  
 چوتھی بھرت ڈرنک کی تھی کہ وہ مٹھا کر رکھی۔ قبل سے  
 اس کی آنکھوں میں دلچسپی تھی۔ ”آپ کی  
 لہو سے رنگ ہے سر“ لیکن اگر آپ نے ابھی ابھی  
 اپنے لہو سے رنگ لے لیا ہے تو مجھے کیا لگاؤ ہے  
 میں۔ میں اس سے دھن لے لوں گی۔“

”میرے پاس کچھ دوا ہے“ عبد اللہ نے کہا۔  
 ”اگر آپ اس کے ہاتھ میں تھامیں اور اندر آگے  
 بڑھ گئے تو اس کے گرد آنکھوں سے اسے جاتے  
 دیکھا جائے گا۔“ عبد اللہ نے کہا۔  
 اس کی ”پریشانی“ دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ اس نے کہا  
 ”جگ بگ میں اہل دینی۔ بے حد لالچ شروپ  
 خراب خال کے ہاتھ میں جاتے ہیں۔ آپ اسے لڑا  
 محسوس ہوگا۔“

کار میں وہ غامضی سے اگل پڑا۔  
 عثمان اس کے ساتھ اور اس کے پیچھے اچھا لالچی سے  
 اس کے ساتھ رہا۔ ”کمال“ اس کے ساتھ رہا۔  
 ”آپ اس کمال سے اس کے ساتھ رہیں۔  
 کی بات ہے کہ اس کے ساتھ رہیں۔ اس کے ساتھ  
 رہیں۔ اس کے ساتھ رہیں۔ اس کے ساتھ رہیں۔  
 اس کے ساتھ رہیں۔ اس کے ساتھ رہیں۔  
 اس کے ساتھ رہیں۔ اس کے ساتھ رہیں۔

وہ کار سے نکلی تو ایک دم بوند باندھی شروع ہو  
 گئی۔ چھتری بیک میں تھی اور کے ایل کا موسم وہاں  
 فاتح کے موڈ جیسا تھا۔ ہل میں تو لہ ہل میں ماش۔  
 اخبار کے اشال پہنچنے تک بارش کی تیز بو مچاڑ رہی تھی۔  
 تالیہ بھیک گئی۔ اخبار کو تو پلاسٹک رچہ میں ڈال  
 مگر خود کو کہاں ڈالتی؟ بھانسی ہوئی واپس کار میں آئی  
 اور اندر پناہ لی۔ پھر رچہ کھول کے اخبار پیچھے ہاس کی  
 طرف بڑھایا۔

اس نے ایک نظر بھیک کی ہوئی لڑکی پر ڈالی اور  
 اخبار لے لیا۔ پھر بیک لگا لی اور چند لمحوں میں سرسری نظر  
 سے خبروں کا جائزہ لیا۔ پیشانی فشان آلود ہو گئی۔  
 ”تم یہ اخبار خود پڑھ لو۔ تمہاری سیاسی سمجھ بوجھ  
 میں اضافہ ہوگا۔“ شاید کسی خبر کو دیکھ کے موڈ غریب  
 ہوا تو بیک اتاری اور ناگواری سے اخبار آگے بڑھا  
 دیا۔

عثمان خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا جیسے بے جا  
 کی بے عزتی نہیں دینی ہی نہ ہو۔  
 اس نے چپ چاپ اخبار لیا اور رول کر کے  
 بیک میں اال دیا۔ تاثرات سپاٹ رکھے۔ (اب  
 یہ الی اخبار بھی کڑوا ہے کیا؟)۔

وہ اس کے اندر چلا گیا تو وہاں کرسی پر خاموشی  
 سے بیٹھ گئی۔ اس کے کمرے کی کرسی۔ کالی کادیت والی  
 اسی اور بچن میں گئی۔ اس کا بچہ دنا سا بچن لڑک  
 اسٹاک کے لیے تھا۔ ایک کالہ بچن چاند تھا۔

ابھی اس نے کالی بھالی ہی تھی کہ ساتھ ایک  
 لڑکی آگے لڑی ہوئی۔ وہ اپنے لیے کمال دھا  
 تھی۔ اس کو اپنے لیے تالیہ رکھی۔ مانتے مانتے اس کے  
 پھر سے اس والی پیدائش لڑکی تھی جسے گراپ میں  
 (بچپن میں پیدا ہوئی تھی۔ لہذا مالک کی سرپرستی کی  
 قیام میں ایک دو گراپ تھا۔ جو اسے لالہ تھا کہ کبھی  
 واپس چاہیں گے۔ کوئی نہیں پڑی؟  
 ”تم فاتح صاحب کی اطلاع دو“ اس نے اس کے  
 جانے جانے سے اس کے ایک سرسری نظر تالیہ پر ڈالا۔  
 تالیہ نے سر اٹھا دیا۔



ساتھ بیک دیوٹشٹ میں اس کا ٹکس دیکھا۔  
 فارج نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ٹک لہوں  
 سے لگا یا۔ دو گھنٹ بھرے۔ پھر سڑک کنارے  
 بھاگتی عمارتوں کو دیکھ کے کہنے لگا۔  
 ”تم نے راپا پٹنی کی بیٹی والی کہانی پڑھی ہے؟“

”نہیں سہرا“ وہ سانس روکے اس کے تاثرات  
 پڑھ رہی تھی۔ دل برا ہونے لگا تھا۔

”راپا پٹنی نے اپنے گھر میں زہریلے پھولوں  
 کا باغ لگایا اور بچپن سے اپنی بیٹی کو زہریلے پھولوں کا  
 رس پلانے لگا۔ تھوڑا تھوڑا زہر اس کے اندر اترتا تو وہ  
 مری نہیں بلکہ زہر سے Immune (محفوظ) ہوتی  
 چلی گئی یہاں تک کہ وہ خود ایک زہریلا پھول بن گئی۔  
 وہ لڑکی جس پھول کو چھوتی۔ وہ اس کے ہاتھ میں  
 مرجھا جاتا۔ جس شخص کو چھوتی اسے اپنے ٹکس کے  
 زہر سے مار دیتی۔ میں اب تک سمجھتا تھا کہ یہ ناممکن  
 ہے کہ کسی انسان کے ہاتھ میں اتنی کڑواہٹ بھر  
 جائے کہ وہ جس کو چھوئے“ سر جھٹک کے عثمان کو  
 پکارا۔ ”پلیز اس کاٹی کو اس پھول بیچنے والے کو دے  
 آؤ۔ شاید اس کو یہ اتنی بد مزہ نہ لگے۔“

عثمان نے کار روکی۔ خاموشی سے دونوں کپ  
 لیے اور باہر نکل کے ایک پھولوں کے اسٹال تک چلا  
 گیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی لب کاٹی رہی۔ وہ جواب  
 نہیں دے گی یہ طے تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا تا کہ وہ  
 جواب میں پھٹ پڑے اور وہ اسے نکال دے۔  
 نہیں۔ وہ چپ رہے گی۔ وہ اسے خود کو نکالنے کی  
 معقول وجہ نہیں دے گی۔ تالیہ مراد اگر کڑوی تھی تو  
 وان فارج کو یہ کڑوا گھنٹ پینا ہی پڑے گا کیونکہ یہ  
 اس کی اپنی خواہش تھی کہ تالیہ اس کے ساتھ رہے۔ وہ  
 صرف اپنا وعدہ بھاری تھی۔

☆☆☆

ملا کہ میں آج مطلع صاف تھا۔ سن باؤ کا گھر  
 خاموشی سے کھڑا اپنے سامنے بنے بازار کو دیکھ رہا

”کافی“  
 ”کافی“ میکر استعمال کے بعد صاف کر دینا اور  
 فز پھر نکال کے پینک دینا۔ یاد سے۔“ نگرے  
 سے باز کر دیا تو تالیہ نے بس ایک خاموشی نظر اس پہ  
 ڈالی۔ (یہ نہیں جانتی کہ ایک دن میں اس کو ٹریڈیٹ  
 کروں گی۔ مگر ایک باڈی وومن کسی کو ٹریڈیٹ کیسے کر  
 سکتی ہے؟)

کافی لے کر وہ اندر آئی تو وہ فائلز میں الجھا بیٹھا  
 تالیہ نے لکھا تو عادی بولا۔ ”ٹھیکس عبد...“  
 پھر رکا۔ نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ تاثرات  
 پاٹ ہو گئے۔ خاموشی سے مگ اٹھایا اور گھنٹ  
 ہرا۔ وہ جان بوجھ کے رک کے اس کے تاثرات  
 دیکھنے لگی۔

”خود بتائی ہے؟“ گھنٹ بھر کے پوچھا۔  
 ”جی سہرا“

”بہت بد مزہ ہے۔ آئندہ مت بنانا۔ نیچے مال  
 سے لے آنا۔ اسے گرا دو۔“ ناگواری سے کہتے مگ  
 بے دھکیلا اور لیپ ٹاپ سامنے کر لیا۔ ماتھے پہ  
 لکھیں اور آنکھوں میں برہمی تھی۔

ملا کہ کی شہزادی کے لیے میر کے گھنٹ بھرنا  
 بہت مشکل ہو گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ جان بوجھ  
 کے ایسا کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے وہ خود جاب چھوڑ  
 کے چلی جائے۔

”نیچے مال سے لے آتی ہوں سہرا۔“  
 ”اچھی پارلیمنٹ کے لیے ٹکس کے“ جب لے  
 آتا۔ وہ کی بورڈ پہ ٹائپ کر رہا تھا۔ بے نیازی سی  
 بے نیازی تھی۔ وہ اتنا مصروف تھا کہ اس کے پاس  
 تالیہ کو دیکھنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ پلٹ  
 گئی۔

فارج کار میں بیٹھ چکا تھا جب وہ کافی کے دو  
 گلاس اٹھائے بیک سنبھالتی کار تک آئی۔ عبداللہ نے  
 بتایا تھا کہ وہ پارلیمنٹ والے دن راتے میں دھگ  
 کاٹی پتا ہے۔ اس نے ایک مگ پکڑ لیا اور دوسرا اس  
 کی طرف بڑھا دیا پھر آ کے بیٹھ گئی۔ دھڑکتے دل کے



”خیر... سو بھی سکتی ہے مگر اس جیسے بڑے لوگ

یہاں نہیں آتے۔ وہ تو اپنے غلوں سے ہی نہیں نکلتے۔“ آنسو پھر سے اس کی آنکھوں سے اگلنے لگے۔ ”اور ان کے محلات کی حفاظت میرے جیسے لوگ کرتے ہیں۔“

”نہیں نہیں وہ آتا ہے۔ رک کے دکان والوں کی خیریت بھی پوچھتا ہے۔ مہینے دو مہینے بعد ایک دن کے لیے آ جاتا ہے۔ ابھی کچھلے پختے ہیں وہ آیا تھا۔“ بتانے والی عورت بھی اور شردخ ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد داتن سڑک کنارے چلتی فون کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔

”تھوڑا بہت علم ہوا ہے کہ اس رات دان قراغ نے کیا کیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے، داتن۔“ تالیہ اس وقت پارلیمنٹ کی گیلری میں بیٹھی تھی اور فون کان سے لگائے روکے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ نیچے بیٹن جاری تھا۔ ڈیک سجے تھے اور نیچے بیٹھے اشعر اور فاتح دکھائی دے رہے تھے جو خاموشی سے ایک ساکھی کی تقریر سن رہے تھے۔

”میں نے ارد گرد لوگوں کو کریدا ہے۔ ایک نے تو سی سی ٹی وی فوٹیج بھی دکھا دی ہے۔“

”اور اس میں تم نے مجھے اندر داخل ہونے دیکھا ہوگا۔“

”ہاں۔ اور بعد میں ایڈم آتا ہے فاتح کو لے کر۔ پھر پولیس والے آتے ہیں اور کچھ دیر بعد تم ایڈم باہر نکلتے ہو مگر تمہارے لباس مختلف ہیں۔“

”اور پھر دان فاتح سو جاتا ہے اور سب جب اٹھتا ہے تو اس کو گزشتہ رات بھول چکی تھی۔“

بے زاری سے دہرا رہی تھی۔ وہ لمبی کتھا سننے کے سوا میں نہیں تھی۔ ”اب کتنی ایمان داری ہے مکمل ہوئی ہے داتن تم واپس جاؤ اور سی سی ٹی وی فوٹیج مجھے بھیج دو۔ میں فاتح کو دکھا دوں گی۔“

”دان فاتح سو یا نہیں تھا۔ وہ تمہارے جانے

تھا۔ وہاں قطار میں دکانیں اور ریسٹوران تھے۔ باہر کرسیاں میزیں ڈالے بیٹھے لوگ کھانے پینے اور خوش چہلوں میں معروف تھے۔

ایسے میں ایک ریسٹوران جون باؤ کے گھر کے عین سامنے تھا اس کے کاؤنٹر کے ساتھ رکھے اسٹول۔ داتن بیٹھی تھی۔ کاؤنٹر پہ ٹشو کا ڈبا رکھا تھا جس سے ٹشو نکال نکال کے وہ آنکھیں پونچھ رہی تھی اور ساتھ کھڑی معرسلز دوین ہمدردی بھرے تاثرات سے اس کی کتھا سن رہی تھی۔

”نہ وہ پیسے بھیجتا ہے نہ ملنے آتا ہے۔ اتنے بڑے آدمی کی نوکری نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا ہے۔“

موٹے موٹے آنسو صاف کرتی وہ میلی آواز میں بتا رہی تھی۔ سر پہ اس کا رقبہ لپیٹے داتن پد کا ایک دکھیا ری عورت لگتی تھی جس کے نم دوسری عورتوں جیسے تھے۔

سبز دوین نے تاسف سے سر ہلایا۔

”یا اللہ... آج کل کی اولاد۔“ پھر جیسے رائے دینے لگی۔ ”تم اس کے باس سے کیوں بات نہیں کرتیں۔“

”اس کا باس؟ ہونہ۔ وہ دان فاتح... ممبر پارلیمنٹ کا سالہا ہے۔ اشعر محمود۔ اس سے کیا بات کروں۔ میرے جیسوں کو تو وہ اندر گھسنے ہی نہ دے۔“

”دان فاتح کا سالہا؟“ سبز دوین نے چونک کے سڑک کی طرف دیکھا جس کے دوسری طرف سن باؤ کی حویلی تھی۔

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں زہری سے کہتی ہوں دان فاتح سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ تمہیں معلوم ہے۔“ راز داری سے کاؤنٹر پہ جھکی۔

”یہ سامنے والی سرخ حویلی دان فاتح کی ہے۔“

”ایس؟“ رولی ہوئی داتن نے سر اٹھا کے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر منہ ہٹایا۔ ”ادھر ملا کہ میں اس کی حویلی کہاں سے آگئی؟“



کے بعد گھر سے نکل گیا تھا اور صبح فجر سے پہلے واپس آیا تھا۔

تالیہ مراد تیزی سے سیدھی ہوئی۔ نظر نیچے بیٹھے تھے۔ جم گئی جو یہاں سے بہت چھوٹا نظر آ رہا تھا۔

”وہ گھر سے باہر گئے تھے؟ مگر کہاں؟ انہوں نے تو کہا تھا کہ وہ اب آرام کریں گے۔“

”اطراف والوں نے اڑتے اڑتے سنا ہے کہ اس رات وان فاح کے ساتھ کوئی چوری چکاری کی ررات ہوئی تھی اور وہ پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ یہ چھوٹا ملاکہ ہے اور فاح مشہور آدمی ہے، ایسی باتیں سچھی نہیں رہتیں۔“

ایک دم سے معاملہ دلچسپ ہو گیا تھا۔ وہ چونکا گئی۔

”دانت... تم معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کیا وہ ماری رات تھانے میں رہا تھا یا کہیں اور بھی گیا تھا۔“

”میں یہی کرنے آئی ہوں ملاکہ، لیکن وعدہ کرو کہ واپسی پہ تم مجھے سب کچھ بتاؤ گی۔“

تالیہ نے جواب دیے بتا فون بند کر دیا۔ پھر اپنا دوسرا موبائل نکالا اور فاح کو پیغام لکھا۔

”اس رات آپ کے ساتھ چوری کا واقعہ ہوا تھا اور آپ پولیس اسٹیشن گئے تھے۔ کیا ایسا کچھ یاد ہے آپ کو؟“

نیچے اپنی نشستوں پہ بیٹھے افراد بے زار ہو کے ایک قانون ساز کی تقریر سن رہے تھے۔ ایسے میں وان فاح جو فیک لگائے، کال تلے انگلی جمائے بیٹھا تھا، فون کی تھر تھراہٹ یہ چونکا۔ حالم اس کے ان چند کاٹیکلس میں تھا جن کے لیے اس نے الگ رنگ ٹون لگا رکھی تھی۔ وہاں موبائل کا استعمال پر ڈنو کول کے خلاف تھا مگر وہ پروا نہیں کیا کرتا تھا۔ اطمینان سے فون نکالا اور اسکرین کو چھوا۔ پھر جواب لکھنے لگا۔

”ہاں۔ جب میں صبح اٹھا تو میرے دوست کشنر نے مجھے رات میرے بیان کی ویڈیو بھیجی تھی۔“

”آپ نے مجھے ویڈیو کے بارے میں پہلے

کیوں نہیں بتایا؟“

”کیونکہ گفتیش تمہارا کام تھا، میرا نہیں۔“ وہاں بے نیازی کا وہی عالم تھا۔

”اوکے“ مجھے ویڈیو بھیجیں۔ مجھے وہ دیکھنی ہے، ابھی.....“ وہ مانتے پہ تل لیے ناپ کر رہی تھی۔

تو وان فاح اس رات فوراً سویا نہیں تھا بلکہ وہ کچھ کرتا رہا تھا مگر کیا؟

فاح نے اس کے بتائے ای میل ایڈریس پہ کشنر کی ای میل بھیج دی۔

تالیہ نے چینڈ زفری کانوں سے لگائے اور کیلری سے باہر نکل آئی۔ باہر ایک خاموش راہ واری میں کھڑے اس نے وہ ویڈیو دیکھی۔

یوں لگتا تھا وہ ویڈیو اس نے خود کو کئی چٹوں سے مطمئن کرنے کے لیے بنوائی تھی تاکہ جب وہ صبح اٹھے تو اسے رات کے واقعات پہ شک نہ ہو۔

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے شک پڑ گیا تھا اور اس نے حالم کو ہانڈ کر لیا تھا۔

البتہ ایک خیال تالیہ کا دل برا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے اتنی محنت سے ویڈیو بنوائی تاکہ جب فاح صبح جاگے اسے بھولے سے بھی ماضی کی کرید نہ ہو۔ وہ تالیہ کو اپنے لاشعور سے بھی نکال پھینکنا چاہتا تھا۔ واہ فاح صاحب..... واہ..... اس نے بہت سے آنسو اندر اتارے اور کانوں سے چینڈ زفری صفحہ ڈالا۔

سامنے لفٹ کے دروازے کھلے اور فاح، عثمان کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔ ایک تھکا دینے والے طویل سیشن کے بعد وہ یقیناً تھک چکا تھا۔

”آپ کا انرجی باز سڑا“ ایک انرجی بارا انی سیاہ زنبیل سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ فاح نے بار تھا، اس کو الٹ پلٹ کے دیکھا، پھر ایک خاموش نظر تالیہ پہ ڈالی اور بولا۔

”مجھے انرجی کی ضرورت نہیں ہے، میں بالکل فریش ہوں۔“ بے زاری سے کونے میں رکھے ڈسٹ بن میں بار اچھال دیا اور راہداری کا موڑ مڑ



کیا۔

تالیہ کے گال دیکھنے لگے۔ اندر موجود شہزادی نے کہا کہ لعنت بھیجو اس نوکری پہ اور ابھی اسے معافی اسے معذور آدمی کے منہ پہ دے مارو.... مگر پھر اس نے کڑوے گھونٹ بھر دیے۔

اگر اس کے ہاتھ لگانے سے ہر چیز فاتح کے لیے زہریلی ہو جاتی تھی تو راپا چینی کی بیٹی کی طرح اس سیاست دان کو بھی اس زہر سے Immune ہونا پڑے گا۔ اس نے زور سے ہنسنے لگا اور اس کے پیچھے ہولی۔

☆☆☆

اس صبح ابھی آفس میں معمولات کا آغاز ہی ہوا تھا کہ لفٹ کے دروازے کھلے اور عمرہ جیت محمود اترتی دکھائی دی۔ راہ داریوں میں فائلیں اٹھائے آتے جاتے لوگوں نے مڑ مڑ کے اسے دیکھا مگر وہ ساٹ تاثرات چہرے پہ سجائے سیدھ میں آگے بڑھتی گئی۔ اسکرٹ کے اوپر کوٹ پہنے سر کو اسٹول سے ڈھانے اسٹول کا ایک سر اسانے اور دوسرے کو پیچھے ڈالے وہ ہمیشہ کی طرح مغرور اور طرح دار دکھائی دیتی تھی۔ راستے میں مٹھان نے اسے دیکھا تو فوراً سامنے آیا۔

”سز عمرہ.... خوش آمدید۔ فاتح صاحب کانفرنس روم میں ایک دوست کے ساتھ ہیں اور....“  
”میں اس سے ملنے نہیں آئی۔“ بے رخی سے کہہ کے آگے بڑھ گئی۔ مٹھان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اشعر اپنے بی این کے چھوٹے سے آفس میں موجود تھا اور میز کے پیچھے کھڑے کھڑے کاغذات پہ سائن کر رہا تھا، گویا بیٹھنے کا وقت بھی نہ ہو، جب دروازہ کھلا اور عمرہ اندر داخل ہوئی۔

اشعر نے محض نظر اٹھا کے دیکھا پھر دوبارہ کاغذوں کی طرف جھک گیا۔ جڑے کی رگیں البتہ بچھنی گئی تھیں۔

”رہی نے کہا کہ تم آج اس آفس میں ملو گے۔“

شکر ہے یہاں مل گئے ورنہ تم سے ملاقات کے لیے تو لگتا ہے اب وقت لینا پڑے گا۔“

”مبالغہ آرائی سے کام مت لو کا کا۔ کوئی کام ہے تو بتاؤ۔“ وہ خشک انداز میں کہتے ہوئے جھک کے کھانا کھٹ دستخط کر رہا تھا۔ عمرہ نے زور سے پرس میز پہ رکھا، کرسی چینی اور بیٹھی۔ پھر چبھتی ہوئی نظریں اشعر پہ جمادیں۔

”تم نے معلوم کیا کہ گھائل غزال کا خریدار کون تھا اور اسے کس نے بھیجا تھا؟“

”کا کا! تم کیوں بھول جاتی ہو کہ میرے پاس ایکشن کے علاوہ کسی چیز کا وقت نہیں ہے۔“

”اور تم کیوں بھول جاتے ہو کہ کسی نے تمہاری بہن کی گیلری میں ایک جعلی عرب شہزادے کو بھیجا تھا۔“

”وہ گیلری جو تم نے میرا حق مار کے لی تھی؟“  
اشعر نے جھکے جھکے آنکھیں اٹھا کے کاٹ دار انداز میں اسے دیکھا تو وہ کچھ بول نہ سکی۔ پھر اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ آگے کو جھکی اور غرائی۔  
”مجھے اس وقت اس گیلری کی ضرورت تھی۔ تم اپنی بہن کے لیے اتنا پرانا بغض سنبھال کے بیٹھے ہو؟“

”اور مجھے اس وقت تمہاری غیر مشروط سپورٹ چاہیے گا کا“ لیکن تم اپنے شوہر کو روک نہیں سکتی۔“  
اس نے زور سے فائل بند کی اور سیدھا ہوا۔ چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

”اف ایٹس... وہ برسوں سے اس کرسی کی تیاری کر رہا ہے۔ میری امید تو دکانیں چلنے اور ضمیر ڈوبنے سے ختم ہو گئی مگر وہ تو ابھی تک وہیں ہے۔ کسی آدمی کے خواب اس سے چوری کیسے کیے جاتے ہیں تم مجھے سکھا دیتے تو وہ بھی کر لیتی۔ اس سے زیادہ کیا کروں میں تمہارے لیے؟“

”میرے لیے؟ مائی فٹ۔“ وہ غرایا۔ ”میرے لیے کچھ نہیں کیا تم نے، کا کا۔ سب کچھ اپنے لیے کیا ہے۔ اپنے خاندان کو ایکشن کی آلودگی سے دور رکھنے“



کے لیے اپنے دینی سکون کے لیے۔“

”ہاں کیا ہے میں نے سب اپنے لیے تو پھر تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ جب سے اس نے ایکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہے تم نے مجھ سے اپنا رویہ کیوں بدل لیا ہے؟“ اس کی آنکھیں بجھنے لگیں۔

”میں بیک وقت کئی محاذوں پہ لڑ رہی ہوں“ ایٹس۔ میں تمہاری دینی بہن ہوں جس نے اتنے سال تمہارا خیال رکھا ہے۔“

”مگر میں تمہارا وہ بھائی نہیں رہا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اسے روک لوگی۔ میں نے اتنے ماہ تمہارے وعدے کے بھروسے پہ تیاری کی اور اب تم کہہ رہی ہو کہ تم بے بس ہو۔“

”میرے بس میں ہے بھی کیا؟“ وہ بھینکتی آنکھوں کے ساتھ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اشعر چند لمحے کھڑا اسے چھپتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ”تم آج سے کہو اگر اس نے ایکشن لڑا تو اسے تمہیں طلاق دینی ہوگی۔ اسے تمہیں اور چیز میں شپ میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا۔“

عصرہ چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر ٹشو پیپر کے باکس سے ایک ٹشو کھینچا، اسے موڑ کے نوک بنائی۔ آنکھوں کے کنارے اس کی نوک سے صاف کیے اور کھڑی ہوئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور چبا چبا کے کہنے لگی۔

”ابھی میں اتنی بے وقوف نہیں ہوئی کہ تمہاری ہر بات کی اندھی تقلید کرنا شروع کر دوں۔ اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ اور مجھے اس پینٹنگ کا خریدار ڈھونڈ کے دو۔ دودن میں رزلٹ میری نیبل پہ ہونا چاہیے اشعر محمود اور نہ یاد رکھنا، اگر میں بابا کی جائیداد میں سے اپنے حصے کے لیے کورٹ گئی تو چند ہفتوں میں ہوا ہوا ہو جائے گا اور تمہاری سب سے قیمتی ملکیت..... بابا کا قلعہ..... ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور تم اس دن کو یاد کر کے پچھتاؤ گے کہ کاش تم نے دودن میں مجھے رزلٹ دے دیا ہوتا۔ مت بھولنا کہ تمہاری بیوی بہن ہوں۔ تم سے پہلے دنیا میں آئی

تھی تم سے زیادہ چال بازی آتی ہے مجھے۔“ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتی مڑی اور تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ اشعر جواباً کچھ نہ بولا، بس چپ چاپ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر زور سے فائل پرے اٹھا کے دے ماری۔

عصرہ باہر آ کے سیدھی ریٹ روم کی طرف آ گئی۔ وہاں ایک ہال میں لمبا سا شیشہ لگا تھا جس کے سامنے قطار میں سنگ بنے تھے۔ وہ ایک سنگ کے سامنے کھڑی ہوئی اور تلے ہاتھوں کا پیالہ رکھا۔ پانی ہتھیلیوں میں بھرنے لگا تو اس نے منہ پہ چھینٹا مارا۔

”کیا آپ خوش ہیں مسز عصرہ؟“ منہ پہ پانی پڑنے کی وجہ سے بصارت دھندلی ہو گئی تھی۔ چونک کے چہرہ اٹھایا تو دھندلا گیا سا منظر نظر آیا۔

تالیہ اس کے قریب سنگ سے ٹپک لگائے سینے پہ بازو لیے کھڑی تھی۔

”سوری؟“ عصرہ نے پیپر ٹاول سے چہرہ تھپتھپایا اور دوبارہ دیکھا تو منظر واضح ہوا۔ وہ سر پہ ترجمی سفید ہیٹ جمائے آج نیلا پھول دار فراک پہنے ہوئے تھی اور آنکھوں میں ڈیروں سادگی لیے عصرہ کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ خوش ہیں مسز عصرہ؟ اور مطمئن بھی؟“ باہر سے آتا فاح اس آواز پہ دروازے کے دوسری طرف رک گیا۔ عثمان نے سرگوشی کی تھی کہ جذباتی انداز میں اس نے عصرہ کو اشعر کے آنس سے نکلتے دیکھا ہے تو فوراً اس طرف آیا تھا۔ مگر چونکہ یہ لیڈیز ریٹ روم تھا اسے باہر ہی رکنا پڑا۔

”خوش؟ مطمئن؟“ عصرہ آئینے میں خود کو دیکھتے ٹشو سے آنکھ کے کنارے پوچھنے لگی۔

”آپ نے اس روز مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ میرے سیاسی عزائم بھی ہیں۔ ایک زمانے میں میرے سیاسی عزائم نہیں تھے۔ میں اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن تھی گو کہ میری زندگی



قابل رشک نہیں تھی۔ ”وہ اطمینان سے ٹیک لگائے کھڑی کہہ رہی تھی۔ عصرہ خاموشی سے اپنا میک اپ صاف کرتی رہی۔ وہ آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اس کا تالیہ سے کوئی بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

”مگر پھر میں نے اپنے بابا کو دیکھا۔ وہ بہت دانا سیاست دان تھے۔ ایک دنیا پہ حکمرانی کرتے تھے مگر وہ خوش اور مطمئن نہ تھے۔ ان کے اندر بہت آگ تھی۔ ہوس، عزم، طاقت کی خواہش اور پھر میں نے جانا کہ خوش اور مطمئن لوگ دنیا پہ حکمرانی نہیں کر سکتے۔ کسی ملک کو صرف وہی چلا سکتا ہے جو نہ اپنی زندگی سے خوش ہو نہ اپنے معاشرے سے مطمئن۔ جس کے پاس ٹوٹا ہوا دل ہو وہی اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کے ارادے سے لگتا ہے اور ان کے دلوں پہ حکمرانی کرنے لگتا ہے۔“

وہ بولے جا رہی تھی اور عصرہ اپنے عکس کو دیکھتی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

”مگر جب کسی کی مشکلیں دور ہو جائیں اور اسے بے پناہ خوشیاں مل جائیں تو وہ نیز اس شخص کو Productive نہیں رہنے دیتا۔ آسانیاں اور راحتیں انسان کو نکماتا ہیں۔ بڑے مقاصد کے لیے جینے والے.... بڑی بڑی تحریکیں چلانے والے...“

ان سب کے دلوں کا ٹوٹا ہوا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ وہ دوسروں کا غم سمجھ سکیں۔ میں اب خوش نہیں ہوں۔ دکھی ہوں۔ مطمئن بھی نہیں ہوں۔ محرومی کا شکار ہوں۔ پانے کے بعد چھین لیے جانے کی محرومی۔ اس لیے اب میں اس تحریک کا حصہ بننا چاہتی ہوں۔ اس آفس میں کام کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میں بالکل بھی خوش نہیں ہوں۔ کیا آپ ہیں؟“

کمرے میں لگے ڈھیروں آئینے ہر کونے میں ان دونوں کا عکس دکھا رہے تھے۔ ہیٹ والی لڑکی سنک سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور عصرہ ابھی تک آئینے میں دیکھتی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤں کی ڈبی بند کی اور تالیہ کی طرف کھوی۔

”اس سیاست نے مجھ سے میری بیٹی بچھین لی۔ مجھے خوشی اور اطمینان کا اب کچھ بھی کیا ہے۔“

زہر خند لہجے میں بولی اور مڑ گئی۔

باہر کھڑا ان قیام آہستہ سے پلٹ گیا۔ مصر کو اس کی ضرورت نہیں تھی وہ جان گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کام سے اس کے آفس میں آئی تو دیکھا وہ لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کر رہا ہے اور اس کی کافی ٹینڈی ہو رہی ہے۔

قائم نے آج بھی اس کی لائی کافی کو چھو نہیں تھا۔ اس کے دل کو دھکا سا لگا مگر ضبط سے سپاٹ چہرے کے ساتھ اندر آئی اور فلیٹ کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ اسے وہاں رکھی قائم کی ترتیب دینی تھی۔

”تمہیں کیوں لگتا ہے کہ خوش اور مطمئن لوگ اچھے حکمران نہیں بن سکتے۔“

ہیٹ والی لڑکی آواز پہ چونک کے مڑی۔ وہ ٹائپ کرتے ہوئے عینک لگائے اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔

(تو اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ کیا کھرا آدمی تھا۔ دو منٹ بھی نہیں چھپا سکا اس بات کو۔) ”کیا مجھے غلط لگتا ہے سر؟“

”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اتنی معقول بات تمہارے ذہن میں کیسے آئی؟“ وہ اس کو آواز عقل مند نہیں سمجھتا تھا یہ تو طے تھا مگر انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ وہ مسکرا دی۔

”مجھے کسی نے کہا تھا ایک مرتبہ کہ خوش اور مطمئن لوگ حکومت نہیں چلا سکتے اور میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ اب مانتی ہوں۔“

”کس نے کہا تھا؟“ وہ مصروف سے انداز میں بدستور ٹائپ کرتے پوچھ رہا تھا۔

”تھا کوئی خود غرض انسان۔“ وہ مہری سانس لے کر پلٹ گئی اور ڈسٹر اٹھالیا۔

”تم خوش اور مطمئن کیوں نہیں ہو اپنی زندگی سے؟ ہر چیز تو ہے تمہارے پاس۔“ خود غرض انسان



ایسے جیسے جھیل کے پانی پہ ستھری کرفوں نے  
سوںے کا خول چہ حار کھا ہو۔ اور اس دیکھتے پچھلے  
سوںے کے اندر ایک منظر انجرا نجر کے مخدم بوربا  
تھا۔

سنہرا چمکتا تاج اس کے سر پہ تھا اور تاج  
کے پیچھے سے نکلتا سرخ رنگی کپڑا اس کی کمر تک گرا  
تھا۔ پاؤں کو چھوتا کام دار سرخ لباس بنے، وہ قد نیم  
ملا کہ کی اس سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ کئی پہ  
خالی نوکری لٹکی تھی۔

یہ سن باؤ کی حویلی کے سامنے بنی سڑک تھی جس  
کے دوسری جانب درختوں سے مزین ہزار تھا۔  
وہاں جگہ جگہ جنگلی اور دیسی پھول گئے تھے۔ تالیہ ایک  
بودے کے سامنے رکی اور جھک کے پھول توڑنے  
لگی۔ دفعتاً درختوں میں ہلچل ہوئی۔ اس نے جھکے  
جھکے گردن اٹھائی، پھر مسکراتی ہوئی سیدھی ہوئی۔

”آپ آج جانا نہیں گئے تو انکو؟“  
وہ سامنے سے گھوڑے کی باگ تھاے چلا آ رہا  
تھا۔ جواب دینے کے بجائے پہلے مسکرا کے سر کو  
خصوص انداز میں جنبش دی۔

”شہزادی‘ سلام۔“ پھر قریب چلا آیا۔ سفید  
کرتے یا جامے میں‘ ماتھے پہ بال بکھیرے‘ قدم  
اٹھانا غلام شہزادی کو وہاں دیکھ کے جیسے مفلوظ ہوا تھا۔  
”آپ نے آج مجسمہ بنانے کا کام نہیں کیا  
شہزادی؟“

”ایڈم اندر ہے اور کام کر رہا ہے۔ میں باہر  
پھول توڑنے آئی تھی۔“

وہ اس کے قریب آچکا تھا۔ دونوں اب آسنے  
سامنے سڑک کنارے درختوں تلے کھڑے تھے۔  
فانچ نے گھوڑے کی ہاگ اب تک تمام رکھی تھی۔  
نظریں جھکا کے پھولوں کی نوکری کو دیکھا اور مسکرایا۔  
”اور تمہیں لگتا ہے کہ میں آسانی سے یقین کر  
لوں گا کہ تم یہاں صرف پھول چٹنے آئی ہو۔“

(باقی آئندہ ماہ)

نے سوال کیا۔  
”ہر چیز ہونے سے کوئی خوش ہو سکتا ہوتا تو  
شہزادیاں سب سے زیادہ خوش ہوتیں سر۔“  
”تم ہاشکری ہو لڑکی!“ وہ گہری سانس لے کر

کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ چپ چاپ فولڈرز صاف کر  
کے صلیف کے اندر رکھتی گئی۔ یکدم چھناکے کی آواز آئی  
تو وہ کرنٹ کھا کے پٹئی۔ فانچ بے دھیانی میں کرسی پہ مڑا  
تو ہاتھ کافی کے مگ کو لگا۔ مگ میز پہ اوندھا ہو گیا جسے  
اس نے تیزی سے تمام لیا۔ مگ فچ گیا مگر کافی میز پہ  
گر گئی۔

”اس کو یہاں سے ہٹا لیتا تھا‘ ناشہ!“ وہ  
قدرے کوفت سے بولا۔ کافی ہاتھ کی پشت پہ بھی  
گری تھی مگر صد شکر کہ اب تک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔  
تالیہ تیزی سے وہاں آئی اور جلدی سے ٹشو باکس سے  
ٹشو کھینچ کر نکالے۔ فنانچ میز صاف کی۔ دونشوز سے  
فرش پہ گرے مانع کو ڈھانپا۔ پھر فانچ کو دیکھا جو ہاتھ  
کی کیلی پشت کو بے زاری سے دیکھ رہا تھا۔ باکس دور  
تھا اور وہ ٹشو نہیں نکال سکتا تھا۔ تالیہ نے باکس کے  
بجائے اپنا بیگ اٹھایا جو صلیف پہ رکھا تھا اور اندر سے  
ٹیلے واپس کا پیکٹ نکالا۔ موچے کی خوشبو والے  
واپس دان فانچ کے پسندیدہ تھے۔ اس نے پیکٹ  
کھولا تو ایک دم سارے میں موچے کی خوشبو پھیلنے  
لگی۔ اس نے ادب سے پیکٹ سامنے کیا۔

”جاؤ‘ ناشہ! میں خود کر لوں گا۔“ سرد مہری سے  
واپس کو جھٹکا اور آگے بڑھ کے ڈبے سے سوکھے ٹشو  
کھینچے۔ پھر انہی سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

تالیہ کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ موچے میں  
جیسے ایک دم کافور کی بو بھل گئی۔

وہ چپ چاپ کام سمیٹ کے باہر نکل گئی۔ نہ  
کوئی سخت جواب دیا، نہ لمحے کا اظہار کیا۔ اسے دکھ ہوا  
تھا۔

باہر کرسی پہ بیٹھے اس نے ہتھیلیوں پہ چہرہ گرا دیا  
اور درخشے کی دیواروں سے بنے کیمین کو دیکھنے لگی۔  
ان کے شیشوں پہ مختلف رنگوں کی روشنی پھری تھی۔



جب بھی آتا ہے وہ میرے دھیان میں  
پھول رکھ جاتا ہے روشن دان میں

گھر کے بام و در سے لگنے لگے  
حسن ایسا تھا مرے مہمان میں

عکس تیرے، تیری خوشبو، تیرے رنگ  
بس یہی کچھ ہے مرے سامان میں

تتلیاں کمرے کے اندر آگئیں  
ایک پھول ایسا بھی تھا گل دان میں

جب درخت انگنائیوں کے کٹ گئے  
دھوپ اتر آئی ہے ہر دالان میں

تیرا چہرہ آئینے کے سامنے  
اور آئینہ تھے امکان میں

ہاڈب قریشی

رعونوں میں نہ اتنی بھی انتہا ہو جائے  
کہ آدمی نہ رہے آدمی، خدا ہو جائے

اسی کے پاس ہو سب اختیار بولنے کا  
اور اس کے سامنے ہر شخص بے صدا ہو جائے

گہرے ہوئے ہیں عجب عہد بے یقینی میں  
خبر نہیں کہ کہاں، کس کے ساتھ کیا ہو جائے

تعلقات میں گنہائیں تو ہوتی ہیں  
ذرا سی بات پہ کیا آدمی خفا ہو جائے

ہم اہل حرف بڑے صاحب کرامت ہیں  
ہمارے ہاتھ میں پتھر بھی آئینہ ہو جائے

کہیں تو منزل صبح یقین ملے عارف  
کہیں تو ختم گمانوں کا سلسلہ ہو جائے  
سید عارف





تیسری صدا غزل سرا سماعیں سجا گئی  
دیارِ دل بسا گئی، محبتیں سجا گئی  
بچھڑ گیا کبھی سکوں، شکست کھا گیا جنوں  
تیری وفا غزالِ شب، چراغِ رہ جلا گئی

خاک زادے کا عشق،

رہ و فانیں جا بجا، رکاوٹیں ہزار ہا  
امامِ دل تری دُعا، رکاوٹیں ہٹا گئی

خیال سی بے مثال لڑکی  
آپ ہی وہ اپنی مثال لڑکی

رکا ہوا خیال تھا، جمود تھا ملال تھا  
تری زباں کی چاشنی، بیاں تیا بنا گئی

اُن دیکھا سا، انجانا سا احساس اس کا  
پاکیزگی کا پیرا بن لباس اس کا

سخن شناس تھی نظر لکھا تھا جو مٹا دیا  
تری کتابِ حیاں تھی جو دل مرا لہجا گئی

سوہنی کا حُسن ماندا اس کے سامنے  
شیریں کا کوہ کن غلام اس کے سامنے  
تمکنت اس کی بیاں کیسے ہو

وصالِ شب کی داستاں، عجب کمالِ فنِ بنی  
تیرے لبوں کی تازگی، مصوری سکھا گئی

عشقِ حُسن کا مہماں کیسے ہو  
میں ارضی، میں فانی، میں خاکِ زادہ  
کیسے کر دں اس سے چاہت کا ارادہ

ذبیحہ فیصل عباسی

جولہ مقصود



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
"میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ لہذا جب تمہیں اختلاف نظر آئے تو بڑی جماعت کا ساتھ دو" (ابن ماجہ)

### اسلامی مساوات،

حضرت عمرؓ نے علاقہ میں بیت المقدس کی فتح کے بعد فوجی افسروں اور عمال کے ساتھ کئی دن تک قیام کیا۔ ایک دن حضرت بلالؓ نے دیکھا کہ فوجی افسر پرند کا گوشت اور میدے کی روٹیاں کھاتے ہیں مگر عام سپاہیوں کو معویٰ کھانا نصیب ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔

حضرت عمرؓ نے افسروں سے اس سلسلے میں جواب طلب کیا۔ افسروں نے بتایا۔  
"امیر المومنین! جتنی لاگت میں عمارتیں بنائی گئیں ہیں۔ اتنی ہی لاگت میں یہاں پرندوں کا گوشت اور میدے کی روٹیاں مل جاتی ہیں۔"  
اس معقول جواب پر حضرت عمرؓ نے زیادہ گفت و شنید مناسب نہیں سمجھی لیکن یہ حکم دے دیا کہ ہر سپاہی کو تین سو روپے اور مالِ کفایت کے علاوہ کھانا بھی ملنا چاہیے۔

نور آمنہ فدائی

### دنیا سنور جاتے گی،

مجھے وہ بات یاد آ رہی ہے جو شاید میں نے ٹی وی پر سنی ہے کہ ایک اخبار کے مالک نے اپنے اخبار کی اس کاپی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جس میں

دنیا کا نقشہ تھا۔ اس نقشے کو تیس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے پانچ سال کے کس بچے کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا کہ "لو مجھے یہ دنیا کا نقشہ ہے جو ٹکڑوں میں ہے اسے جوڑ کر دکھاؤ۔"

اب وہ بچہ چارہ تمام ٹکڑے کر پریشان ہو کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اب سارے ٹکڑوں کے بارے میں کہ کون کہاں پر ہے، میرے جیسا بڑی عمر کا آدمی بھی نہیں جانتا ہے۔ وہ کافی دیر تک پریشان بیٹھا رہا لیکن کچھ دیر بعد اس نے تمام کا تمام نقشہ درست انداز میں جوڑ کر اپنے باپ کو دے دیا۔  
اس کا باپ بڑا حیران ہوا اور کہا۔ "بھٹا! مجھے اس کا آواز بتاؤ، کیونکہ اگر مجھے اس کو جوڑنا پڑتا تو میں نہیں جوڑ سکتا تھا۔"

اس پر اس کے بیٹے نے جواب دیا۔ "بابا جان! میں نے دنیا کا نقشہ نہیں جوڑا بلکہ نقشے کے دوسری طرف سیٹھی جلد کا ایک اشتہار تھا اور اس میں ایک شخص کا بڑا سا چہرہ تھا جو شیوٹر تادکھا یا گیا تھا۔ میں نے سارے ٹکڑوں کو اس کا اس آدمی کو جوڑنا شروع کیا اور چار منٹ کی مدت میں میں نے پورا آدمی جوڑ دیا۔"

اس آدمی نے کہا۔ "بابا! اگر آدمی جوڑ جائے تو ساری دنیا جوڑ جائے گی۔"

(زاوہ 2 - اشفاق احمد)

### بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

ٹیکلی کا بدلہ ٹیکلی کے سوا کچھ نہیں۔

(لقمان حکیم)

مہمان کے آگے کم کھانا پیش کرنا بے مردانہ ہے  
افسوس سے زیادہ ہیش کرنا تکبر ہے۔







## گھبراہٹ،

ایک لڑکی ایک میڈیکل اسٹور کے باہر کھڑی اسٹور میں رش کم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرم کے ساتھ بے چینی اور تذبذب کے جذبات صاف جھلک رہے تھے۔ آخر کافی دیر بعد جب میڈیکل اسٹور سے رش ختم ہو گیا تو وہ گھبراہٹ خراقاتی اندر داخل ہوئی اور اپنے کاپتے ہاتھوں سے اپنے برس سے ایک پرچی نکال کر مٹانے لگی اور فرماتے ہوئے بولی،

”میں ایک اسکول بچہ ہوں۔ میری ایک ڈاکٹر سے شادی طے ہوئی ہے۔ آج ان کا پہلا خط آیا ہے۔ کیا آپ بڑھ کر سنا دیں گے کہ کیا لکھا ہے؟“

## موتی مالا،

کسی کے غلوس اور پیار کو اس کی بے وقوفی مدت سمجھو ورنہ کسی دن تم غلوس اور پیار تلاش کر دو گے اور لوگ تمہیں بے وقوف سمجھیں گے۔

”اچھے لوگوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ انہیں یاد رکھنا نہیں پڑتا یا وہ خود یاد رہ جاتے ہیں۔“

جس نے کسی کو اکیلے میں نصیحت کی اس نے اُسے سوار دیا اور جس نے کسی کو سب کے ملنے نصیحت کی اس نے اُسے یگاڑ دیا۔

ماشہ جہانگیر مرالی۔ گھبراہٹ

## شکر پارے،

ایک دفعہ ایک چوراہے پر ایک عریض آدمی کے گھر جا کھڑا۔ عریض آدمی نے جب اسے دیکھا تو زور زور سے ہنسا شروع کر دیا۔ جب چوہ نے اس کی وجہ پوچھی تو عریض آدمی نے جواب دیا۔

”مجھے یہاں دن کے وقت کوئی چیز نہیں ملی۔ تم رات کے وقت کیا نکال لو گے؟“

ایک عورت گاڑی بہت تیز چلا رہی تھی، ایا نامک اس نے چوک میں کھڑے ٹریفک وارڈن

کو ٹکڑے مار دی۔ وہ سڑک پر گر کر رہنے لگا۔ عورت کا ریسے باہر نکلی اور اسے ڈانٹ کر بولی۔

”اب مڑ آیا سڑک کے درمیان کھڑے ہونے لگا۔“

ایکشن کے دو امیدوار لیڈرزوں کا ایک تنگ گلی میں آمناسامنا ہو گیا۔

پہلا بولا۔ ”میں گدھوں کو راستہ نہیں دیتا۔“

دوسرا بولا۔ ”لیکن میں دے دیتا ہوں؟“ وہ ایک طرف ہو گیا۔

ایک عورت بازار سے خریداری کر کے واپس آئی اور اپنے شوہر کو حیرت سے دکھاتے ہوئے بولی۔

”یہ کپڑا میں آپ کے رومال کے لیے لائی ہوں۔“

شوہر حیرت سے بولا۔ ”اتنا بڑا کپڑا؟“

عورت بولی۔ ”باقی جو کپڑا بیچ جائے گا اس کی میں سارے بنائوں گی؟“

نورے محمد۔ بوسے دالا

## لفظ بولتے ہیں،

”معاف کر لے گا لکھ کر جائے تو زمانوں کو تلافی میں پانی ہوتا پڑتا ہے۔“

”دلوں کے ٹوٹنے کی داستان کون رقم کرے کیونکہ روشنی اور تاریکی میں یکساں منظم وقت تمام شبوں کی سیاہی ابلے لکھ کر کے بھی دلوں کے بھید نہیں تحریر کر سکتا۔“

”بے پناہ مزاحمت بے سمت نہیں ہوتی دیتی بلکہ بے تحاشا تخلیق کا باعث بنتی ہے۔“

”غنت اثر دکھتی ہے۔ وہ کتنی ہی خاموش ساعتوں میں ہو۔ دل کے اندر کتنے ہی پردوں میں چھپی رہے لیکن اس کا انعکاس ہو جاتا ہے۔ یہ برقی روشنی طرح دوسرے دل کو چھوئی ہے۔“

نوریز ٹمرہٹ۔ جرات

۱۱۱



# میری لکھی

مناہرہ  
ہر دین مابریں  
وہ خوش کلام ایسا کہ اس کے پاس ہمیں  
طویل رہنا بھی لگتا ہے غمگر رہنا  
نادیسیل  
ہری پور

بیون زہر بھرا ساگر  
کب تک امرت گھولیں گے  
نہند تو کیا آئے گی نرا  
موت آئی تو سولیں گے

رفت سجاد  
سیالکوٹ  
عشق اتنا بھی کیا ضروری ہے  
کوئی بے عشق مر نہیں جاتا  
انگلیاں پھیر میرے بالوں میں  
یہ میرا درد سر نہیں جاتا

سرت بشر  
کراچی  
آج دل ڈرتے سے ڈرتا ہے  
دیکھ ادبیا میں کتنا پانی ہے  
ہم نے خود مسکرا کے دکھائے  
مسکراہٹ بھی نوحہ خواتی ہے

علیٹا مابریں  
کراچی  
دل ہی تو ہے نہ تنگ و نہشت درد سے بھر کر کے  
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں  
ہاں وہ نہیں وفا پرست! جاؤ کہ بے وفا سہی  
جس کو ہودین و دل عزیز ای کی گلی میں جلیے کیوں

انعم محمود  
کراچی  
ہمیں ہماری حساس طبیعت نے مار ڈالا  
درد نہ پھر دل ہو کے تو سب کچھ سہہ جلتے

نرہ اتر  
کراچی  
جودل پر نقش ہونا تھا، اسے لکھتے ہیں کاغذ پر  
کہاں تحریر کرنا تھا، کہاں تحریر کرتے ہیں  
شب حنیف  
لاہور

جیران ہوں مارے شہر کا کردار دیکھ کر  
سب ٹھک گئے، اٹھاں کا درد یاد دیکھ کر  
رنگ اڑ گیا ہے مات کے چہرے کا کیوں علم  
سہا ہوا ہوں صبح کے آثار دیکھ کر

دردیہ مرث  
بکرات  
بس اک فرد اسی بات حتیٰ لیکن تمام عمر  
وہ مجھ کو جاننے کی سزا دے کے سو گیا  
مدد سحر نورین مہک  
بکرات

لوگ کیوں بس کے اُجڑ جاتے ہیں، کبھی سوچا ہے  
کس لیے جان سے گزر جاتے ہیں کبھی سوچا ہے  
جو نظر آتے ہیں آئینہ سی پر شاگون ثنا  
وہ بھی سٹی میں اُتر جاتے ہیں کبھی سوچا ہے  
سامرہ، شازیرہ، مکنز  
دختر شیل میا نوال  
کہاں اس نے سٹی میری، سٹی بھی ان سٹی گردی  
اسے معلوم تھا اتنا، مجھے کچھ اور کہنا تھا

لدا آمنت دہانی  
لاہور  
میں آئینہ ہوں کہ عکس کوئی  
مجھے خود اپنی خیر نہیں ہے

نازہ بھٹی  
پتوکی  
عم غبار کسی کو بنائیں کیا، اس میں بھی خارا بنا ہے  
جو ساری عمر پھیلے ہیں، وہ مارا جاتے پڑتے ہیں  
ہانا فادق  
گوجرانوالہ

زندگی تم نہیں کہیں رہنا  
میں زمانہ بدل کر آتا ہوں



کھو ڈاڑھ سے

رضوانہ شکیل رائڈ

خزاں کی رُت میں گلاب لہجہ بنا کے رکھنا کمال یہ ہے  
ہوا کی زد پہ دیا جلانا جلانے کے رکھنا کمال یہ ہے

ذرا سی لغزش پہ توڑ دیتے ہیں سب تعلق زلزلے والے  
سوا ایسے دیسوں سے بھی تعلق بنائے رکھنا کمال یہ ہے

کسی کو دنیا یہ مشورہ کہ وہ دکھ بھرنے کا محمول جلائے  
اور ایسے لمحے میں اپنے آنسو چھپائے رکھنا کمال یہ ہے

خیال اپنا، مزاج اپنا، پسند اپنی، کمال کیا ہے!  
جو یار چاہے وہ حال اپنا بنائے رکھنا کمال یہ ہے

کسی کی رہ سے خدا کی خاطر اٹھائے کہنے، ہٹائے پھرتے  
پھر اس کے آگے نگاہ اپنی جبکا کے رکھنا کمال یہ ہے

ہزار طاقت ہو، سو دلیلیں ہوں پھر بھی لیے میں عاجزی سے  
اصب کی لذت دُعا کی خوشبو بھائے رکھنا کمال یہ ہے

کھو ڈاڑھ سے

حمدہ خان

تلاش ذات کا سفر آسان نہیں ہوتا کبھی کسی اس  
ناممکن کی جستجو میں بھٹکتے ہوئے انسان کی عمر تمام اوجھڑتی  
ہے۔ قاتل شغافی کی یہ عزت قادیان کی نندہ۔  
نہ مانے کتنی عمر کے گے اس نادانی میں  
اپنے عکس کو دھونڈ رہی ہوں کھولتے ہوئے پانی میں

ملتے ہر بار نمک سے بنے ہوئے بتاؤ  
اک جیسا انجام تھا میرا ہر طغیانی میں

ساتھ حفر کے پار اترنے آئے تھے کچھ لوگ  
وہ دریا میں دُوب گئے اور میں حیرانی میں

سب کچھ روشن ہے تجھ پر اے سوجھ توئی بتا  
دن کو خوشبو کیوں نہیں، ہوتی رات کی لانی میں

جس سے باہر جانے کی نہیں کوئی راہ قاتل  
یادوں کا وہ جنگل ہے دل کی ویرانی میں

غمرہ افسر  
کھو ڈاڑھ سے

کچھ فتنہ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ کچھ رنگ بہت  
پکے۔ کچھ زخم بھرنے میں بہت دیر لگتی ہے۔ دل ہے  
کہ ٹھہرتا ہی نہیں۔ ان ہی جذبول کا اظہار رسول اللہ شاہ  
اس غزل میں کر رہے ہیں۔

رنگ اترنے میں بہت دیر لگی  
دل ٹھہرنے میں بہت دیر لگی

تیری آنکھوں کی طرح گہرا تھا  
زخم بھرنے میں بہت دیر لگی

بات کرنا تھی ذرا سی تجھ سے  
بات کرنے میں بہت دیر لگی



# کرن

ماہنامہ

نومبر 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

”کرن کا دسترخوان“

اب ایک نئے انداز میں

- اداکار ”محمد علی جوش“ سے شاپن رشید کی ملاقات،
- اداکار ”سید فراز رسول“ کہتے ہیں میری بھی بیٹے،
- آواز کی دہائی ”اسد چوہدری“ اس ماہ مہمان ہیں،
- اس ماہ ”ماہدہ مختار“ کے ”مقابلہ ہے آئینہ“،
- ”شب غم کی عمر“ رخ چوہدری کا سلسلہ وار ناول،
- ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ نگہت مہدالطاف کا سلسلہ وار ناول،
- ”ساگر کنارے“ ام طہور کا مکمل ناول،
- ”جگ“ شبنم گل کا مکمل ناول،
- ”شام رنگ سیاہ“ اکیل رضا کا ناول،
- ”ماوراء“ راجہ انوار کا ناول،
- ”بچ بھلا رانی“ ارباب گل کا ناول،
- مصباح علی سید، رحمانہ آفتاب، فریدہ طرید، اور حائل سلیم کے ناول اور مستقل سلسلے،

کٹ گئی رات تیرے خوابوں میں  
دن گزرنے میں بہت دیر لگی

کب بیٹھا تھا کسی لے مجھ کو  
کب بکھرتے میں بہت دیر لگی

زندگی گزری ہے ہر بل میں میری  
سعد مرنے میں بہت دیر لگی

افغانی نامہ

آنکھوں سے خواب اور دل سے تمنا خفیت  
ہو جائے تو دل میں سناٹا رہتا ہے۔ ہر شے ایک  
رشتہ فانی لیے ہوئے ہے۔ جو وقت کے ساتھ  
تمام ہوئی جاتی ہے۔ جن عباس رضا کی غزل نذر ہے۔  
آنکھوں سے خواب، دل سے تمنا تمام شد  
تم کیا گئے کہ شوق نظارہ تمام شد

کل ترے تشنگان سے یہ کیا معجزہ ہوا  
دریا پہ ہونٹ رکھے تو دریا تمام شد

دنیا تو ایک برف کی سل سے سوا نہ تھی  
پہنچی ذرا جو آج تو دنیا تمام شد

عشق پر یہ اب کے عجب وقت آ پڑا  
مجنوں کے دل سے حسرت لیلیٰ تمام شد

شہر دل تباہ میں پہنچوں تو کچھ کھلے  
کیا بچ گیا ہے راکھ میں اند کیا تمام شد

ہم شہر ہاں میں آخری نغمہ سنا کے  
سجود کہ اب ہمارا تمنا شام تمام شد

کب یاد یار ہی تو پس انداز ہے من  
درد وہ کارِ عشق تو کب کا تمام شد





نانہ خاتون



بچہ بچوانے کے لیے بچا

خواتین ڈائجسٹ، 37- از دو بازار، کراچی۔

Email: info@khanawateen.com

شمینہ اکرم..... کراچی

میری غیر معاشری کی وجوہات میں سرفہرست میری کچھ سستی، کچھ خرابی طبیعت اور زیادہ تر کھیلو مصروفیت رہی۔ پچھلے باہ ہمارے گھر میں خوشیاں ڈیر اڈالے بیٹھی تھیں۔ میری ننھی پری غنوی اکرم کا رشتہ طے پا گیا ہے۔ رسم بھی ادا کر دی گئی ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھے لوگ ہیں اور پھر اپنے قریبی عزیز بھی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے شعاع اور خاتین کے شوخیاں اور پرانے قاری بھی..... دو ڈائجسٹ کے حوالے سے شمینہ اکرم کو بہت اچھی طرح جانتی تھیں مگر جب رویدہ دیکھا تو مل کر اتنا خوش ہوئیں کہ جیسے میں کوئی رائٹر ہوں۔ قاری نہیں.....

”ہمارے نام“ محبت بھرے خطوط، چاہت بھرے جواہرات..... ہر ماہ میری توجہ کا مرکز خاص۔ ”کرن کرن روشنی“ میں مستند احادیث مبارکہ سے استفادہ خاص کیا۔ 11 نومبر کو میرے شہید بیٹے معیز اکرم کی چھٹی برسی ہے۔

آپ تمام قارئین کرام اور ماہیاب میں سے مائے مہر کی درخواست ہے۔ اس ماہ کے انساؤں میں ملے گا۔ کالساؤں رشتوں کی چابی، پھر پھر ایک کیرامیہ کو دیاں ناول ”ام الجین“ ابھی یہ کہانی میں نے پڑھا تو دلی ہے۔ ”عالم“ تمام ہی قارئین وہ جوں کو بہت بہت یاد آرہا ہے۔ مگر مجھے تامل کا اپنے سے دلی ہر کے دلیان خاص کے عشق میں گرفتار ہونا کچھ خاص پہاڑیوں آ رہا ہے اس سے اچھا تو ایڈم ہے۔ نعلوں اور ہر فلاس۔ کچھ دلیان خاص کی کرن میں تو کلف لگا رہتا ہے آپ کا باور ہی نانا میں شریک کا بہت دل چاہتا ہے۔ مگر مصروفیات زندگی میں احمد کا سلسلہ وار ناول ”الف“ ان کے لڑکھ بانی ہمارے مہربانی شاعر اور اجواب ہے۔ یقیناً یہ ناول بھی دلیوں یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر شاہد علی زیدی سے ملاقات خوب رہی مگر اپنے اندر دلی میں آپ یہ ضرور بتا کر دیں کہ ان کا کھینک کہاں واقع ہے۔ ”بیمال زہرا“ جس کہانی کے ساتھ ساتھ روزنامہ کا نام چڑا ہوا، وہ لکھنے کا جسے اپنے بچپن ہونے کا پتا دیتی ہے۔ زہرا جیسی خوب صورت لڑکی کا نصیب عاشق جیسے کھنیا انسان کے ساتھ چڑ گیا۔ یہ سب نصیب نے عیال میں کہ شہنا ادبی باندی بن گئی۔ کراچی پارت اور ہے۔ زہرا کو اس طرح کسی لڑکے سے چپ کر نہیں مانا جانتے تھا۔ یہ غلط تھا۔ بہر حال ایک مدت کے بعد بڑی چارنی کہانی پڑھنے کو ملی۔ تب میں ایک اور بڑی خوشی جتنے کی۔ میرا دوسرا بیٹا اسود درہمان بھی عافتہ قرآن بن گیا ہے۔ (ماشاء اللہ) اس نے بہت چھوٹی ہی عمر میں اپنا حفظ مکمل کر لیا ہے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میری طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی۔ اسل اور شاہین رشید کو مبارک سلام۔

ن: بخاری شمینہ! اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ سب سے پہلے تو آپ کو غنوی کا رشتہ طے ہونے پر مبارک باد..... اللہ تعالیٰ اسے بخیر و خوبی تکمیل تک پہنچائے اور غنوی کو خوشیاں ملیں۔

یہ بہت بڑی سعادت ہے کہ آپ کے دوسرے بیٹے اسود درہمان نے بھی قرآن پاک حفظ کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آپ کا باور ہی خانہ میں ضرور شرکت کریں۔ اب تو آپ نے لگانے بھی لاکر رکھ لیے ہیں۔ تبصرہ کے ساتھ ساتھ باور ہی خانہ کے سلسلے



تبرہ تو آپ ہمیشہ ہی بہت عمدہ کرتی ہیں۔ کبھی کبھی تو آپ کا تبرہ پڑھ کر سوچتے ہیں کہ آپ نے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کیوں نہیں دی۔

ٹوبہ نور..... کشن گڑھ بھادل مگر

”جمال زہرہ“ لا جواب تحریر جیسا کہ سارہ رضا کا خاصا رہا ہے۔ کہ سارہ جی کے لفظوں کی جادوگری میں یوں الجھے کہ ارد گرد کا بھی ہوش نہیں رہا تاوقت یہ کہ آخری صفحہ آ پہنچا اور بے اختیار سینے سے گہری سانس برآمد ہوئی۔ معلوم ہوا آغاز سے انجام تک انداز نشست بھی تبدیل نہیں کیا۔ عام سے بھی عام موضوع لے کر اسے لا جواب بنا دینا آپ کا کمال ہے۔

”الف“ کی شروعات اچھی ہیں یقیناً ہر آنے والی قسط شان دار ہوگی۔ رویہ مکمل سے کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی۔ خوشی ہوتی ہے کہ کوئی تو بونگے پن میں ہمارے آس پاس ہے۔ سسکی، باز کا خط کافی منفرد لگا ان کے خیالات و اعتراضات سے قطع نظر الفاظ کا چناؤ چونکا مکیا انہیں لکھنے کی طرف متوجہ کریں۔ تکبیر رحمان والے ناول کی رائٹر تنزیلہ ریاض ہیں۔ واقعی میں ان کی باقی تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی لا جواب تھی۔ تنزیلہ حراج بھی تو بہت اچھا لکھتی تھیں پلیز ہو جائے صوفی وادارنگ میں ایک آدھ تحریر اور ہاں ایک فرمائش میری طرف سے بھی۔ پلیز تنزیلہ ریاض اور عزیز و سید کا ٹکڑا سائندریو کریں۔

بہت جانتے ہوئے چاہ ہم سے، مگر کردے غاہ ہم سے؟  
ذاملاؤ نگاہ ہم سے، ہمارے پہلو میں آ کے بیٹھو  
شاعری ہو یا کالم، الگ ہی جاشنی ہے انشائی کے کلام میں۔ لکھا تو اور بھی بہت کچھ جاسکتا تھا مگر کیا کیجیے کہ طبیعت نامسا ہے اور حراج نامسا تر، وہ تیرا شاعر کہ تیار بھی دیکھ رہی ہے۔

ن: پیاری ٹوبہ! ہر حساس انسان کا یہی حال ہے جو آپ کا ہے۔ دل گیر تو ہم بھی بہت ہیں، جن غریب لوگوں کے گھر سمار کیے گئے ان کی جی دیکھ، معصوم بچوں کا رونا، فخریوں کے سامنے سے یہ منظر ہٹا ہی نہیں۔ یہ ایکشن تو اس وقت ہونا چاہیے تھا جب ان مکانات کی پہلی اینٹ

رکھی گئی تھی اور پھر کچھ لوگوں کے ساتھ رعایت کیوں.....؟  
بہر حال یہ زندگی ہے یہاں بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔  
کوشش ہمارا کام اور نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بات صرف عمل اور نیت کی ہے۔ آپ کس کے ساتھ ہیں؟ اصل دار و مدار اسی بات پر ہے۔

تنزیلہ اور عزیزہ کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔

اقراء ممتاز..... سرگودھا

اس دفعہ خواتین میں پورے سال بعد لکھ رہی ہوں۔ مجھے تو کسی نے یاد بھی نہیں کیا (چلو کوئی گل نہیں) ہائل گرل بہت خوب صورت لگ رہی تھی شاہین رشید کا شکر یہ جنہوں نے آئمہ بیک کا انٹرویو لیا۔

سب سے پہلے عمیرہ احمد کا ناول پڑھا۔ فنکار سنگ امیزنگ۔ عمیرہ احمد جب بھی لکھتی ہیں، کچھ منفرد لکھتی ہیں۔ قلب مومن اسٹوری کی جان ہے۔ ”حالم“ نمرہ احمد کے کیا کہنے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ وان فاتح کو سب یاد ہے کہ تالیہ اس کی بیوی ہے۔

ام البتین سیر احمد کی اسٹوری بھی فنکار سنگ تھی۔ مگر دیسا نام پسند نہیں آیا۔ لیکن دیسا کی ایک بات پسند آئی کہ جب کسی کو سزا دی جائے تو پھر سنجیدہ رہا جائے ورنہ سزا ایک مذاق بن کر رہ جائے گی۔“

دل ہی تو ہے ایک اور بناء کریم کی لڑائی جھگڑے اور ان کی کھٹی مٹھی لو اسٹوری حزدے گئی۔

افسانے سارے ہی بیٹ تھے خاص کر کے ”دل عشق میں“ بازی لے گیا۔ ”مسٹر اسائل“ ایک اچھی اسٹوری تھی۔

ن: پیاری اقراء! ایسے نہ سوچیں کہ کسی نے یاد نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اظہار نہیں کیا۔ دراصل ہم کسی کا نام پرچے میں دے کر اسے یاد کریں تو اس میں بھول چوک کا امکان ہے۔ وہ قارئین جن کے نام نہیں دیا گیا۔ انہیں شکایت ہوگی۔ اس لیے ہم کسی قاری، بہن کا نام نہیں لکھتے۔

ایک سال کی غیر حاضری کے بعد آپ کی آمد پر خوشی ہوئی۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے









روز پر صبح ویا کھین ساجد مام ہائی کھپائی کو چہ الہ الہ  
چار ہا کمال دھڑلہ ایک ساتھ دل خوشی سے آیا  
ہو گیا۔ سب سے پہلے جمال زہرا جی۔ اب انکاظم کوئی  
انسان ہیسا کیسے ہو سکتا ہے۔ لاپائی کس فقر پر چار سے  
چو ترس ہی آتا۔ کرم اچھا تھا پرا۔ بھگتوں کی۔ مہدات  
فصل کا لدا۔ بھگتوں کو تو پہلے کرنا۔ ای۔ یہ ہے ہی انہیں  
سنوری۔ آخر میں چو واضح کر کے کہ آیا چو کی تادی  
"ہارو" کی کہ نہیں فقر ہے۔ سب عاقبتی میں کھپائی چوری  
زہرا کہتا تھا کہ "تیرا بس میں ہوں۔" دل کرنا تھا کہ  
چھوڑ دوں اس پر۔ سارو دیکھی کسی نے کمال "۔ عالم اتکا  
کوئی جرو نہیں، ہے رہی۔ آئیں خوشی سے ہا ہر اور دل  
اچھل اچھل کیا کیا "ب" "دھک کے دھک" کو دیکھا اور  
چہ حال شروع کرنے سے پہلے ہی "دھک دھک" ہی پھر  
ختم ہے "آئی آئی والہ۔"

امام یحییٰ بن محمد کہ یقین ہی نہیں آیا تھا اس لیے کہ یہ  
 لکھ سکتا ہے۔ ہر والدہ پوتی کی انگری پر ہوتی ہے۔ یا بھلا کا  
 بھکرہ پوتی کی است "بھرا بھرا کی پر" چاہی کی کہانی۔ اس کی  
 مکرانہ سب کچھ دل بند کر لے والا تھا۔ دیکھا کا کرتا۔  
 باپ کی ادا کی اماں کی ہاتھیں کھائی کے مناظر اللہ اللہ۔ دیکھا  
 یہ بھاری کیوں ہوئی اتنی بھاری بھائی یہ بھاری  
 الف میں دیکھی باجہ دیکھی ہے کتاب میں کی  
 معصوم ہاتھیں، اللہ کو نہ۔ یقین پاتہ کرنا ہے۔ ہر اس کی  
 بنے چینی کی داستان دل کو دکھانے والی ہے۔  
 نفسانی انجمنیں بن کر اس میں وہ اپنی بھون ہے۔ صلح  
 کر لیں تو انہیں بات ہے۔ اس کے سارے اچھے تھے سسر  
 اس کے بھی بہت اچھا تھا۔

حق: روزِ حشر میں جو شخص اور ام ہانی آپ نے بہت اچھا  
دیکھا، وہ کہاں کی فضیلتی تیرا کیا ہے۔ بہت فکر ہے۔

ماہانہ سیر..... ۱۸۷۰ء

১৮৭৬

ہم اگلے اچھا تھا۔ آج سے ملاقات انہی ہی، انا اور  
شاہد علی اور قرۃ العین کا انگریز بچہ تھا۔ "الط" "عزیز" "امیر"  
کا بیٹا آگے چل کر اس کے سے اچھا ہو گا۔ "عالم" "نور" "امیر"  
یہ تھے۔ کاکہ ہم آپ کے لئے نوکریاں کر رہے ہیں، عالیہ

Handwritten text in Urdu script, likely a continuation of the letter or a separate note.

۱۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۲۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۳۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۴۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۵۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۶۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۷۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۸۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۹۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔  
 ۱۰۔ اے اللہ! میری زندگی میں سے میری ساری برائیوں کو مٹا دے۔

مجلس

[illegible]



جزیریاری تبسم! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی کبریاں قاضی اموات نہیں ہیں لیکن ہمیں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ کوشش کرتی رہیں۔ کامیاب ہوں گی ان شاء اللہ۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر خوش ہوئی۔ بہت اچھا تبصرہ ہے آپ کی تفصیل سے ہر سلسلہ اور ہر تحریر کے بارے میں لکھا ہے۔

نبیدہ اسماعیل — کراچی

کتنی سخی پڑھ کر دل ادا اس ہو گیا سب سے پہلے محمود پر بھائی کے لیے دعا کی۔ اس ماہ سلیٹی ہنز (لوچ شریف) کے طے ہونے پر میری حیرانی کے ساتھ عجیب سی خوشگوار سی ہنسا کر دیا، عجیب سی سخی اور طعنے ہے ان کی باتوں میں، وہ ایک ماں ہیں، ہم بھی ان کا ادب کرتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور سمجھا گئے کہ اللہ نے ہر انسان کو اس کی فطرت پر تخلیق کیا ہے اس کے بعد ہر بچے کی جتنی درسگاہ ماں کی گود ہے، والدین کی اپنی عادت و خصلت اور ہر اچھا، برا عمل اور گھر کا ماحول بچوں کی شخصیت کو متنی یا مثبت بنانے میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے، والدین کی سوچ، فی وی جوشو، سوشل میڈیا، مودرن ٹیک کیوں نہیں جانتی جن میں دکھائی جانے والی بے حد پر آسائش اور فحش لاکھ، غریب اور سفید پوش طبقے کو خواب دکھائی یا محرومیوں کا احساس دلاتی انہیں نفسیاتی مریض تک بنا دیتی ہے یہ رسالے وغیرہ تو بہت بعد میں آتے ہیں۔ رسالے تو زندگی کی خوب صورتی اور پرصورتی دونوں ہی دکھا رہے ہیں لیکن آپ بچیوں کو نہیں سمجھا پا رہیں تو مطلب (معذرت کے ساتھ) آپ کمزور پڑ رہی ہیں یہی کمزور محبت بچیوں کے لیے ضرور رسالہ ہے۔ آپنی کیا آپ یقین کریں گی کہ میرے ابو نے مجھے محض چار سال کی عمر میں محلے کی لائبریری کا کمرہ بنوایا تھا یہ کہہ کر کہ ”یہ میری بیٹی جب بھی کوئی کتاب لینے آئے، اسے دے دیجئے گا“ انگل حیران ہوئے تو اب یقین سے بولے ”ہاں اسے پڑھنا آتا ہے اور پتا بھی ہے کہ کیا پڑھنا ہے۔ میں آج بھی یہی سوچتی ہوں کہ وہ یقین ایک بیٹی پر نہیں تھا، وہ ان کا اپنی ذات پر اکتفا اور اس اکتفا میں کبھی ہمارے لیے وہ تربیت تھی کہ جس نے ہمیں کبھی خوابوں کی دنیا میں یا خواہشوں کے خاردار راستے پر بھٹکنے نہیں دیا۔ ہم

نے تو ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اس کے علاوہ والدین کی تربیت بھی اسٹرونگ ہونی ضروری ہے۔ زندگی خوب صورت ہے، زندگی ہزار نعمت ہے یہ جتنے سیکڑوں بار پڑھے اور سنے، پر جب یہاری میرا، جتنی اور دیرسا کی کہانی سنا کر کہیں کہ ”زندگی سے منہ آپ کی آنکھوں پر یہ سطر پڑھ رہی ہے وہ اپنی جسم سے بس اتنا کہہ دے۔ اپنی زندگی اور زندگی کی قدر کیجئے“ تو دل گہری سوچ میں کیوں نہ ڈوبے کیا ”امام یقین“ پڑھ کر کبھی غافل رہ پائیں گے۔

جوزمن پرنس بوسکتا ہوا آسمان سے ہوتا ہے۔  
آج کا سورج کئی کے سورج کے لیے غریب ہو گیا۔  
یہ چند جملے تو کیا، پوری تحریر کی تحریف کے لیے ذہن میں لائے جانے ہمارے۔

”جمال زہرا“ (زبردست تحریر) کی تو ابھی پارٹی لیکن ہمارے خیال میں صرف ”تذکرہ حسن“ نے ہی فساد نہیں ڈالا تھا۔ بڑے میں نکلنے والی زہرا خود بھی —  
تو تصور دہائی ایک : مجرم سے ملنا اس کی فحش پلٹس گزرا تو تھا بس، اور شاید اسی فحش کی پاداش میں اس بے چاری نے عاشق کی صورت میں دردناک سزا جھیلی۔  
”دھنگ کے رنگ“ کی تو کیا اسی بات ہے جس میں اس کے پڑھنے اور پڑھ پڑھ کے ہنسنے رہے۔

ج : جزیریاری نبیدہ! تبصرہ حسب معمول، حسب روایت شان دار اور جان دار ہے۔ کبھی کبھار کھنکھنے کی طرف بھی توجہ دیں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ آپ نے ہماری ترجمانی کی ماں کے لیے تبدیل سے ممنون ہیں۔

مقدس محل — لاہور

اس بار خواتین ڈائجسٹ بس ٹھیک ہی تھا۔ ناسل بھی اچھا تھا۔ الف، عالم، جمال زہرا زبردست تھا۔ سلام ہے سب رائٹرز پر۔ آپنی ان ڈائجسٹ کا ہر سلسلہ ہی بہت زبردست ہے۔

آخر میں میری بیٹی کے لیے دعا جو کہ مقدور ہے۔ بہت بڑا لاکھ ہے میرے لیے۔ لکھنوں میں یہاں کرنے سے قاصر ہوں۔ سب بہنوں سے دعا کی احساس ہے۔ کاش مجھے اپنی بیٹی کی یہاری پر مبرا آجائے۔ کیا کسی کے پاس میرا ام ہے؟



ج: پیاری بہن! اسم اعظم کسی کے پاس سے نہیں ملے گا یہ آپ کے اپنے پاس ہے۔ وہ ہے پورے یقین کے ساتھ دعا۔ اللہ تعالیٰ سے اس آزمائش کے خاتمہ کی دعا کرتی ہیں۔ ہم آپ کی بیٹی کی صحت یابی کے لیے دل سے دعا کو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت و حوصلہ عطا فرمائے۔

### سباہ شریف..... ساہیوال

خواتین میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ خواتین ہمیں 6،7 سے پہلے نہیں ملتا۔ پھر پڑھنا اور پھر بے اختیار تبصرہ کرنے کو دل لپاتا ہے۔ لیکن پھر وہی آپ تک ارسال کرنے کا عزمین مسئلہ۔ انتظار کرتی ہوں کہ کب کوئی آئے تو شہر جائے۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح آپ کی من مرضی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہی کہ قارئین ماڈل گرل کی جگہ قدرتی مناظر چاہتے ہیں اور آپ؟ ”حالم“ کے کیا کہنے؟ ہر تحریر پہلے سے بڑھ کر۔ فرزانہ کھرل اور سمیرا حمید فلاسفی بہت چھتی ہیں۔ مشکل مشکل جیلے۔ منفرد لکھنے کے پکر میں کچھ عجیب سا لکھ جاتی ہیں۔ امریکہ، عراق، فرانس کی مثالیں۔ دبیس، دورین، خرطوم و لائم۔ پرندوں جانوروں جیسے نام۔ بندہ کم از کم نام تو آسان رکھ لے۔ ”جمال زہرا“ پڑھ کر بے اختیار اپنے ایک عالم کی بات یاد آگئی کہ ”عورتوں کو غلط عورتوں سے بھی پردہ کرنا چاہیے۔“ باقی کا شمار بھی اچھا تھا۔ اپنے ہم خیال خطوط پڑھ کر جہاں دل خوش ہوتا ہے وہیں غلط تجاویز پڑھ کے پارہ بھی ہانی ہوتا ہے اور کچھ کا کہنا کہ صفحات بڑھا کر قیمت زیادہ کر دیں۔ اللہ کی بندیوں! جو چیز چھتی ہے اتنی ہی قبول کر لو باقی اگلے ماہ کسی۔ بہت ساری قارئین ایسی ہیں جو 70 روپے بہت مشکل سے نکالتی ہیں۔ وہ بے چاریاں مزید کہاں سے لائیں گی؟ پہلے مہنگائی کم ہے جو غلط پٹیاں پڑھاتی رہتی ہو معصوم ادارے والوں کو۔ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے کیا شعاع، خواتین اور کرن کے خطوط ایک ہی لفافے میں ڈال کے بھیج سکتے ہیں؟ پلیز اس کا جواب ضرور دیں۔

ج: پیاری سب! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں بخوبی اندازہ ہے کہ ہماری پیاری قارئین کو خط لکھنے اور پوسٹ کرانے میں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی

لیے ہم لیٹ ملنے کے باوجود آپ کا خط شامل کر رہے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ کوئی کتنی بھی پٹیاں پڑھائے۔ ہم قیمت اسی وقت بڑھاتے ہیں جب ناگزیر ہو جائے۔ ہماری حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ ادارہ اضافی اخراجات کا بوجھ قارئین پر ڈالنے کے بجائے خود برداشت کر لے۔

آپ کے لیے خصوصی رعایت ہے کہ آپ شعاع، خواتین اور کرن کے خط ایک ہی لفافے میں ڈال کے بھیج سکتی ہیں۔ دیگر قارئین بھی صرف شعاع اور خواتین کے خط ایک ہی لفافہ میں پوسٹ کر سکتی ہیں۔

### آرزو ضیاء..... گلشن معمار

پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ ضرور شائع ہوگا۔ بہت ساری رائٹرز پسندیدہ ہیں جن میں سے کچھ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، سائرہ رضا، سمیرا حمید، تنزیلہ ریاض، آمنہ ریاض، نعیمہ ناز اور فاخرہ جبین زیادہ پسند ہیں۔ ٹائٹل میں سے ”حالم“۔ دشت جنوں۔ مکمل۔ آپ حیات۔ سائرہ رضا“ کے ٹائٹل، سمیرا حمید کے ٹیولپ، مہر میراں، وغیرہ بہت پسند ہیں لیکن اس بار کا ”محب رب“ سب سے بڑی لے گیا۔ سمیرا حمید کی لکھی گئی کہانیوں میں سے سب سے اول نمبر پہنچی ہے۔ پلیز بھی سمیرا حمید کا تفصیلی انٹرویو ضرور لیں اور اے آر وائی پہ ملنے والے ڈرامے ”بلا“ کے بہرہ و ہلال کا بھی تفصیلی انٹرویو ضرور لیں پلیز۔

ج: پیاری آرزو! آپ کا ٹائٹل ابھی پڑھا نہیں۔ پڑھ کر ہی بتا سکتے ہیں۔ آپ میں صلاحیت ہے یا نہیں۔ اطمینان رکھیں۔ قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ خواتین ڈائجسٹ میں جو کہانیاں شائع کی جاتی ہیں ان کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

### شاز یہ ستار..... ڈیرہ غازی خان

تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد شریک محفل ہوں۔ میری بھابھی کی 18 اگست کی رات کو وفات ہوگئی ہے۔ میرے بھائی اور بچوں پر قیامت سی ٹوٹ پڑی ہے۔ باقی ایک ہی بندے پر کیوں اتنی تکلیف اور آزمائش آئی ہے۔ پہلے ماں نو جوانی میں چل بسیں ابو جان کی جوانی میں ڈھچھ ہوگئی۔ نو جوان بہن کی، اب بھابھی نو جوانی میں چل بسی، اب تو لوگ بھی باتیں کرتے ہیں کہ پتا نہیں ان بے چاروں کا کیا



لگیں کہ دل چاہتا ہو گا کے پوری دنیا کو سناؤں۔ اتنی ہار روٹی، ہنسی، مسکرائی۔ کئی کئی دن ان کہانیوں کے اثر میں رہی، کس کس رائٹر کا نام لگسوں۔ ٹوہیاں گنواؤں..... جس کہانی نے اتنے سالوں بعد اتنا مجبور کیا کہ خدا لگسوں وہ ہے میرا حید کی "محب رب" کیا اعلیٰ سوچ ہے۔

ج: پیاری شائستہ اخواتین ڈائجسٹ سے آپ کا اٹھارہ سالہ ساتھ ہی ہمارے لیے باعثِ طمانیت ہے۔ میرا جبر تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

اقراء الیاس..... مرید کے ضلع شیخوپورہ

اس بار پورا کا پورا ڈائجسٹ ہی بیٹ تھا۔ ماڈل کا میک اپ اور اک ادا سے دیکنا خوب صورت لگا حقوق العباد سے پر اخلاقیات کا درس دیتی احادیث دل کو لگیں۔ آئندہ یک سے ملاقات اچھی رہی۔ "ڈاکٹر شاہد علی زیدی" پلیز ایک ریکویسٹ سمجھ لیجئے گا اس سلسلے کو ختم مت کیجئے گا

"الف" عمیرہ احمد بے شک آپ کو گفتگو سے مختلف مگر مختصر انداز میں کہنا آتا ہے۔ "رشتوں کی چابی" حقیقت میں تو اس کے برعکس ہی دیکھا ہے مطلب نکال کر تو کون اور میں کون؟ لیکن میں رائٹر کی سوچ کو سراہوں گی "دل ہی تو ہے" ہلکی پھلکی اسٹوری تھی۔ عرصے بعد ڈائجسٹ میں پرانی جھلک نظر آئی۔ "جمال زہرا" پڑھنے کے بعد کتنے لمبے شاگد رہی۔ سارہ رضا انتظار تو کروالی ہیں مگر پھر شکوہ بھی نہیں رہنے دیتیں۔ میرا حیدنا امید اور اندھیری رات کے مسافروں کے لیے "دوا" اور ان کی "دعا" ثابت ہوئی جو انہیں ہاتھ تمام گہرائیوں سے نکال لائے۔ حیرت نہیں ہوتا آپ کا یقین آپ کا حیر ہوتا ہے "کہانی پڑھنے کے بعد ایسا لگا ادھوری رہ گئی، بدی کا کیا ہوا؟

ج: پیاری اقراء! میرا حید کی کہانی ادھوری ہی تھی معذرت خواہ ہیں کہ سہا ہاتی آئندہ نہ لکھ سکے۔ اس ماہ کہانی کی دوسری اور آخری قسط شامل اشاعت ہے۔

انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

تشریف نعمان..... لاہور

یقین مانیں اس مہینے کوئی ارادہ نہ تھا خط لکھنے کا لیکن

بجز اسے یہ بار بار آزمائش میں بھی آ رہے ہیں۔ اب آپ عرصے میں ان کو ان کے سوالوں کا کیا جواب دوں؟

ج: پیاری شائستہ! آپ کی بھابھی کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی اور بچوں کو صبر دے۔ آمین۔ آپ لوگوں کی باتوں کا اثر نہ لیں دنیا سے ایک دن سب نے ہی جانا ہے اللہ تعالیٰ نے جتنی عمر لکھی ہے، ہمیں دنیا بھی اسی مقررہ وقت تک رہنا ہے۔ کم یا زیادہ وقت، یہ اس کی محنتیں ہیں۔ دکھ اور تکلیفیں آزمائش ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر آزمائشیں زیادہ آتی ہیں۔

آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔ آپ دوسرا پلٹ بھجوا دیں۔

لائیہ اعوان..... لاہور

"الف" میں عمیرہ جی نے اس بار خلاف معمول اشارت ہی میں کہانی اوپن کر رکھی ہے مگر ان کا کمال یہ ہے کہ قاری کا انٹرسٹ پھر بھی پہلے کی طرح برقرار ہے۔ "اسم اللیقین" پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ میرا حید کے کرداروں اور حالات و واقعات میں اب ماورائی عنصر جھلکے لگا ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحریروں کی سب سے خوب صورت بات یہ ہے کہ وہ قاری کے دل میں امید کے دیے کو کسی نہ کسی طور جلائے ہی رکھتی ہیں۔ افسانوں میں "مسز اسائن" اور "دل عشق" نے بننے پر مجبور کر دیا۔

ج: پیاری لائیہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ فون کرتی رہیں لیکن آپ کی احتل سے بات نہ ہو سکی۔ آپ کا فون نمبر ہمارے پاس ہے ہم آپ کو خود فون کر لیں گی۔ کہانی مل گئی ہے۔ ابھی پڑھی نہیں گئی۔

شائستہ جتول..... کراچی

آج سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے اک تعلق قائم ہوا۔ اسی سے شوق پیدا ہوا، جب سسرال گئی تو موج ہو گئی اکلوتی جنمائی پہلے سے ہی شوقین۔ بس پھر ان سے لے کے پڑھتی تھی۔ پھر چاب کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا تو ایک پڑوسن بھی مل گئی۔ وہ اور میں ایک دوسرے کو بدل بدل کر رسالے پڑھنے کو دیتی رہیں۔ ماہ و سال گزرے۔ اللہ پاک نے دو بیٹوں سے لوازا۔ سب کچھ بدلا مگر رسالوں کا نشہ، پیار، چاہت ویسی ہی رہی، اتنی مرتبہ کہا یاں ابھی



ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور

کتنے ماہ سے آپ سے آدمی ملاقات نہیں ہوئی۔ بس دکھ و سکھ، پریشانیاں، تکلیفیں جیسے آسیب جو زندہ انسانوں کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ رہی سہی کسر دھواں دار بارشوں نے نکال دی۔ مکان کا پہلا ہنا ہوا حصہ۔ بیٹھک، کچن، باتھ روم وغیرہ کی دیواریں کنٹر لائن پھٹ جانے سے دراڑیں پڑ گئیں۔ وہ حصہ پورا گرا دیا۔ ہم پچھلے والے حصے میں رہتے ہیں۔ کچن کا سارا سامان۔ دکھوں میں اللہ پاک کہیں کہیں سکھوں کا درپچہ بھی کھلا رکھتا ہے۔ میری شہزادی شمرہ جاوید کی شادی۔ مکان تو ابھی بھی زیر تعمیر ہے۔ بیٹی کی شادی ہال میں کرائی۔

”کہنی سنی“ تلخ اور پراثر ”کرن کرن روشنی“ کی ایمان افروز باتیں پڑھ کر جب لگا کر بچنی۔ عمیرہ احمد کے ”الف“ پر۔ یہ عنوان پڑھ کر ”الف اللہ تے چلے دی ہوئی“ کا کافی یاد آ جاتی ہے۔ مومنہ سلطان کی بے بسی پر خاما ترس آیا۔ نمرہ احمد کا ”حالم“ لفظوں سے کھلواؤ خوب جانتی ہیں نمرہ۔ مگر ایک چیز کی ابھمن برقرار ہے۔ پچھلے لوگ تو اپنی عمر گزار کر مر رہی جاتے ہیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی (کنویں کے ذریعے نہیں) دنیا میں سفر کر کے چلے جاتے جہاں قدیم، پرانے رسم و رواج چل رہے تھے۔ بادشاہ، شہزادی، ہندابارا۔ تو فہم میں بات آتی ہے۔ سائرہ رضا کے قلم میں دریا کے پانی جیسی روانی ہے سمندر جیسی گہرائی ہے ”جمال زہرا“ بہت اچھی کہانی خاصی دکھی کر گئی۔ ”دھنک کے رنگ“ عفت سحر کا بے حد پسند آیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ”رشتوں کی چابی“ عطیہ خالد کا ”مسٹر اسمگل“ میونہ صدف ”دل عشق میں“ ربیعہ طارق بہت ہلکے پھلکے اور مزے دار تھے۔ ”ہمارے نام“ خط بڑے مزے کے ہوتے ہیں معصومیت اور اپنائیت سے بھرے۔ آپ کے جواب بڑے شاندار قسم کے۔ ”نفسیاتی ابھنیں“ عدنان بھائی مشورے خوب دیتے ہیں۔

ج: پیاری ملائکہ! اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں آسانیاں لائے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیں زندگی میں صرف خوشیاں اور آسانیاں کم بلکہ شاذ و نادر ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ زیادہ تر کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ کچھ

جمال زہرہ نے اتنا مجبور کر دیا کہ شدید ناگوں میں درد کے باوجود اٹھ کر سب سے پہلے کاپی پھل پکڑ کر تبصرہ لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ سائرہ رضا کیا چیز ہو تم ابھی ان میرڈ ہو اور تحریر میں اتنی روانی اتنی چٹکی، اعلیٰ منظر نگاری، کردار نگاری، کرداروں کے جذبات کی عکاسی کرتی، سب ایسے تھا۔ جیسے آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔

”الف“ یہ تبصرہ ادھار ہے ابھی پچھلے سال دینا فضل کریم (نانی) کی کہانی پڑھی تھی۔ وہ ذہن سے نہیں جاتی۔ یہ سمل رضا آئی لو یو سوچ۔ تمہارے لہاجی نے بہت ہنسایا۔ رقص میں شرارتیں بہت مزے کی تھیں۔ لیکن ”پیاں ساز۔ اقرار کا موسم۔ شکر۔ کال بیساکھی۔ بیٹیوں کی ماں۔ سرخ آندھی۔ ٹنگوں والی شال“ نے خوب رلایا۔

ج: تسمیرہ رمضان سے تسمیرہ نعمان بننے تک کا سفر۔ مبارک ہو۔ ہمیں خوشی ہے کہ شادی کے بعد بھی آپ کا خواتین ڈائجسٹ سے تعلق برقرار ہے۔ سائرہ رضا شادی شدہ ہیں۔ ان کی ماشاء اللہ تین بچیاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

رابعہ آہیر، رضوانہ آہیر..... میانوالی

ہم میانوالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں الحمد للہ آسودہ حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ سے رشتہ تقریباً دس بارہ سالوں پر محیط ہے اور اس دوران زندگی کے مختلف معاملات میں اس ادارے سے کافی راہنمائی ملتی رہی ہے۔

اب آتے ہیں مصنفین کی طرف تو ادھر پہلی پوزیشن پر موجود ہیں۔ نمرہ احمد ان کی تحریر میں ایک جادو ہے جو سیدھا دل پہ اثر کرتا ہے۔ دوسری مصنفین جیسا کہ عمیرہ احمد، آمنہ ریاض، فرحت اشتیاق اور نایاب جیلانی کو بھی کافی پڑھا اور بہت پسند کیا۔

ج: رابعہ اور رضوانہ! خواتین کی مغل میں خوش آمدید۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند ہے۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔







دوسرے کتے کو پکڑنے کے لیے بھاگتا ہے تو میرے لیے کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔“

27۔ ”مارٹنگ شو کرنے کا موقع ملے تو؟“

”تو ضرور کروں گی۔“

28۔ ”گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟“

”اماں ابا دونوں سے..... کیونکہ میں بچپن سے ہی بہت لاڈلی اور چپتی رہی ہوں۔“

29۔ ”کبھی بیمار ہوں تو اپنی بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟“

”میری امی کہتی ہیں کہ ”انعم تم بیمار نہ ہوا کرو۔ کیونکہ“

پھر سارے کام رک جاتے ہیں اور تم سے بیماری چنڈل بھی نہیں ہوتی۔ تو میں بہت زیادہ ڈپرےس ہو جاتی ہوں۔“

30۔ ”آپ کے ڈراموں کی تعداد؟“

”بہت سارے ہیں، چند ایک کے نام یہ ہیں ”جورو کا غلام۔ نور زندگی۔ وعدہ۔ بہورانی۔ دل پر باد۔ حدت“ اور ”لشکارہ“ وغیرہ..... ”اسیر محبت“ انڈر پروڈکشن ہے۔“

31۔ ”رومینک رول آسانی سے کر لیتی ہو؟“

”اداکاری میری محبت ہے۔ اس لیے کسی بھی قسم کے رول کرنے میں مشکل نہیں ہوتی۔“

32۔ ”ادب سے آپ کا لگاؤ؟“

”اکثر شعر و شاعری کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ غالب، فیض احمد فیض، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، میرے پسندیدہ ہیں۔“

33۔ ”کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟“

”برایانی، کڑا سی، چائیز اسٹیک اور تھائی فوڈ تو بہت ہی اچھا بنا لیتی ہوں۔“

34۔ ”رونا کب آتا ہے؟“

”جب امیدیں ٹوٹتی ہیں تو بہت رونا آتا ہے۔“

35۔ ”ایک خواہش جو حسرت بن گئی؟“

”میں خوش قسمت ہوں کہ میری کوئی خواہش ایسی نہیں جو حسرت بن گئی ہو۔“

36۔ ”کس کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہیں؟“

”اپنی فیملی کے لیے۔“

37۔ ”ایک نصیحت جو گھر سے باندھ لی؟“

”کہ آئندہ کسی دوست کے ساتھ کاروبار نہیں کروں گی۔“

38۔ ”آپ کو نفرت ہے؟“

”جھوٹ سے، جو آج کل ہر کوئی بول رہا ہے۔“

39۔ ”خواہش ہے کہ ایسی فلموں میں کام کروں جو؟“

”ایکشن مودی کرنے کو ملے یا پاکستان کی کسی بھی ”فارس“ میں کام کرنے کو ملے تو ضرور کروں گی۔“

40۔ ”اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچا لیتی ہیں؟“

”میں بہت خرچ کرتی ہوں، مگر کبھی کبھی بچا بھی لیتی ہوں۔“

41۔ ”ایک محبت جو بھول نہیں سکتیں؟“

”جس گاؤں جانا نہیں اس کا ذکر بھی کیوں۔“

42۔ ”کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟“

”ٹریولنگ کے لیے..... چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو۔ میں جانے کے لیے تیار رہتی ہوں۔“

43۔ ”کس کو دیکھے بنائیں نہیں آتی؟“

”دیکھنے کا تو کچھ نہیں کہہ سکتی، البتہ جب تک سلیپنگ سوٹ نہ پہن لوں نیند نہیں آتی۔“

44۔ ”گھر کے کس کمرے میں سکون ملا ہے؟“

”اپنے کمرے میں۔“

45۔ ”کسی کی گچی محبت دیکھنی ہو تو؟“

”اسے بڑے وقت میں آزمائیں۔“

46۔ ”کبھی کراسس میں وقت گزارا؟“

”الحمد للہ ابھی اس بار وقت نہیں آیا۔“

47۔ ”بی بی ہالی کب ہوتا ہے؟“



”یہ لوعی ہوا ہے..... ورنہ ہم جس معاشرے

میرے ہیں وہاں تو ہائی ہی ہونا چاہیے۔“

تیسرا: "اگرچہ میں نے اسے دیکھا ہے۔"

”اے بی ایم کارڈز۔ بی این ای سی۔ چھ۔ بی  
”کے۔ بی۔ بی۔ بی۔“

”شادی کر لو اب۔“

50۔ حاکمے میں کیا چیزیں مایوسہ سروریں

”اچار، برائے اور سلاطین۔“

51۔ عشاء عشاء کہاں اچھا لگتا ہے۔ چہاں  
اساتذہ دانشکے ٹیبل؟

”مجھے صوفی پہ بیٹھ کر کھانا کھانے میں مزہ آتا ہے۔“

52۔ ”ایف بی انشا گرام اور انڈسٹری سے

آپ کیلئے ہے۔“

”بہت زیادہ دلچسپی ہے ان تینوں سے بہت اکیٹو“

53۔ ”ق۔ کیا ہے یہ کرتی ہیں؟“

”بالکل کرتی ہوں۔۔۔۔۔ اور وقت سے پہلے ہی سونے

جانی ہوں۔“

ہوں؟

”کھانا نہیں..... سلا دکھی دن تک کھا سکتی ہوں۔“

9/11 کی (دولڈ ٹریڈ سینٹر)۔“

56۔ ”دوسرے ملک جا کر کیا بات نوٹ کر لی

”لوگو! کیا انسانیت کو لازماً پیشرو اصفائی، حزم و

ترقی اور سب سے زیادہ ان کا سادہ پن۔“

57۔ ”ایک لڑکا جو آپ لڑنا چاہتی ہیں؟“

پڑھیں اور سوائے ان کے کسی اور کو نہ پڑھیں۔

58- "ایک کردار جو مقبول ہوا؟"

59۔ ”ایک کردار جو کر کے بھگتا مرنے؟“

”نہیں! ایسا کوئی کردار نہیں ہے۔“

60۔ "ناشتہ اور لکھنا س کے ہاتھ کا پسند"

”امی کے ہاتھ کا۔“

61۔ ”آپ کی فیوچر پلاننگ؟“

62 "اک خوار حمار اس کی کھجور کھا رہا ہے۔"

”ایک حویلی جس میں میں اکیلی ہوں..... بار بار

62 "بہن، بی بی، بی بی"

”دھوراجی اور بڑا ک فوڈ اسٹریٹ۔“

64۔ "عورت حسین ہوئی چاہے یا ذہین؟"

وہیں کہیں سے سرکڑا ہوا ہے

ہوں۔۔۔۔۔ عورت کو ذہن ہی ہونا چاہیے۔۔۔۔۔

65۔ ”شادی میں پسندیدہ رسم/تحفہ یا کیش؟“

کیش ہی بہتر ہے۔“

66۔ ”آئینہ دیکھ کر سوچتی ہوں کہ.....؟“

67۔ ”علیٰ کی ہیر“

”بدلہ نہیں لیتی..... تمہارا ہیں جدا کر لیتی ہوں۔ یہی

68 "کہ ذیلت محض ہے کہ آرم ہے۔"

”جب ایک سرساز کرتی ہوں تو پھر اپنے آپ کو ہٹا

پہلکا محسوس کرتی ہوں۔“

69۔ اے بڑے سے سائیں یا دوسروں کے تجربے سے؟

”دوسروں کے تجربے سے اور کبھی کبھی تجربہ کر کے

2018 نومبر 25



بھی انسان کو مثل نہیں آتی۔“

70- ”دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ؟“

”میری ماں۔“

71- ”لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے

ہیں؟“

”سیلفی یا پھر گانا سناؤں۔“

72- ”آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟“

”کے فوسر کروں۔“

73- ”ماڈلنگ اور قلم کی؟“

”ماڈلنگ تو بہت کی ہے۔۔۔ البتہ قلم ابھی نہیں

کی۔“

74- ”بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی محفوظ

ہے؟“

”میری ماں نے میرے بچپن کے سارے کھلونے

اور میرے کپڑے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔“

75- ”آپ کو فوبیا ہے؟“

”جی۔۔۔ خون (Blood) اور اونچائی کا فوبیا

ہے۔“

76- ”کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟“

”جی بالکل۔“

77- ”اپنی قلمی ماں لیتے ہیں؟“

”جی ہمیشہ۔“

78- ”دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟“

”ہمیشہ دل کی سنتی ہوں۔“

79- ”غصے میں پہلا جملہ؟“

”مجھ سے آئندہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“

80- ”نیند آسانی سے آ جاتی ہے؟“

”نہیں۔۔۔ بہت وقت لگتا ہے۔ نیند آسانی سے

نہیں آتی۔“

81- ”رات سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور

کرتی ہیں؟“

”آیت الکرسی اور دعائیں پڑھ کر سوتی ہوں۔“

82- ”محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟“

”دونوں سے۔۔۔ محنت ہماری ہوتی ہے اور قسمت

لو پر والا لکھتا ہے۔“

83- ”پسندیدہ تہوار؟“

”میٹھی عید۔۔۔ (عید الفطر)۔“

84- ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“

”جب رشتوں پہ سے اعتبار اٹھ جائے یا انسان کی

انسانیت مر جائے تب۔“

85- ”مارنگ شو میں جانا پسند ہے؟“

”صبح صبح ایکسر سائز کے لیے تو اٹھ جاتی ہوں، مگر

تیار ہو کر مارنگ شو میں نہیں بیٹھ سکتی۔ اس لیے بہت کم جاتی

ہوں۔“

86- ”گھر سے نکلتے وقت کیا کیا چیزیں لازمی

لے جاتی ہیں؟“

”موبائل فون، ڈی بیٹ کارڈ، پرس، پاور بینک،

چارجر، فروٹ، بکس اور پانی کی بوتل۔“

87- ”آپ کی اچھی اور بری عادت؟“

”صبح بہت پسند ہے، یہ اچھی عادت ہے اور غصہ

بہت جلدی آتا ہے۔ مگر جلدی اتر بھی جاتا ہے۔“

88- ”اس فیلڈ میں نہ ہوتی تو؟“

”تو ہینٹر ہوتی یا پھر انسانی حقوق کی وکیل ہوتی۔“

89- ”ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟“

”یہ کہ میرے بعد میرے کتے اور بلی کا کیا ہوگا،

کون خیال رکھے گا۔“

90- ”کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟“

”کانی۔۔۔ چاکلیٹ۔“

91- ”خدا کی حسین تخلیق؟“

”یہ دنیا۔“

97- ”اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو

؟“

”ہر شخص کو زوال ہے۔۔۔ زندگی کو موت ہے۔“

”شاید یہ بھی اللہ کا امتحان ہے۔“

☆



## آپ کا باوقیچہ خانہ

سلسلہ ناز

س: کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: کھانا بناتے ہوئے میں یہی فکر کرتی ہوں کہ بس میرے بچوں کا پیٹ بھر جائے اگر وہ دوبارہ مانگیں بھی تو کھانے کی ایک آدھ پلیٹ مزید ہو۔

س: کھانے کا وقت ہے، اچانک مہمان آجائیں تو.....؟

ج: مہمان آج کل ان گھروں میں آتے ہیں جہاں طرح طرح کے کھانے ہوتے ہیں۔ ہم صرف چائے، شربت اور پاپڑ سمو سے کھلانے والے میزبان ہیں۔ کوئی قسمت کا مارا آ بھی جائے تو جو پکا ہوتا ہے وہی آگے رکھتے ہیں۔

س: بچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج: ہم گاؤں سے شہر بچوں کی تعلیم کے لیے شفٹ ہوئے ہیں۔ کرائے کے بدلتے ہوئے مکانوں میں بچن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ بس پرآمدے کے ایک سائینڈ چھوٹا سا بچن خود سیٹ کرتی تھی۔ اب جس مکان میں شفٹ ہوئے ہیں، اس کا بچن الگ ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ کھانا پکاتے ہوئے میں ساتھ ساتھ صفائی بھی کرتی جاتی ہوں، کام کے معاملے میں ماشاء اللہ پھرتیلی ہوں۔

س: ناشتے میں کیا خاص چیز بناتی ہیں؟

ج: ناشتے میں، پرائضا چائے تو پرائضا چار، میں چائے کے ساتھ کھاتی ہوں۔ شوہر بچے اچار کے ساتھ پرائضا کھاتے ہیں۔ چھوٹی بیٹی عمار کو چائے پسند نہیں دیتی، نہ لسی۔ بس کچھ کبھی تہہ بے کے ساتھ کھالیتی ہے۔

س: مینے میں کتنی بار ہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج: خواہوں میں باہر کھانے کے پروگرام چلتے رہے ہیں۔

س: ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: موسم اچھا، ہو خوب صورت ہو تو میرا دل کرنا

ہے میں بہت زیادہ اونچی آواز میں پرانے گیت سنوں مگر شوہر بچوں کی وجہ سے نہیں کر پاتی تو رونا آتا ہے۔ شادی نہ ہوئی غلامی ہوئی۔ اس موسم میں میں چائے اور آٹے کا ملوہ بناتی ہوں۔

س: کھانا پکانے میں محنت کی کتنی قائل ہیں؟

ج: میں توجہ کے ساتھ کھانا بناتی ہوں۔ محنت ضرور ہو، کیونکہ محبت میں اثر نہیں جب محبت کے ساتھ پکاؤں تو کھانا خراب پکتا ہے۔

س: بچن کی ٹپ.....؟

ج: کھانے کے وقت میں ”یا اللہ“ پڑھتی ہوں اور روٹی بھی رہتی ہوں۔ کھانا بنانے تک۔ سوچتی ہوں ہمارے پیارے آٹانے کھی والی روٹی کبھی تناول نہیں فرمائی، نہ کھی والا سالن۔ کتنی مشکل زندگی تھی وہ، پیوند والے کپڑے، کھانا کبھی میسر نہ ملتا..... آہ، اور ہم تین چار وقت کھانا، چائے پرائے، کم پانی زیادہ کھی والا سالن..... قربان جاؤں میں سو بار، پھر بھی ہمارا وقت کارونا..... روٹا..... روٹا..... آہ ہم ناشکری امت۔“

ایک خاص ڈش کی ترکیب لکھ رہی ہوں جو بہت آسان ہے۔

خشک روٹی کی کھیر

خشک روٹی..... ایک عدد

دودھ..... ایک گلو

چھنی..... ایک کپ

الاچی..... پانچ عدد

اکثر گھر میں روٹی بچ جاتی ہے اس کو صاف جگہ کے خشک کریں ایک دو دن بعد اس خشک روٹی کو پانی میں بھگو دیں جب نرم ہو جائے تو پیسلے میں دو لیٹر پانی ڈال دیں جب وہ اٹل جائے تو خشک روٹی ڈالیں اور چمچ ہلائیں جب یک جا بن ہو جائے اور پانی گاڑا ہو جائے تو چھنی دودھ اور چھوٹی الاچی ڈال دیں۔

(جو خشک میوہ جات خرید سکتے ہیں، وہ ہر ایک باریک میوے کاٹ کے ڈال سکتے ہیں) یہ سب چیزیں ڈال کے کچا مسلسل ہلاتی رہی گاڑا ہونے پہ اتار لیں (آپ ٹکڑوں کو گرینڈ بھی کر سکتی ہیں) جن کے پاس فریج ہیں، وہ خضرا ہونے کے لیے فریج میں رکھیں یہ کھیر کمزور جسم والوں کے لیے اور خاص کر بچوں کے لیے بہت مفید ہے۔



# موسم کے پکوان

حکماء حیدری

## کڑا ہی تنگ

## سویا ہن ملوہ

اجزاء:-	اجزاء:-	کوکٹ (مرغی)	آدھا کاگو
نشاہتہ آدمی پیالی	آدھا پاؤ	بکرا/کائے	آدھا پاؤ
میدہ	ایک کلو	دھن	ایک کلو
چھوٹی الائچی	چھوٹی الائچی	پسا اور کھن	چھوٹی الائچی
اخروٹ کی کری	ایک پیالی	نہن	ایک پیالی
بادام	ایک پیالی	پیاز	ایک پیالی
لکھی	سوا کاگو	تنگ	سوا کاگو
ترکیب:-		زیرہ	
بڑے سائز کے پیلے میں ایک پیالی کھی لے کر		سوف	
اس میں میدہ اور نشاہتہ ڈال کر ملائیں پھر اس میں		ثابت دھنیا	
تین لیٹر پانی ڈال کر ابھی طرح ملا لیں۔ الٹی آٹھ پر		ثابت سرخ مرچ	
اتنی دیر پکائیں کہ اہال آجائے۔ اہال آنے پر چینی		آئل	
ڈال دیں۔ جب چینی ابھی طرح مل جائے تو		ترکیب:-	
چوبے سے اتار کر دوسرے تین میں ملل کا کپڑا رکھ کر		کوکٹ کی بولیوں کو دھو کر چھانی میں ڈال کر	
چھان لیں۔ اب پیسے ہوئے آمیزے کو ڈھک کر		پانی تنگ کر لیں۔ زیرہ، سوف، ثابت دھنیا اور سرخ	
خضری جگہ پر رات بھر کے لیے رکھ دیں۔ پھر دوبارہ		مرچ کو بھون کر پیس لیں۔ اب بھن اور ک، پسا ہوا	
سے الٹی آٹھ پر چھو چلاتے ہوئے اتنی دیر پکائیں کہ		مسالا، دھن، نہن اور تنگ کو کوکٹ میں ملا کر دو گھنٹے	
اس کی رنگت تبدیل ہونے لگے۔ کھی کا ایک ایک		کے لیے فرق میں رکھ دیں۔ کڑا ہی میں جیل گرم	
چھو ڈالتے ہوئے بھونتے جائیں۔ اب آمیزے		کر کے ہار یک کئی پیاز کو سنہرا ہونے تک تل	
میں الائچی کے دانے پیس کر ملا لیں۔ ایلو سلیم کی		لیں۔ اب مسالا لگے کوکٹ کو ابھی طرح بھونیں اور	
پایٹ میں ہکا سا کھی لگا کر اس میں سویا ہن ملوہ نکال		حسب ضرورت پانی ڈال کر دھیمی آٹھ پر پکنے کے	
لیں اور اس پر اخروٹ اور بادام چھڑک دیں۔		لے رکھ دیں۔ کوکٹ گل جائے تو ابھی طرح بھون	
ملوے کی سہاڈت کے لیے اس کے خنڈا ہونے پر		کر پو لہا بند کر دیں۔ کوکٹ دھکا کر کوکٹ کے درمیان	
اپنے پسند کے ٹھوپ میں کاٹ لیں اور پھر کسی ایئر		میں پیاز کا چھکا یا روٹی کا کھڑا رکھ کر کوکٹ رکھیں اور	
ٹائٹ ڈبے میں محفوظ کر لیں۔		ایک چائے کا چھوٹا آئل ڈال کر کڑا ہی کا ڈھان	
		اٹک دیں۔ کڑا ہی تنگ تان کی ساتھ پیش کریں۔	



# کہستان تعلیمی و ادبی گنجین

ن، افکار و ممان

س:- میں تین سال سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ آپ کے سارے مضامین بہت زیادہ قیمتی اور مفید ہیں۔  
ازدائی انجمنیں سلسلہ بہت پسند ہے۔ میں اپنا ایک مسئلہ بیان کر رہی ہوں۔ میری شادی کو ساڑھے دو سال ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے اور ایک بیٹا ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے میری طبیعت ٹھیک ٹھیک رہی۔ پہلے شوہر کے مالی مسائل کے حساب سے بہتر ہیں لیکن اب میری صحت بہتر نہیں ہے۔

مسئلہ:- یہ ہے کہ مجھے رات میں نیند نہیں آتی اور کان میں عجیب و غریب باتیں سنائی دیتی ہیں۔ مثلاً اپنے شوہر کے بارے میں افواہ کی سچے یعنی ان کی آواز میں باتیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ مسئلہ شادی کے تقریباً دو سال بعد شروع ہوا۔ میں اس مسئلہ کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔

مجھے رات کو نیند پہلے بالکل نہیں آتی تھی لیکن اب میں مہینہ بھر اپنا حال باہر نفسیات سے اپنا علاج کر رہی ہوں اب مجھے نیند آ جاتی ہے لیکن پہلے جتنی نیند نہیں آتی۔ بس گزارے لائق آتی ہے اور نیند آئے بھی تو خواب ساری رات تک آتے ہیں اور انتہائی کھدے خواب آتے ہیں۔ خواب میں کسی کی شادی ہو رہی ہے وغیرہ۔

خوابوں اور کان میں آوازیوں کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ خدا را میری مدد کریں۔ میں جس بھی ڈاکٹر کو دیکھتا ہوں وہ اس مسئلے کو سیریس نہیں لیتا اور توہم سے بات نہیں سنتا۔ میں پرائیوٹ علاج نہیں کر سکتی میرا مالی بہت کمزور ہے۔ وہ وقت جسم کا تھکا تھکا رہتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ مسئلہ انتہائی توجہ سے سنتے ہیں نیز میرے مسئلہ کا کوئی حل ہے۔ ڈاکٹر می مسئلے یا کوئی آئینی مسئلے مجھے مشورہ دیں کہ میں اپنا علاج کس سے کرادوں۔

ج: ناخوشی، مہینہ انسانی ذہن ایک ایسا پیچیدہ چیز ہے جسے سمجھنا آسان نہیں ہے۔ کبھی کوئی معمولی سی صحیح یا جھٹکا یا جھٹکا کی کسی یہ مسئلہ بن جاتی ہے۔ آپ کی لطیف دور ہو سکتی ہے لیکن اس کے سلسلے کو آپ کو باقاعدہ علاج کرانا ہوگا۔

جن، بصورت، آسیب وغیرہ کے پیکر میں نہ پڑیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جنات کا ذکر ضرور قرآن پاک میں آیا ہے لیکن یہ کہیں بھی نہیں ہے کہ وہ اس طرح انسانوں کو تک کرتے ہیں۔

یہ اچھی بات ہے کہ آپ باہر نفسیات سے علاج کر رہی ہیں۔ اس سے آپ کو فائدہ بھی ہوا ہے۔ آپ کو نیند آ جاتی ہے باقاعدگی سے اپنا علاج جاری رکھیں، دوائیں لیتی رہیں یہ شکایت بھی رفع ہو جائے گی۔ اس طرح کی بیماریوں میں صحت باپ ہونے میں وقت لگتا ہے۔ اس لیے جلدی نہ کریں۔

ایک ضروری بات نوٹ کر لیں ڈاکٹر جودا توجہ کریں۔ اسے باقاعدگی سے استعمال کریں اور جب تک ڈاکٹر نہ کہے کہ اس بات سے تھوڑیں۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے اس کیفیت میں جتنا لوگ کچھ دن تو دوا باقاعدگی سے لیتے ہیں پھر جیسے ہی اتفاق ہونے لگتا ہے وہاں ہونے لگتا ہے۔ انتہائی خطرناک بات ہے۔ نفسیاتی بیماریوں میں ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر دوا تھوڑا یا زیادہ استعمال نہ کرنا چاہیے۔ دوا ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق لیں اور باقاعدگی سے لیں۔ درمیان میں تاخیر یا دوا کی مقدار میں کمی بیشی نہ کریں۔

آسیہ خان صوابی

س: میرا مسئلہ ہے حد حساس نوعیت کا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے لکھوں۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ہانپے ہوئے ہے اس سے ڈھنگ سے بیان نہیں کر سکتا جس سے ساری اذیت نفسوں کی صورت باہر نکل آئے۔ میرا تعلق کم آمدی کے طبقے سے ہے۔ گھر کا ماحول بے حد سلجھا ہوا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بچپن میں کچھ عجیب و غریب رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔



ایک بات بتا دوں، میں بے حد حساس واقع ہوئی ہوں۔ ہر چیز مجھ پر عام لوگوں سے کہیں زیادہ اثر کرتی ہے۔ بچپن میں ایک کزن  
میں انہیں کھڑا حرکت کا نشانہ نہ تھی۔ اس وقت جب تک میں بہت چھوٹی تھی اس لیے میں اس وقت تو اس حرکت کو نہ سمجھ سکتی تھی مگر دل میں  
میں ایک عجیب سا خوف پیدا ہو گیا۔ ذرا بڑی ہوئی تو گھر کا سوا اسٹف لائے گئی۔ دکان پر جاتی تو دکان دار ہاتھ پکڑ لیتا۔ نہ بڑی جگہ میں بیٹھتا۔  
بغیر گھر کا حوالہ تو نہ دیتا تھا۔ اس لیے ابھی گھر والوں سے ذکر نہیں کیا کہ کتنے دو میرے گھر سے باہر نکلتے پر پابندی نہ لگادیں۔ کہہ سکتی  
ہی۔ کاش کہ اس وقت میں ان سے یہ سب ڈسکس کر لیتا۔

ان ہی دنوں میری ایک کزن اپنے شوہر کے ساتھ ہمارے گھر رہنے آئیں۔ ایک روز مہمان زیادہ ہو جانے کے  
باعث میری دو کزن مجھے اپنے ساتھ سنانے لے گئیں۔ بستر پر درمیان میں میں تھی۔ خود تو وہ گہری نیند سو گئیں۔ میں بھی  
سو گئی۔ رات کے کسی پہر میری آنکھ عجیب سے احساس سے کھلی۔ میرا ذرا مجھ پر سوار ہو گیا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ  
میں اس کمزور شخص کا ہاتھ خود پر سے ہٹا سکیں۔

اب حال یہ ہے کہ قریب سے ہوا بھی گزر جائے تو میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ ہر شخص کی قلیق اور گراہوا لگتا ہے۔ ہر مرد سے  
خوف آتا ہے۔ اس وجہ سے میں پرسکون نہیں رہ سکتی۔ دماغ تھکا تھکا سا رہتا ہے۔ باہر آنے جانے سے بھی گھبراتی ہوں اور تو اور اپنی  
بہتیمیں کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس ہو جاتی ہوں۔ میری بھابیوں بعض اوقات مجھے عجیب فقرہوں سے دہکتی ہیں۔ میری سمجھ میں  
نہیں آتا کہ میں اپنی زندگی ماہ لڑکیوں کی طرح کیسے گزاروں؟ میں ہر مرد کو تنگ کی خاطر سے دہکتی ہوں۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کو  
ہاتھ بھی لگے نہیں دیتی۔ ہی انہیں ان کے پاس چھوڑتی ہوں۔ میری اس عادت اور ان حرکتوں کی وجہ سے وہ بار بار بھی میری شکایت  
بھائی سے بھی کر چکی ہیں۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ وہ بڑے لوگوں محفوظ سے رہیں۔ آپ بتائیں کہ اس میں کیا لفظ ہے۔

حق عزیز بہن! آپ کی سوچ غلط نہیں ہے۔ فی وی اور قلموں نے کوئی کسر چھوڑی تھی تو وہ اعزیت اور موبائل نے پوری  
کر دی ہے۔ جس طرح کے روح فرسا واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اس نے ہر حساس دل کو کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایک قصور  
کی نسبت ہی نہیں نہ جانے کتنے بچے اور بچیاں اس اذیت میں مبتلا ہیں۔ بد قسمتی کی انتباہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسے بد بخت اور بے  
چالوگ بھی ہیں جو چھوٹے بچوں اور بچیوں کو بھی نہیں بخشے۔ عموماً قریبی رشتہ دار اس گناہ کرنے کیل میں زیادہ موٹ ہوتے ہیں۔  
مائیں یا تو اتنی لاپرواہ ہوتی ہیں کہ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اور کبھی کبھی غم ہونے کے باوجود جان بوجھ کر چشم پوشی اختیار کر لیتی ہیں۔  
بدنامی کا خوف ان کا راستہ روک لیتا ہے۔ اگر بچے کو کوئی رشتہ دار ہو تو سسرال کے طعنوں کا خوف اور اپنے ہی گھر والوں کی  
برائی کا ذرہ ہوتا ہے اور سسرالی عزیز ہو تو شوہر، سسرال والوں کی برائی، خلاق کا خوف انہیں کچھ بولنے نہیں دیتا۔ وہ جان بوجھ  
کر اپنی بچیوں کی آنکھوں سے جھانکنے خوف کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ مسئلہ اتنے معمولی نہیں ہے۔

ماں بننے کے بعد عورت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسے اپنے بچوں کو پروان میں ہی نہیں چڑھانا بلکہ ہر طرح سے ان کی  
حفاظت دہریت بھی کرنا ہے۔ بہت چھوٹی بچیوں کو کسی کے قریب جانے ہی نہیں دینا چاہیے۔ بچیوں کو بھی سمجھانا چاہیے کہ کوئی آپ کے  
قریب آئے یا چھونے کی کوشش کرے تو آپ شور مچادیں۔ مائیں انتباہی قریبی رشتوں پر بھی نظر رکھیں۔ ضروری نہیں کہ روک روک  
سب کو بتا کر کی جائے بلکہ غیر محسوس انداز میں اپنے بچوں کو کسی سے زیادہ قریب نہ ہونے دیں۔

جہاں تک آپ کے مسئلے کا تعلق ہے جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا اس میں یہ ذہنی کیفیت ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔  
ایسی صورت میں جبکہ انسان بہت زیادہ حساس بھی ہو۔ لیکن کسی بھی کیفیت کا حد سے بڑھ جانا انسان کو پارل نہیں رہنے  
دیتا۔ ایک بات ذہن میں رکھیں دنیا میں جہاں ایسے بھڑے اور وحشی انسان پائے جاتے ہیں وہاں پاکر دار، ٹیک اور اچھے  
لوگوں کو بھی کمی نہیں۔ آپ اپنی بہتیمیں کا خیال رکھیں۔ انہیں سمجھائیں لیکن اس طرح کہ یہ بات کسی کو محسوس نہ ہو۔ بہت سی  
باتیں کہانیوں کی شکل میں بھی ذہن نشین کرائی جاسکتی ہیں۔

خود بھی اپنے اس خوف پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ اپنے آپ کو یقین دلائیں کہ وہ بچپن تھا۔ میں کمزور تھی۔ بے خبر  
تھی۔ اب میں کمزور نہیں ہوں۔ اچھے بڑے لوگوں کو پہچان سکتی ہوں۔ ان کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ اس طرح آہستہ آہستہ  
اپنے خوف پر قابو پالیں گی۔



گھیسرین..... چاروچے  
لیوں کا عرق..... ایک عدد  
پھلکری پیسی ہولی..... دو چنگی

ان کو اچھی طرح ملا لیں اور دن میں تین بار ہر دوں پر لگائیں۔ رات کو تین گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچ نمک اور ایک چمچ سرسوں کا تیل ملا لیں۔ دس منٹ تک دونوں دیر اس میں رکھیں۔ اب جھانویں سے اچھی طرح رگڑ کر صاف کر لیں۔ پھر تویہ سے دیر خشک کر کے گھیسرین کا آمیزہ لگائیں۔ پھر سوئی موزے پہن کر سو جائیں۔ صبح پاؤں دھولیں۔ کچھ دنوں میں دیر صاف ہو جائیں گے۔

ایڑیاں پھٹنے سے بچانے کے لیے رات سونے سے پہلے بکری کا کچا دودھ مل لیں۔  
ہاتھوں پر لگانے کے لیے۔  
گلاب کا عرق..... ایک کپ  
گھیسرین..... دو چمچے

اس کو ملا کر مخلوط بنالیں۔ ایک شیشی میں ڈال کر لیکن میں رکھ لیں جب کام کاج سے فارغ ہوں تو ہاتھوں پر لگالیں، ہاتھوں کی جلد نرم و ملائم ہو جائے گی۔

چہرے پر دودھ اور گلاب کا عرق برابر مقدار میں لے کر دن میں تین بار لگائیں۔ ایک چمچ دودھ میں دودھ بادام باریک پیس کر اسے چہرے پر لگائیں۔ اس سے آپ کا چہرہ شاداب رہے گا۔

چہرے پر رات سونے سے پہلے کوئلہ کریم سے مساج کریں، اگر کوئلہ کریم نہ ہو تو ایک چمچ بالائی مٹا ایک لیوں کا عرق ملا کر کریم بنالیں اور رات کو سونے سے پہلے چہرے پر لگائیں۔

بالوں میں خشکی کے لیے دو چمچے دہی میں دو چمچے سرسوں کا تیل ملا کر نہانے سے آدھا گھنٹہ قبل سر میں خوب اچھی طرح ملیں۔ پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔ خشکی دور ہو جائے گی۔

موسم سرما میں بالوں میں تیل یا قاعدی سے لگائیں تاکہ آپ کے بال خشک نہ ہوں۔

### فرحین شمع..... نوشہرہ صدر

س: موسم سرما میرے لیے مصیبت بن کر آتا ہے۔ سردی بری طرح پھٹنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ان سے خون بھی رسنے لگتا ہے۔ کتنا بھی رگڑ کر صابن سے دھو لوں، دیر میلے ہی نظر آتے ہیں۔ چہرے اور ہاتھوں کی جلد بھی کھردری ہو جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ بھی سانولا ہو جاتا ہے، جبکہ میرا رنگ اچھا خاصا صاف ہے۔ بالوں کی خشکی کے لیے کچھ بھی بتائیں؟

ج: حساس جلد موسم کے اثرات زیادہ قبول کرتی ہے۔ جن لوگوں کی جلد حساس ہوتی ہے۔ ان کے لیے سردی کا موسم خاصا تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی تدابیر کی جائیں کہ جلد موسمی اثرات سے محفوظ رہ سکے۔

پاؤں کی جلد جب خشک ہونا شروع ہوتی ہے تو سب سے پہلے ایڑی میں گہرے کٹاؤ نمودار ہونے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی جلد میں ایکشن بھی ہو جاتا ہے، جس کے بعد علاج کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ پاؤں میں اچھا موچر انڈر پا قاعدگی سے لگایا جائے اور موسم سرما میں موزوں کا استعمال کیا جائے۔ بہت زیادہ صابن اور پانی کے استعمال سے گریز کیا جائے کیونکہ یہ پاؤں کی مزید خشکی کا سبب بنتا ہے۔

سونے سے قبل پاؤں - جھانویں سے رگڑ کر دھولیں اور پھر موچر انڈر پا کر موزے پہن کر لیں۔ اگر آپ بازار سے موچر انڈر خرید سکتی ہیں تو خرید

لیں لیکن کچھ گھریلو نسخوں سے بھی آپ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ یہ طریقے آسان بھی ہیں اور بے حد مفید بھی۔